شرح ضربِ کلیم

پروفیسر سلیم چشتی



عشرت پبلشنگ ہاؤس

لاہور

شرح ضربِ کلیم

سلیم چشتی

عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور

شرح ضربِ کلیم

مؤلفہ

پروفیسر یُوسف سلیم چشتی

مکتبہ تعمیر انسانیّت
غَزنی سٹریٹ
اُردُو بازار : لاہور

انتساب

محترمی سیّد ذوالفقار علی شاہ صاحب ایم اے

(سابق پروفیسر چیفس کالج لاہور)

ٹریڈ کمشنر حکومت پاکستان متعینہ کابل

کے نام

جن کی اقبال دوستی کا میرے دل پر بہت گہرا اثر ہے!

نیاز کیش ۔۔۔

سلیم چشتی

قیمت: 100 روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ و نصلّی علیٰ رسولہ الکریم

دیباچہ

ضربِ کلیم، مئی ۱۹۳۶ء میں، علاّمہ مرحوم کی وفات سے دو سال پہلے، پہلی مرتبہ شائع ہوئی تھی، اب تک اس کتاب کے سات اڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور اِن کے مجموعی نسخوں کی تعداد اُنتیس ہزار کے قریب ہے۔

اگر ہم اس تعداد کا، جاوید نامہ یا زبورِ عجم کے مطبوعہ نسخوں کی تعداد سے موازنہ کریں تو بظاہر یہ معلوم ہو گا کہ ضربِ کلیم کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ لیکن اگر اس کتاب کی اہمیّت اور اس کے مضامین کی بلندی کو مدِّنظر رکھا جائے تو ہمیں ندامت کے ساتھ اعتراف کرنا پڑے گا، کہ جس قوم کے لیے مرحوم نے یہ گہر ہائے آبدار نظم کئے تھے، اُس نے ابھی تک اِن موتیوں کی قدر نہیں پہچانی۔

ہزار شکر خدا کا شکر ہے کہ پنجاب یونیورسٹی نے اس کتاب کو داخلِ نصاب

کر دیا ہے۔ اور اس لیے مجھے اُمید ہے کہ آہستہ آہستہ یہ کتاب نوجوانانِ ملّت کے دلوں میں اپنے لیے مناسب جگہ بنا لے گی۔

کسی علمی کتاب سے شیفتگی، موقوف ہے اس بات پر، کہ انسان کو اُس کے مطالبِ عالیہ سے آگاہی حاصل ہو۔ اس لیے میں نے یہ مناسب سمجھا کہ طلبہ کے لیے اس کی عام فہم شرح لکھ دوں، تاکہ اقبال فہمی میں کچھ سہولت پیدا ہو سکے۔

میں اُن لوگوں میں سے ہوں جو دیانت داری کے ساتھ یہ یقین رکھتے ہیں کہ علامہ مرحوم نے، اپنی شاعری کے ذریعہ سے قوم ہی کو نہیں بلکہ ساری دُنیا کو قرآن مجید اور حدیثِ نبوی کی پاکیزہ تعلیمات سے روشناس کیا۔

چنانچہ وہ خود رموزِ بیخودی میں حضور سرورِ کائنات فخرِ موجودات صلی اللہ علیہ وسلم سے یوں عرض کرتے ہیں۔

گر دلم آئینۂ بے جوہر است
ور بحرفم غیر قرآں مضمر است

روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا
بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

مجھے خوشی ہے کہ حال ہی میں حکومتِ پاکستان کے وزیرِ تعلیمات نے بھی انہی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ۲۹ نومبر ۱۹۵۰ء کو موصوف نے لاہور میں مجلسِ مشاورت تعلیمات (ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن) کی صدارت کی اور اپنے خطبۂ صدارت میں اس حقیقت کا اعتراف کیا:۔

"لاہور ہمیشہ ہی سے علم و فن کا مرکز رہا ہے۔
اور پنجاب کو اس برِصغیر میں بہت بڑی حیثیت
حاصل رہی ہے۔ اور اس کی شہرت کے متعدد

اسباب ہیں۔ مثلاً یہ صوبہ بہترین سپاہی مہیا کرتا ہے۔ اور اس کا کاشتکار طبقہ ہماری اقتصادی خوشحالی کا ضامن ہے۔

زمانۂ حال میں، پنجاب نے اپنی قابلیت کے نئے نئے شواہد پیش کئے ہیں۔ اور ان کا کامل یقین مظہر علامہ اقبال کی شخصیت ہے۔ موصوف نے ملّتِ اسلامیہ پر جس قدر احسانات کئے ہیں، نہ تو میرے پاس اُن کے اظہار کے لیے مناسب الفاظ ہیں، اور نہ لفظوں کے ذریعہ سے اظہار ممکن ہے۔ یہ علامہ مرحوم ہی کی ذاتِ گرامی تھی جس نے اس دورِ مادّیت میں اسلام کے عالمگیر پیغام کی بہترین اور تازہ ترین تعبیر دُنیا کے سامنے پیش کی۔ نیز اُنہوں نے دُنیا کو یہ بتایا کہ تاریخ عالم کی تشکیل میں اسلام نے کیا کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔

ان باتوں کی بدولت، اقبال نے ہم درماندہ مسلمانوں کو جو روحانی طور پر مایوسی کے مرض میں مبتلا تھے اور ذہنی طور پر مُردہ ہو چکے تھے، دوبارہ کامیابی کی جھلک دکھائی۔ اور ترقی کی اُمید سے ہماری ڈھارس بندھائی۔ اور میں اپنے خطبۂ صدارت میں جو کچھ بیان کروں گا

اُس کا تعلق بڑی حد تک تعلیماتِ اقبال کی روح سے ہوگا"

(اخبار ڈان ۳۰ نومبر ۱۹۵۰ء)

اندریں صورت، مسلمانوں کا فرض ہے کہ علامہ مرحوم کے کلام کا پوری توجہ کے ساتھ مطالعہ کریں، تاکہ ان کی زندگی میں وہ انقلاب پیدا ہو سکے، جس کے لیے مرحوم ساری عمر متمنی رہے۔

چونکہ میں نے یہ شرح طلبہ کے لیے لکھی ہے۔ اس لیے قدم قدم پر اختصار سے کام لیا ہے۔ ورنہ ضربِ کلیم میں تو بعض بعض شعر ایسے ہیں کہ ہر شعر پر ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے۔

مثالاً دو تین شعر ملاحظہ ہوں:۔

اگر نہ ہو تجھے اُلجھن تو کھول کر کہہ دوں
وجودِ حضرتِ انساں نہ روح ہے نہ بدن

تو معنیٔ والنجم نہ سمجھا تو عجب کیا
ہے تیرا مدوجزر ابھی چاند کا محتاج

مردہ لادینیٔ افکار سے افرنگ میں عشق
عقل بے ربطیٔ افکار سے مشرق میں غلام

اگر اس شرح کو قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا تو اس کے بعد بالِ جبریل اور بانگِ درا کی شرح بھی ہدیۂ ناظرین کر سکوں گا۔

اللہ سے دُعا ہے کہ وہ اپنے فضل و کرم سے میری اس خدمت کو قبول فرمائے۔

خاک نشین

سلیم چشتی

مقدمہ

علامہ کے قلم سے اُردو میں چار کتابیں شائع ہوئیں جن کے نام علی الترتیب یہ ہیں:-

(۱) بانگِ درا، (۲) بالِ جبریل (۳) ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز حصہ اُردو۔

بانگِ درا میں ابتدائی زمانہ کا کلام شامل ہے، زیادہ تر آسان نظمیں اور غزلیں ہیں۔ لیکن بعض نظمیں بہت اعلیٰ پایہ کی ہیں۔ مثلاً خضرِ راہ، طلوعِ اسلام اور شمع اور شاعر وغیرہ۔

بالِ جبریل، ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی، اور تمام نقادانِ فن کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اس میں شعریت کا عنصر بہت زیادہ ہے، فلسفہ نسبتاً بہت کم ہے۔ اور غزلوں میں بڑی روانی اور دلکشی ہے۔

ضربِ کلیم، ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی، اس میں شعریت یا تغزل کم ہے۔ اور فلسفہ زیادہ ہے۔ بعض نظمیں اس مجموعہ میں اس قدر بلند پایہ ہیں کہ ان کی سرحد الہام سے ملی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ مختصر طور پر یوں سمجھ سکتے ہیں کہ ضربِ کلیم چونکہ بہت پختہ عمر کا کلام ہے، اس لیے قدرتی طور پر اِس میں خیالات کی گہرائی اور پختگی نظر آتی ہے۔ اور اس اعتبار سے کہ اِس کتاب میں علامہ نے دُنیا کے تمام مسائل پر اسلامی زاویۂ نگاہ سے تنقید کی ہے، کم ازکم اُردو یا فارسی میں تو کوئی کتاب اس کے پایہ کی نہیں ہے۔

ضربِ کلیم، بقول علامہ مرحوم دورِ حاضر کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس کتاب پر اتنے مختصر لفظوں میں اِس سے بہتر

تبصرہ ممکن نہیں ہے۔ جس کو شک ہو، اُسے لازم ہے کہ کتاب کا اوّل سے آخر تک مطالعہ کرنے۔ یقیناً اس تبصرہ کی صداقت آشکار ہو جائے گی۔

"دورِ حاضر" علامہ کی خاص اصطلاح ہے۔ اس کے لفظی معنی تو بالکل واضح ہیں۔ یعنی موجودہ زمانہ یا وہ دَور جو ہمارے سامنے ہے، یا بیسویں صدی، لیکن اس سے مراد ہے، وہ الحاد، تشکیک اور بیدینی جو تہذیب مغرب کا ثمر نورس ہے۔ جس نے مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ کو متاثر کر دیا ہے۔ جس کی وجہ سے مسلمان، اسلام اور قرآن دونوں سے بیگانہ ہو گئے ہیں۔ تہذیب مغرب کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ خُدا پرستی کی جگہ بُت پرستی کو فروغ ہو رہا ہے۔ اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

خود علامہ نے ایک جگہ صاف لفظوں میں بیان کیا ہے:-

دورِ حاضر بُت فروش و بُت گر است

علامہ نے اس مفہوم کو ظاہر کرنے کے لیے تہذیبِ مغرب، تہذیبِ حاضر اور عصرِ حاضر کی اصطلاحیں بھی استعمال کی ہیں، چنانچہ بالِ جبریل میں لکھتے ہیں:-

لبالب شیشۂ تہذیبِ حاضر ہے مئے "لا" سے
مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ "اِلاّ"

مجھے تہذیبِ حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی
کہ ظاہر میں تو آزادی ہے باطن میں گرفتاری

ارمغان میں لکھتے ہیں :-

ولیکن الاماں از عصر حاضر !
کہ شیطانی بسلطانی بہم کرد

خود ضرب کلیم میں ص۱۸۱ پر علاّمہ نے عصرِ حاضر کے عنوان سے تین شعر لکھے ہیں، ان کے مطالعہ سے "دورِ حاضر" کی اصطلاح کا مفہوم اور بھی واضح ہو سکتا ہے۔

الغرض "دورِ حاضر" سے اقبال کی مراد الحاد اور بیدینی کا موجودہ دور ہے۔ جس میں قدم قدم پر نئے نئے بُت نظر آتے ہیں۔ اور دُنیا اُن بتوں کی پرستش کر رہی ہے۔

اس کتاب کا ضربِ کلیم، نام رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ علاّمہ مسلمانوں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس کتاب میں جو اشعار ہیں یا بالفاظ صحیح تر اُن اشعار میں جو خیالات ظاہر کئے گئے ہیں، وہ عصرِ حاضر کے بتوں کو پاش پاش کرنے میں "ضرب کلیم" کا اثر رکھتے ہیں۔ اور علاّمہ یہ چاہتے ہیں کہ مسلمان ان خیالات پر عامل ہو کر اپنے اندر وہ طاقت پیدا کریں، جس کی بدولت وہ دورِ حاضر کے بتوں کو پاش پاش کر سکیں۔

اقبالؔ نے ابتدائی زمانہ میں وطنیت کے خلاف ایک نظم لکھی تھی، اور اُس میں مسلمانوں سے اس طرح خطاب کیا تھا :-

نظارۂ دیرینہ زمانہ کو دکھا دے
اے مصطفوی! خاک میں اِس بُت کو ملا دے

اُس وقت اُنہوں نے صرف اس قدر کہنے پر اکتفا کیا تھا کہ اے مسلمان! اس بُت کو توڑ دے۔ لیکن اس کتاب میں اُنہوں نے پوری تفصیل کے ساتھ

بُت شکنی کا طریقہ بتایا ہے۔ اور اس کا خلاصہ اِن دو شعروں میں بیان کر دیا ہے، جو ٹائیٹل پیج پر مرقوم ہیں۔ ان اشعار کا سلیس مطلب یہ ہے :-

مسلمان کی طبیعت کا اقتضاء یہ ہے کہ وہ جامد پتھر کی طرح کسی ایک جگہ یا مقام کی پابند نہیں ہو سکتی۔ وجہ یہ ہے کہ مسلمان قیدِ وطن سے آزاد ہے۔ ع

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

لہٰذا مسلمانوں کو غیر قوموں کی طرح، کسی خاص ملک سے ایسی وابستگی پیدا کرنی نہیں چاہیئے کہ وہ ہمیشہ کے لیے اُس کے غلام ہو کر رہ جائیں اور کسی وقت بھی وہاں سے ہجرت نہ کر سکیں۔ بلکہ اپنے اندر، نسیم کی طرح، سیر و سفر یا نقل مکانی کی خواہش پیدا کرنی چاہیئے۔ کیونکہ ان کا فرضِ منصبی ساری دنیا کو اسلام کا پیغام سُنانا ہے۔ اسی لیے اقبال یہ کہتے ہیں :-

ع رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی

مسلمان کی زندگی کا مقصد تو اعلائے کلمۃ اللہ ہے۔ اور مثلاً اگر مصر میں یہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا تو اپنے ہمخیالوں اور دوستوں کو ساتھ لے کر شام کی طرف چلے جاؤ۔ (جیسا حضرت موسیٰؑ نے کیا تھا)

راستہ میں صعوبات بھی درپیش ہوں گی۔ اور ممکن ہے پانی بھی نہ ملے پس اگر مردِ مومن، خودی میں ڈوب کر، اپنی خداداد مخفی صلاحیتوں کو بروئے کار لے آئے، تو اس کے اندر وہ رنگِ کلیمی پیدا ہو جائے گا کہ وہ راستہ میں جس پتھر پر اپنا عصا مارے گا۔ اُس سے ایک نہیں بلکہ ہزاروں چشمے پھُوٹ نکلیں گے۔

یہ مطلب ہے ان دو شعروں کا۔

اقبال کا کمالِ فن یہ ہے کہ اُن کے یہاں تفصیل بھی ہے۔ اور اجمال بھی ہے یعنی جس بات کو وہ پوری کتاب میں کہتے ہیں، اُسی کو وہ دو شعروں میں بیان کر دیتے ہیں۔ اور میری رائے میں اُنھوں نے یہ فن قرآن حکیم کی روح سے شدید ارتباط کی بدولت سیکھا۔

یہ ساری کتاب دورِ حاضر کے خلاف اعلان جنگ ہے۔ اُنھوں نے مسلمانوں کو دورِ حاضر سے نبرد آزما ہونے کی ترغیب دی ہے۔ اور کامیابی اور فتحمندی کا طریقہ بھی تفصیل کے ساتھ بتایا ہے۔ اور اس کو ایک مصرع میں بھی بیان کر دیا ہے کہ بُت شکنی کے لیے ضربِ کلیمی کی ضرورت ہے اور یہ طاقت "خودی میں ڈوبنے" سے حاصل ہو سکتی ہے۔

اب ایک سوال باقی رہ جاتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ خودی میں ڈوبنے کا مفہوم کیا ہے؟

میں جانتا ہوں کہ یہ شرح کالج کے طلبہ کے لیے لکھ رہا ہوں، لیکن سوال کی اہمیت کے پیشِ نظر اس کا جواب دیے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔

اس معرکتہ الآرا شعر کو پھر پڑھ لیا جائے تو مناسب ہوگا۔ ؎

ہزار چشمہ ترے سنگِ راہ سے پھوٹے
خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

(۱) کیا خودی کوئی دریا یا سمندر ہے؟
(۲) کیا اس دریا میں ڈوب سکتے ہیں؟
(۳) کیا یہ ڈوبنا حقیقی ہے، یا مجازی؟

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ اقبالؔ نے خودی کو واقعی بحر سے تشبیہہ دی ہے۔ ان کی نظر میں خودی بہت بڑی چیز ہے۔ حتیٰ کہ ؎

خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

بالِ جبریل میں لکھتے ہیں:۔

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں
تو آبجو اُسے سمجھا اگر، تو چارہ نہیں

دوسرے سوال کا جواب بھی اثبات میں ہے ؎

خودی میں ڈوبتے ہیں پھر اُبھر بھی آتے ہیں
مگر یہ حوصلۂ مردِ ہیچ کارہ نہیں

تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ "ڈوبنا" حقیقی نہیں، مجازی ہے۔
اقبالؔ نے خودی کو بحر سے تشبیہہ دی ہے، اور وجہ شبہ دونوں میں یکساں ہے، یعنی وسعت بے پایاں۔

اقبالؔ نے یہ بھی لکھا ہے کہ بحر خودی میں ڈوب کر پھر اُبھر سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سُراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن، اپنا تو بن

لیکن یہ خودی یا من میں ڈوبنا مجاز ہے، حقیقت نہیں ہے۔ ڈوبنے سے مراد ہے۔

(ا) مطالعۂ باطنی (INTROSPECTION)
(ب) مراقبہ (MEDITATION)
(ج) گیان دھیان (CON TEMPLATION)

(د) معرفت نفس حاصل کرنا (SELF KNOWLEDGE)
مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ - جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا، اُس نے گویا اپنے رب کو پہچان لیا۔

(ھ) نفس ناطقہ یا روح یا خودی کی مخفی قوتوں کو دریافت کرنا پھر ان کی صحیح خطوط پر تربیت کرنا، اور اُن قوتوں کو درجۂ کمال تک پہنچانا۔

یہی ہے دراصل خودی میں ڈوبنے کا حقیقی مفہوم۔ اب ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ یہ ہے، کہ اقبالؔ نے یہ تو کہہ دیا کہ خودی میں ڈوب جاؤ، لیکن اس ڈوبنے کا طریقہ نہیں بتایا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جن لوگوں نے علامہ کے کلام کا غور و فکر کے ساتھ مطالعہ کیا ہے، وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اُنہوں نے جاویدؔ نامہ اور مثنوی "پس چہ باید کرد" میں اس سوال کا جواب بھی دے دیا ہے۔ چنانچہ جاوید نامہ میں ایک جگہ لکھتے ہیں :-

گر نیابی صحبتِ مردِ خبیر
از اب وجد آنچہ من دارم بگیر
پیر رومی را رفیقِ راہ ساز
تا خدا بخشد ترا سوز و گداز

یعنی خودی میں ڈوبنے کا طریقہ کسی "مردِ خبیر" سے سیکھو اور اگر کسی مردِ خبیر کی یعنی مرشدِ کامل کی صحبت میسّر نہ آسکے تو پھر میرا مشورہ یہ ہے کہ مثنوی مولانا رومؒ کا مطالعہ کرو۔

مثنوی "پس چہ باید کرد"، میں تو اُنہوں نے اس مسئلہ کو بڑی تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ صرف ایک شعر لکھتا ہوں۔

اے سرت گردم گریز از ما چو تیر
صحبتِ او گیر، دبے تابانہ گیر

یعنی اے مخاطب! میں تیرے واری جاؤں، تو ہم جیسے ناقص، کتابی علم رکھنے والوں سے کنارہ کش ہو کر، کسی مرشدِ کامل کا دامن تھام لے۔ اور بڑی مضبوطی سے تھام لے۔ کیونکہ

صحبت از علمِ کتابی خوشتر است
صحبتِ مردانِ حُر، آدم گر است

بزرگوں کی صحبت علمِ کتابی سے بدرجہا زیادہ نافع ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ انسان صرف مردانِ حُر (اہل اللہ) کی صحبت کی بدولت انسان بن سکتا ہے۔

واضح ہو کہ خودی میں ڈوبنا، ایک فن ہے۔ اور جتنے فنون ہیں، اُن سب کے حصُول کا طریقہ ایک ہی ہے، یعنی صحبتِ اہل فن۔

محض طب کی کتابوں کے مطالعہ سے کوئی طبیب نہیں بن سکتا، موسیقی کی کتابوں سے گانا نہیں آسکتا۔ جب تک اُستاد رہنمائی نہ کرے کوئی شخص خوش نویس نہیں بن سکتا۔ محض کتاب میں ترکیب پڑھ لینے سے کوئی شخص زردہ یا پلاؤ دم نہیں کر سکتا۔ غرض دنیا کا کوئی فن ایسا نہیں ہے جو اُستاد کی رہنمائی اور اُس کی صحبت کے بغیر آسکے۔ تو "خودی میں ڈوبنا"، کسی ماہرِ فن کی صحبت کے بغیر کیسے آسکتا ہے!

اسلامی دنیا میں جس قدر نامور بزرگ گذرے ہیں، یعنی ایسے لوگ جنہوں نے اپنے من میں ڈوب کر زندگی کا سُراغ پایا ہے۔ مثلاً حضرت صدیق اکبرؓ، مولانا رومیؒ، حضرت خواجہ اجمیریؒ، خواجہ بہاؤالدین ملتانیؒ، حضرت مجدّد

الف ثانیؒ، حضرت مجدد دہلویؒ، حضرت سید احمد صاحب رائے بریلوی رحؒ
حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ، حضرت حجۃ الاسلام مولانا قاسم صاحب نانوتویؒ
حضرت مرشدی حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ، حضرت مرشدی شیخ الہندؒ
حضرت حکیم الامۃ مجدد تھانویؒ کثر اللہ تعالیٰ امثالہم، ان سبھوں نے اپنے اپنے
مرشدوں کی صحبت میں رہ کر یہ فن سیکھا، اور ان بزرگوں کو جو یہ مرتبہ
حاصل ہوا تو محض صحبتِ مرشد کی بدولت۔

یہی وجہ ہے کہ مولانا رومیؒ یہ فرماتے ہیں:۔

یک زمانے صحبتے با اولیا
بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

میں نے اس سوال کا جواب جو اس قدر وضاحت کے ساتھ لکھا ہے۔
اُس کی وجہ یہ ہے کہ اس دورِ جاہلیت میں مسلمانوں میں جو بہت سی خرابیاں
پیدا ہوگئی ہیں، اُن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ عوام کا تو ذکر ہی کیا ہے،
اچھے خاصے لکھے پڑھے لوگ صحبتِ مرشد کی اہمیت اور ضرورت سے
ناآشنا ہوگئے ہیں۔ چنانچہ ہمارے زمانہ میں، بعض مسلمان محض کتابی علم کی
بنا پر رہبری، ہدایت بلکہ تجدید و اجتہاد تک کے لیے کمر بستہ ہوگئے ہیں
کس قدر حیرانی ہوتی ہے کہ جو لوگ خود اپنے نفس کی اصلاح کے محتاج
ہیں، وہ دوسروں کی اصلاح کر رہے ہیں، اور بیعت لے کر "صالحین"
کی جماعت تیار کر رہے ہیں۔

اہل اللہ کی صحبت کی حاجت ضرورت اور اہمیت کی سب سے بڑی
دلیل صحابیت ہے۔ یعنی صحابۂ کرامؓ میں بعض حضرات ایسے بھی ہیں جو
حضرت صدیق اکبرؓ کے مقابلہ میں بہت ادنیٰ درجہ رکھتے ہیں لیکن ادنیٰ

سے ادنیٰ صحابی بھی تمام دنیائے اسلام کے اعلیٰ سے اعلیٰ محدثین اور فقہا
بلکہ اولیا، اور اقطاب سے زیادہ معزز اور محترم ہے۔ کیوں؟ محض اس لیے
کہ صحابہؓ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اُٹھائی تھی۔

اسی لیے حضرت مجدد تھانوی فرماتے ہیں:۔

"بھلا نری کتابوں سے بھی کوئی کامل و مکمل ہوا ہے؟
ارے بھائی! موٹی سی بات ہے کہ بلا بڑھئی کے پاس بیٹھے
کوئی شخص بڑھئی نہیں بن سکتا۔ حتیٰ کہ بسولا بھی بطور خود ہاتھ
میں لے کر اٹھائے گا تو وہ بھی قاعدہ سے نہ اٹھایا جاسکے گا۔
بلا درزی کے پاس بیٹھے سوئی پکڑنے کا طریقہ نہیں آتا۔ بلا
خوش نویس کے پاس بیٹھے اور بلا قلم کی گرفت اور کشش
دیکھے، کوئی شخص خوش نویس نہیں بن سکتا غرض بدون
کامل کی صحبت کے کوئی کامل نہیں بن سکتا۔ لہٰذا پیر کامل
کی صحبت لازم ہے۔"

(تجدید تصوف و سلوک ص ۱۱)

باز آمدم بر سر مطلب، اقبال نے اس شعر میں مسلمانوں کو اپنے اندر
ضربِ کلیم پیدا کرنے کی ترکیب بتادی ہے۔

ہزار چشمہ ترے سنگِ راہ سے پھوٹے
خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

اب یہ مسلمانوں کا کام ہے کہ وہ اس کتاب کے مطالب پر غور کر کے
مصنف مرحوم کے منشا اور آرزو کی تکمیل کریں، یا اُس کی غزلوں کو قوالی اور
ریڈیو کے رنگا رنگ پروگراموں کے لیے استعمال کریں ؎

من انچہ شرط بلاغ است با تو می گویم
تو خواہ از سخنم پند گیر، خواہ ملال

آئندہ کا علم تو اللہ ہی کو ہے۔ لیکن گذشتہ چودہ سال سے جو سلوک کلام اقبال کے ساتھ کیا جا رہا ہے، اُس کو دیکھ کر تو مجبوراً یہی کہنا پڑتا ہے کہ ابھی تک قوم نے اقبالؔ کو سمجھا ہی نہیں، اور اقبال کو تو اپنی زندگی ہی میں اس تلخ حقیقت کا احساس ہو گیا تھا۔ چنانچہ وہ ارمغانِ حجاز میں سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے یوں فریاد کرتے ہیں ؎

من اے میرِ اُمم داد از تو خواہم
مرا یاراں غزل خوانے شمردند

یعنی اے میرے اور ساری کائنات کے آقا! میں آپ کی خدمت میں یہ فریاد لے کر حاضر ہوا ہوں، کہ میں نے تو اپنی قوم کو آپؐ کا پیغام سُنایا۔ لیکن اُس نے مجھے محض ایک شاعر سمجھا!

علامہ نے یہ کتاب نواب صاحب بھوپال کے نام پر معنون کی تھی۔ اور اُن کی ذات سے کچھ توقعات بھی وابستہ کی تھیں، جن کا اظہار اُنھوں نے اُن فارسی اشعار میں کیا ہے، جو زیبِ عنوان ہیں۔

میں نے اس انتساب کی علت پر بارہا غور کیا، لیکن اس کے علاوہ اور کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آئی کہ مرحوم فطرتاً بہت احسان شناس واقع ہوئے تھے۔ چنانچہ مجھے ان کی خدمت میں ۱۹۲۴ء سے ۱۹۳۸ء تک حاضری کا موقع ملا۔ اور میں ذاتی تجربہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اگر کوئی شخص اُن کے ساتھ کوئی سلوک کرتا تھا تو وہ ہمیشہ اس کا تذکرہ شکر گذاری اور ممنونیت کے رنگ میں کیا کرتے تھے۔ چونکہ نواب صاحب بھوپال نے اُن کی

آخری علالت میں اُن کے ساتھ بہت حُسنِ سلوک روا رکھا تھا، اور علمی وظیفہ بھی مقرر کر دیا تھا۔ اس لیے اُنھوں نے اس کا بدل اس رنگ میں کیا کہ ضرب کے ساتھ اُن کے نام کو بھی زندۂ جاوید بنا دیا۔ اور میری ایماندارانہ رائے یہ ہے کہ اُنھوں نے نواب صاحب موصوف کے احسانات کا نعم البدل کر دیا۔

اس وجہ کے علاوہ اور کوئی وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی۔ کیونکہ جہاں تک اس کتاب کے نفسِ مضامین کا تعلق ہے۔ یعنی "دورِ حاضر کے خلاف اعلانِ جنگ"، میری رائے میں نواب صاحب کو ان سے کوئی نسبت نہیں ہو سکتی، اس لیے کہ اُن کی نوابانہ شخصیت اور اُن کی ریاست دونوں چیزیں انگریزوں کے رحم و کرم پر منحصر تھیں۔ نہ وہ خود مغربی تہذیب کے خلاف اعلان جنگ کر سکتے تھے، اور نہ مسلمانوں کو اس کے خلاف بغاوت کا سبق دے سکتے تھے۔ چنانچہ ہندوستان سے اس تہذیب کے علمبرداروں کے چلے جانے کے بعد آج نہ کسی رئیس کا وجود نظر آتا ہے، نہ کسی ریاست کا نشان باقی ہے۔ چند راج پرمگھ ضرور زندہ در گور کا مصداق بنے ہوئے اپنی زندگی کے دن پورے کر رہے ہیں ؎

بیک گردشِ چرخ نیلوفری
نہ نادر بجا ماند نے نادری!

۱۹۴۷ء کے انقلاب سے وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ[۱] کا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے کھنچ گیا۔

اب میں آسان لفظوں میں ان تین شعروں کا مطلب بیان کیے دیتا ہوں۔

[۱] اس زمانہ کو ہم لوگوں کے درمیان (یونہی) لوٹتے پلٹتے رہتے ہیں ۱۲

زمانہ باامم ایشیاچہ کردو کندالخ

فرماتے ہیں کہ اقوام مغرب نے اقوام ایشیا پر جو مظالم کیئے ہیں۔ ان کی داستان بہت طویل اور بہت دردناک ہے۔ اب تک کسی شخص کی توجہ اس داستان کو قلمبند کرنے کی طرف مبذول نہ ہوئی۔ انجام کار میں نے اس اہم فریضہ کو انجام دیا۔

اے ممدوح! تو صاحبِ نظر ہے۔ اور تیری فراست اس قدر بڑھی ہوئی ہے۔ کہ تو میرے جذبات اور خیالاتِ قلبی سے اچھی طرح واقف ہے۔ پس میں اپنے افکار اور احساسات تیری خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ کیونکہ تیرے اندر وہ خوبیاں جمع ہیں کہ پھولوں کو شاخ سے وہ تروتازگی نصیب نہیں ہو سکتی، جو تیرے ہاتھ میں آکر نصیب ہو سکتی ہے۔

کہ گل بدستِ تو از شاخ تازہ تر ماندہ

یہ مشہور شاعر طالب آملی کا مصرع ہے، جس پر اقبال نے تضمین کی ہے: اس کا مطلب یہ ہے کہ شاعر اپنے محبوب کی شانِ مسیحائی کا اظہار کرتا ہے کہ پھول اس کے ہاتھ میں آکر مرجھا نہیں سکتا بلکہ اور بھی تروتازہ ہو جائے گا۔ اسی طرح (اقبال کہتے ہیں) اے ممدوح میرے پاس مسلمان قوم کو تروتازہ کرنے، اور اُس کے باغ کو شگفتہ بنانے کا جو کچھ سرمایہ ہے وہ میں تیرے حوالے کرتا ہوں کیونکہ مجھے یقین ہے کہ تیرے دل میں قوم کی محبت ہے۔

میرا تبصرہ اس تہدیہ اور انتساب پر صرف یہ ہے کہ ؎

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

انتساب کے بعد علامہ نے ناظرین سے خطاب کیا ہے۔ اور تین شعروں میں اُن کو بعض اُن حقائق سے آگاہ کیا ہے جن کے بغیر کوئی قوم دنیا میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اقبال نے اسرار خودی، پیامِ مشرق زبورِ عجم، جاوید نامہ، اور "پس چہ باید کرو" اِن سب کتابوں میں ناظرین سے خطاب کیا ہے۔ (یہ دوسری بات ہے کہ قوم نے اس قلندر کے خطاب کو درخورِ اعتناء ہی نہیں سمجھا اس لیے اس کو گویوں اور قوالوں کے حوالہ کر دیا تاکہ وہ اچھی طرح اس کا پوسٹ مارٹم کر دیں)، اور وہ نکتے بیان کر دئے ہیں جن پر غور کرنے سے کتاب کے مطالب بآسانی ذہن نشین ہو سکیں۔ اور کتاب لکھنے سے جو مقصد ہے وہ بدرجہ اتم حاصل ہو سکے چنانچہ ضربِ کلیم میں بھی ناظرین سے خطاب کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ کہ اے مُسلمان! جب تک تو زندگی کے حقائق کو پیشِ نظر نہیں رکھے گا۔ تیری ذات یا شخصیت، جو باعتبار تخلیق، شیشہ کی طرح کمزور[1] ہے، حوادث روزگار کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

واضح ہو کہ اس شعر میں "زندگی کے حقائق" کی جو ترکیب واقع ہوئی ہے، یہ اس خطاب یا اس کتاب ہی کی جان نہیں ہے، بلکہ سارے فلسفۂ اقبال کی کلید ہے۔ مرحوم ساری عمر اسی کوشش میں مصروف رہے کہ قوم ؎

(۱) حقائقِ حیات سے آگاہی حاصل کرے۔ یعنی اُن اٹل صداقتوں کا

---

[1] قرآن مجید فرماتا ہے۔
خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا۔ انسان کو کمزور پیدا کیا گیا ہے ۱۲

علم حاصل کرے، جن پر بنی آدم کی حیات موقوف ہے اور
(۲) اس آگاہی کے بعد اُن صداقتوں کو ہمیشہ زندگی کے ہر شعبہ میں مدِّ نظر رکھے۔

علامہ نے ۳۲ء میں ایک صحبت میں مجھ سے ارشاد فرمایا تھا کہ :۔
" مسلمان قوم، ایک عرصہ دراز سے حقائق حیات سے بیگانہ ہو چکی ہے۔ اور اب تو فرار کی یہ کیفیت ہے کہ قوم ہر حقیقت اور ہر صداقت سے رو گرداں ہے۔ جس طرح شتر مرغ صیّاد کو دیکھ کر اپنا سر ریت میں چھپا لیتا ہے، اور سمجھتا ہے، کہ میں اُس کی نگاہوں سے محفوظ ہو گیا۔ اسی طرح مسلمان، مصائب کا مقابلہ کرنے کے بجائے خانقاہوں اور درگاہوں، اور حجروں میں اپنا سر چھپاتے پھرتے ہیں لیکن یہ کوشش بالکل بے سود ہے مصائب حیات صرف مقابلہ کرنے سے دور ہو سکتے ہیں ۔ اور یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ قوم پر تن آسانی مسلط ہو چکی ہے، وہ جد و جہد سے نفور ہے ۔ اس لیے زندگی سے دُور ہے۔ جس طرح ایک فضول خرچ اور عیاش مقروض، مستقبل کے تصوّر سے گھبرا کر شراب اور موسیقی کے دامن میں پناہ لیتا ہے اسی طرح میری قوم درگاہوں، خانقاہوں اور گنڈے تعویذوں میں سکون اور عافیت تلاش کرتی ہے "۔؎

پھر فرمایا سُنو! میں تمہیں ایک نصیحت کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ

؎ میرا یہ اصول تھا کہ میں جب علامہ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا تو اُن کے (باقی صـ۲۳ پر)

اگر تم دُنیا میں مشکلات پر غالب آنا چاہتے ہو تو FACE FACTS LIKE A MAN" (یہ جملہ علامہ نے انگریزی میں ادا کیا تھا، اس لیے میں نے بھی اسی طرح نقل کر دیا ہے) اس کی تشریح میں علامہ نے فرمایا تھا کہ مسلمان ایسے بُزدل ہو گئے ہیں کہ اب حقائق کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور اُن سے اس طرح بھاگتے ہیں جس طرح قصائی سے گائے پس تم حقائق کی اہمیّت کا مردانہ وار اعتراف کرو، اور اُن کے وجود کو تسلیم کرو۔"

FACE FACTS LIKE A MAN کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً: فضول خرچی سے انسان تباہ ہو جاتا ہے۔ اب یہ ایک حقیقت ہے۔ لیکن مسلمان چونکہ جانتا ہے کہ اس حقیقت پر غور کرنے سے، یا اس کا اعتراف کرنے سے موجودہ عیش میں خلل پڑ جائے گا۔ اُس کا مسلک تو یہ ہے۔

اب تو آرام سے گذرتی ہے عاقبت کی خبر خدا جانے

اس لیے وہ کبھی اس حقیقت پر غور نہیں کرتا۔ اور اگر کوئی شخص اُس کو اس طرف متوجہ کرتا ہے، تو وہ فوراً موضوعِ سخن بدل دیتا ہے۔"

اب میں چند سطور میں زندگی کے حقائق کی تشریح بھی کر دوں مناسب ہے کہ اُن کو چند مثالوں سے واضح کر دیا جائے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

(۱) منجملہ حقائقِ حیات، ایک حقیقت یہ ہے کہ انسان کو اُسی بات کا ثمرہ ملے گا، جس بات کے لیے وہ کوشش کرے۔

(۲) دوسری حقیقت یہ ہے کہ زید کو دوا پلانے سے بکر کا مرض دُور

(بقیہ حاشیہ صـ۲۲) ارشادات حتیّ الوسع اُنہی کے لفظوں میں قلمبند کرتا جاتا تھا۔ یہ عبارت اُنہی ملفوظات سے ماخوذ ہے۔ ۱۲۰

نہیں ہو سکتا۔

(۳) تیسری حقیقت یہ ہے کہ یہاں تنازع للبقا اور بقائے اصلح کا قانون کارفرما ہے۔

(۴) چوتھی حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی سُنّت میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ مثلاً اللہ نے یہ قانون بنا دیا ہے کہ نیم کے بیج سے انار کا پودا نہیں اُگ سکتا۔

گندم از گندم بروید جو ز جو
از مکافاتِ عمل غافل مشو

(۵) پانچویں حقیقت یہ ہے کہ جب تک کوئی قوم اپنی حالت بدلنے کے لیے جدّوجہد نہ کرے، اللہ بھی اس کی حالت نہیں بدلتا۔

(۶) چھٹی حقیقت یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتا۔

(۷) ساتویں حقیقت یہ ہے کہ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔

(۸) محنت کے بغیر راحت حاصل نہیں ہو سکتی۔

(۹) نویں حقیقت یہ ہے کہ جدوجہد سے حکومت ملتی ہے، حکومت سے دولت حاصل ہوتی ہے، دولت سے عیش وعشرت کا دروازہ کھلتا ہے۔ عیش وعشرت کا نتیجہ تن آسانی ہے۔ تن آسانی کا نتیجہ محکومی اور غلامی ہے۔

(۱۰) دسویں حقیقت یہ ہے کہ جاہل آدمی اور حیوان (گھوڑا، گدھا، گائے بیل، بکری) میں مقصدِ حیات کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔ یعنی جس طرح گھوڑے کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں سوائے اس کے کہ وہ دوسروں کی گاڑی کھینچے، اسی طرح جاہل فرد، یا قوم کی

زندگی کا بھی کوئی مقصد نہیں، جز اینکہ وہ دیگر اقوام کی غلامی کرے اور اُن کی آسائش کے سامان مہیا کرتا رہے۔ (تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ)

اب میں اس کتاب کے ناظرین سے دریافت کرتا ہوں کہ وہ ایک طرف ان حقائق کو مدِّنظر رکھیں، دوسری طرف مسلمان قوم کی زندگی پر تنقیدی نگاہ ڈالیں۔ کیا یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت نہیں ہے کہ مسلمان قوم صدیوں سے حقائقِ حیات سے بیگانہ ہو چکی ہے؟

اقبالؔ کی پہلی اور سب سے بڑی نصیحت یہ ہے کہ زندگی کے حقائق کو ہر وقت پیشِ نظر رکھو۔ یہ طریقہ بالکل تباہ کُن ہے کہ تم گھروں میں فضول خرچی کرکے مقروض ہو جاؤ، اور مسجدوں میں خدا سے دُعا کرو کہ اے اللہ ہماری پریشانی کو دور فرما"۔ یاد رکھو تمہاری دُعا کبھی مقبول نہیں ہوگی، کیونکہ اللہ اپنا قانون تمہارے لیے کیوں توڑ دے؟

انسان بہت کمزور ہے۔ اگر وہ زندگی (فطرت) کے اٹل قوانین کو مدِّنظر نہیں رکھے گا، تو کشمکشِ حیات میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

اے مسلمان! یہ دنیا عیش وآرام کی جگہ نہیں ہے، بلکہ زورِ دست اور ضربتِ کاری کا مقام ہے۔ یہ دُنیا بساطِ رقص وسرود اور محفلِ خورونوش نہیں، بلکہ میدانِ جنگ ہے۔ بلکہ جدل وپیکار کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ جو قومیں سکون کی متلاشی ہیں وہ فنا ہو جائیں گی۔ کیونکہ سکون کا لفظ، فطرت کی لغت میں کہیں مذکور نہیں ہے۔ بقول اقبال

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانہ میں ثبات ایک تغیر کو ہے زمانہ میں

سکون تو صرف قبر میں مل سکتا ہے۔ یہ دنیا سکون کے لیے نہیں بنائی

گئی یہاں تو ہر وقت جدّ و جہد در کار ہے ؎[1]

فریب نظر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرّۂ کائنات

دنیا کا قانون یا اصل اُصول سکون نہیں ، بلکہ تغیر اور انقلاب ہے یعنی حرکت ، اور حرکت کے تسلسل کا نام جدّ و جہد ہے اور یہی مسلمان کی زندگی کی شناخت ہے ؎

نشاں یہی ہے زمانہ میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں اُن کی تقدیریں

القصّہ جب یہ ثابت ہو چکا کہ دنیا میدانِ جنگ ہے تو اے مسلمان ! تو میدانِ جنگ میں اپنی طاقت کا مظاہرہ کر ، ضربِ پیہم کا نمونہ دکھا ، نوائے چنگ و رباب کی تمنا مت کر ۔

اس دُنیا میں وہی قومیں ، عزت کی زندگی بسر کر سکتی ہیں (سرمایۂ حیات ! اُنہی کو مل سکتا ہے) جو رات دن ، خونِ دل و جگر پیتی رہتی ہیں یعنی جدّ و جہد کرتی رہتی ہیں ۔ کیوں ؟ اس لیے کہ فطرت لہو ترنگ ہے جل ترنگ نہیں ہے ۔

یہاں اقبال نے لفظ "ترنگ" سے شاعرانہ نکتہ پیدا کیا ہے ، "جل ترنگ" ایک باجہ کا نام ہے ۔ جس کی صورت یہ ہے کہ ساتؔ یا بارہؔ پیالوں میں مختلف مقدار میں پانی بھر کر نیم دائرہ کی شکل میں سامنے رکھ لیتے ہیں اور لکڑی کے ٹکڑے سے پانی سے آوازیں پیدا کرتے ہیں ۔

[1] چنانچہ سرکار دو عالم ؐ کی ۲۳ سالہ پیغمبرانہ زندگی اس حقیقت پر شاہد ہے کہ حضورؐ تا دمِ وصال باطل کے خلاف شمشیر بکف رہے ۱۲

اقبالؔ کہتے ہیں کہ فطرت ، جل ترنگ نہیں ، یعنی پانی سے نہیں کھیلتی ۔ دوسرے معنی ہیں کہ عیش و عشرت ، اور نغمہ و سرود کا نام نہیں ۔ بلکہ لہو ترنگ ہے ۔ یعنی خون سے کھیلتی ہے ۔ بالفاظ دیگر ، جدّ و جہد مقابلہ اور پیکار کا نام ہے ۔ یاد رکھو ! دُنیا میں وہی قومیں برسرِ اقتدار آتی ہیں جو ہر وقت مصروفِ جدّ و جہد رہتی ہیں ۔

اسی لیے قرآن مجید نے مسلمانوں کو ہر وقت جہاد فی سبیل اللہ کے لیے تیار رہنے کا حکم دیا ہے ۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ
مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ
الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ
عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ
وَاٰخَرِيْنَ مِنْ
دُوْنِهِمْ

اور تیار کرو کافروں سے لڑائی کے لیے جو کچھ تم جمع کر سکو قوت سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے اس سے تمہاری دھاک بیٹھے اللہ کے دشمنوں پر اور تمہارے دشمنوں پر ، اور دوسروں پر اُن کے سوا ۔ ۱۲

(سورہ ۸ ع ۸)

اس کے بعد تمہید شروع ہوتی ۔ اور اس عنوان کے تحت ، اقبالؔ نے اپنے خیالات دو حصوں میں ظاہر کئے ہیں یا یوں کہہ سکتے ہیں ۔ کہ تمہید کے دو حصّے ہیں ۔ پہلے حصّہ میں انہوں نے ایشیائی اقوام سے عموماً اور مسلمانوں سے خصوصاً خطاب کیا ہے ۔ اور بعض حقائق و معارف ان پر واضح کئے ہیں ۔ دوسرے حصّہ میں اپنے متعلق خود تبصرہ کیا ہے ۔

—— (۱) ——

نہ دیر میں نہ حرم میں خودی کی بیداری الخ

(۱) فرماتے ہیں کہ موجودہ حالت یہ ہے کہ ایشیاء میں ، نہ مسلمانوں کی خودی بیدار ہے ، نہ غیر مسلموں کی۔ مسلم اور غیر مسلم دونوں اپنی خودی سے غافل ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مشرقی اقوام کی روح خوابیدہ ہے۔ خودی کی بیداری کے لیے ہوش شرط ہے لیکن جو شخص یا قوم افیون کے نشہ میں مست ہو اُس کی خودی کیسے بیدار ہو سکتی ہے؟

(۲) جو قوم کشمکشِ حیات میں مبتلا ہو ، اور چاروں طرف سے آفات میں محصور ہو، اس کو لازم ہے کہ پہلے اُن سے نجات حاصل کرے اگر وہ قوم غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کے بجائے فلسفہ اور منطق کے مسائل میں منہمک رہے ، تو یہ انہماک اُس کے حق میں بہت مضر ہے۔

(۳) اے مخاطب! اگر تو اپنی نادانی سے خودی کو پیکرِ خاکی یعنی مادی شئے سمجھتا ہے تو پھر تو موت کے غم سے نجات نہیں پا سکتا۔ یعنی اگر کوئی مسلمان ، اپنی جہالت سے یہ سمجھتا ہے کہ روح بھی جسم کی طرح فانی ہے ، اور مرنے کے ساتھ ساتھ زندگی ختم ہو جائے گی تو وہ شخص بلاشبہ موت کے تصور سے لرزہ براندام رہے گا۔ لیکن اگر وہ یہ سمجھتا ہے کہ میری خودی ، موت کے بعد بھی باقی رہے گی تو پھر اُسے موت کا کوئی ڈر نہ ہوگا۔

(۴) دنیا میں جو واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں اُن کا وقوع ، مختلف النوع

قوانین کا پابند ہے۔ اور ہر واقعہ کا جس طرح کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے ، اسی طرح نتیجہ بھی ہوتا ہے۔ یعنی زمانہ ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح ہے ، جسے ہر صاحبِ بصیرت پڑھ سکتا ہے۔ لیکن اگر تو اسباب اور نتائج کو نہیں دیکھ سکتا تو اس کا سبب یہ ہے کہ تیرا دل اور تیری نظر دونوں ناپاک ہیں۔ اور یہ ناپاکی تیرے حق میں حجاب بن گئی ہے۔

(۵) میرے کلام میں اللہ نے بڑی تاثیر بخش دی ہے۔ اور یہ اس لیے ہے تاکہ میں اپنے کلام سے ایشیاء والوں کو بیدار کر دوں۔

تمہید کے دوسرے حصّہ میں علامہ کہتے ہیں کہ

شعر(۱) اگرچہ میں زمانہ کی مانند کم پیوند ہوں ، کسی سے تعلق نہیں رکھتا ، لیکن اس کے باوجود میں نے محفل آراستہ کر دی ہے یعنی بہت سے لوگ میرے ہمخیال ہو گئے ہیں۔

(۲) جو لوگ پوست افیون کے عادی تھے ، میں نے انہیں ہوشیار کر دیا اور میرے کلام کی بدولت ان میں آزادی ، اور حصولِ سروری کے جذبات پیدا ہو گئے۔

(۳) اور وہ محکوم قومیں جو غلامی کی زندگی میں خورسند تھیں ، اب آزادی کی فضاء میں سانس لینا چاہتی ہیں۔

(۴) اس لیے اسلام کی مخالف طاقتیں ، یہ چاہتی ہیں کہ کوئی صورت ایسی ہو کہ میں نوائے سحر اور مقامِ شوق سے محروم ہو جاؤں ، تاکہ محکوم قوموں کے اندر حریت کے جذبات پیدا نہ کر سکوں۔

تمہید کے بعد اصل کتاب شروع ہوتی ہے۔ علامہ نے حسبِ ذیل

عنوانات کے تحت اپنے افکار قلمبند کئے ہیں۔

اسلام اور مسلمان، تعلیم و تربیت، عورت، ادبیات، فنونِ لطیفہ، سیاسیات مشرق و مغرب، اور محراب گل افغان کے افکار۔

بالفاظ دیگر اُنھوں نے ان عنوانات کے تحت انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ پر تنقید کی ہے۔ اور ہر معاملہ میں اسلامی زاویۂ نگاہ پیش کیا ہے۔

آخر میں اس بات کا اعادہ ضروری ہے کہ یہ شرح خاص طور سے طلبہ کے لیے لکھی گئی ہے (تاکہ انہیں اقبال فہمی میں سہولت ہو سکے۔ اور اگر وہ اقبال کے پیغام کو ذہن نشین کر سکیں گے تو مجھے یقین ہے کہ وہ اُن کے مقصد کی تکمیل کے لیے کچھ کوشش بھی کریں گے) یہی وجہ ہے کہ میں نے ہر جگہ اختصار سے کام لیا ہے۔ ورنہ اس کتاب میں بہت سے اشعار ایسے ہیں کہ اُن کی شرح کے لیے سیکڑوں صفحات درکار ہوں گے۔

حرفِ آخر | آج سے تین سو سال پہلے (یعنی جب مسلمان زندہ تھے۔) مسلمان حکمران علم اور علماء دونوں کی قدر کرتے تھے۔ اور ہر عالم کے لیے علمی وظائف مقرر کرتے تھے تاکہ وہ سکونِ قلب کے ساتھ تصنیف و تالیف میں مشغول رہ سکے۔

چنانچہ حضرت عالمگیر رح کے زمانہ میں ہر اونچے درجہ کے طالبِ علم کو آٹھ آنے سے لے کر دو روپے یومیہ وظیفہ ملتا تھا۔ اور ہر عالمِ دین کو معقول علمی وظیفہ دیا جاتا تھا۔ علّامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کو شاہ جہان نے دو گاؤں بطور مددِ معاش عطا کئے تھے۔

لیکن آج بقول اُستادِ محترم حضرت مولانا رسول خانصاحب مدفیضہ،

"علم سے زیادہ کوئی چیز ذلیل و خوار نہیں ہے۔"

اندریں حالات، میں نے صرف اللہ کی تائید کے بھروسہ پر کلامِ اقبال کی شرح کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ اور اُسی سے التجا کرتا ہوں کہ وہ مجھے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت کی توفیق عطا فرمائے آمین ◆



شرح کتاب

حصہ اوّل

صُبح

فرماتے ہیں کہ یہ تو مجھے معلوم نہیں[1] کہ یہ سحر جس سے ہم کل اور آج کا شمار کرتے ہیں کیسے اور کہاں سے پیدا ہوئی ہے۔ لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ وہ سحر، جس سے یہ کائنات کانپ اُٹھتی ہے، بندۂ مومن کی اذان سے پیدا ہوتی ہے۔ یعنی مومن کے نعرۂ تکبیر "اللہ اکبر" میں ایسی تاثیر ہے، کہ ساری کائنات لرزہ بر اندام ہو جاتی ہے۔ اور بڑے بڑے بُت سہم جاتے ہیں۔

خلاصۂ کلام اینکہ ایک سحر تو وہ ہے جو طلوع آفتاب سے پیدا ہوتی ہے۔ اور اُس کی مدد سے ہم ماہ و سال کا شمار کرتے ہیں۔ لیکن ایک سحر اور بھی ہے جس سے ایوان وجود میں زلزلہ پڑ جاتا ہے۔ اور وہ سحر مومن کی اذان[2] سے پیدا ہوتی ہے۔

---

[1] اقبال کا کہنا کہ "نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا" محض تجاہل عارفانہ ہے، مطلب ان کا یہ ہے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ وہ سحر طلوع آفتاب سے پیدا ہوتی ہے

[2] اسلامی تاریخ میں بندۂ مومن کی اذان سے ایسی سحر کے پیدا ہونے کی بہت سی مثالیں موجود ہیں، میں صرف ایک سحر کا حال درج کرتا ہوں:- (باقی صـ۳۳ پر)

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

میرا خیال ہے کہ حقائق نگاری اور فلسفہ طرازی کے لحاظ سے اِس سے بہتر اور برتر نظم ساری کتاب میں موجود نہیں ہے۔ اگر اس عدیم المثال نظم کے ہر شعر کی مفصل شرح لکھی جائے تو ایک دفتر درکار ہو گا۔ اگرچہ میں دل پر جبر کر کے اختصار سے کام لوں گا، لیکن پہلے شعر میں جو لفظ "خودی" آیا ہے اُس کی مختصر تشریح بہت ضروری ہے۔

واضح ہو کہ 'خودی' اقبال کی خاص اصطلاح ہے۔ اور ان کے فلسفہ کا نقطۂ ماسکہ ہے۔ چنانچہ جو شخص خودی اور فلسفۂ خودی سے واقف نہیں وہ بھی اتنا ضرور جانتا ہے کہ اقبال نے خودی کا فلسفہ دُنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔

(۱) <u>خودی کے لغوی معنی</u> : خودی فارسی زبان کا لفظ ہے "خود" سے مشتق ہے۔ خودی بمعنی ذاتِ خویش جسے عربی میں اَنا۔ اور انگریزی میں (SELF) کہتے ہیں۔ خودی کو اُردو میں لفظ "میں" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ جب ایک انسان یہ کہتا ہے کہ مثلاً میں یہ کام کروں گا تو وہ لفظ "میں" سے اپنی ذات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ہم اس کی تشریح نہیں کر سکتے کہ یہ "میں" دراصل کیا ہے۔ بس اتنا جانتے ہیں کہ وہ

(بقیہ حاشیہ صـ۳۲) ۷ر جولائی ۷۱۱ء کو جب طلوع آفتاب سے پہلے مسلمانوں نے سرزمین اُندلس میں فجر کی اذان دی اور جنگ سے پہلے اپنے سپہ سالار طارق کی امامت میں نماز ادا کی تو وہ سحر پیدا ہوئی جس سے اسپین کی سرزمین لرزہ براندام ہو گئی۔ ۱۲

موجود ہے۔ اقبال کا پیغام یہی ہے کہ اس نقطۂ نوری کو پہچانو۔

(ب) خودی کے مرادی معنیٰ : خودی سے ہم بعض اوقات خودداری اور عزتِ نفس بھی مراد لیتے ہیں۔ اور اس مفہوم کی سرحد تکبّر سے ملی ہوئی ہے۔ یعنی جب اس جذبہ میں افراط ہو جائے تو تکبّر کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔

(ج) تصوف میں خودی کا مفہوم : صوفیا کے لٹریچر میں خودی سے خود بینی یا تکبّر مراد لی گئی ہے۔ وہ خودی کو اچھے معنوں میں استعمال نہیں کرتے یہی وجہ ہے کہ ہم کو تصوف کی کتابوں میں ایسے جملے ملتے ہیں کہ جب تک خودی کو نہ مٹایا جائے، خدا نہیں مل سکتا۔ گویا صوفی خودی کو تکبر کے معنی میں استعمال کرتا ہے۔ وہی تکبر جس کے متعلق سعدیؒ نے لکھا ہے ؎

تکبّر عزازیل را خوار کرد
بزندانِ لعنت گرفتار کرد

یہی وجہ ہے کہ جب ۱۹۱۴ء میں اقبالؔ نے اپنی شہرۂ آفاق مثنوی "اسرارِ خودی" شائع کی تو صوفیوں کی جماعت نے ازراہِ نادانی، اُن پر اعتراض کیا کہ اقبال تو مسلمانوں کو تکبّر کی تعلیم دے رہے ہیں۔ اور یہ ہنگامہ ۱۹۱۵ء سے شروع ہو کر ۱۹۲۰ء تک جاری رہا۔ چنانچہ علامہ نے اس باب میں اپنی پوزیشن واضح کی اور بتایا کہ "خودی" کو میں نے اِن معنوں میں استعمال نہیں کیا۔[۱]

(د) خودی کے اصطلاحی معنیٰ : اقبال کے کلام میں خودی سے خود بینی یا غرور مراد نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مصداق وہ شئے ہے جس سے قیامت

[۱] اس منافشہ کی تفصیل اسرارِ خودی کی شرح میں لکھوں گا جو عنقریب شائع ہونے والی ہے ۱۲

کے دن باز پُرس ہو گی۔ یا وہ شئے مراد ہے جس کا تزکیہ کر لیا جائے تو انسان فلاح پا جائے گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :- قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا۔ "تحقیق مراد کو پہنچا جس نے اس کو سنوار لیا" یعنی جس نے اپنی خودی کا تزکیہ کر لیا، وہ کامیاب ہو گیا۔

(ب) اقبالؔ کے الفاظ میں خودی، ایک نقطۂ نوری ہے۔ چنانچہ گلشنِ رازِ جدید میں لکھتے ہیں :؎

نقطۂ نوری کہ نام او خودی است
زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی است

یعنی خودی ایک غیر مادّی جوہر ہے، لیکن مادی جسم پر تصرف کر سکتی ہے

(ج) یہ موجِ نفس کیا ہے؟ تلوار ہے۔
خودی کیا ہے؟ تلوار کی دھار ہے۔

(د) خودی وہی شئے ہے جسے منطقی اصطلاح میں نفسِ ناطقہ کہتے ہیں۔ اور قرآن مجید نے اس کو کہیں نفس سے تعبیر کیا ہے کہیں روح سے۔ اور اس کی تین حالتیں بیان کی ہیں۔ نفسِ امارہ، نفسِ لوامہ، اور نفسِ مطمئنہ

(ہ) خودی وہ جوہر ہے جس کی بدولت انسان استنباط، استخراج اور استدلال کر سکتا ہے۔

(و) خودی وہ جوہر ہے جس کی بناء پر انسان کو اشرف المخلوقات کا لقب عنایت ہوا، اور انسان کی خودی اس احساس کا نام ہے کہ میں اشرف المخلوقات ہوں۔

خودی میں بے اندازہ قوتیں مخفی ہیں۔ اور اقبالؔ کے فلسفۂ خودی کا ماحصل یہ ہے کہ انسان اُن مخفی قوتوں کی صحیح طریق پہ تربیت کرے۔ اور تربیت

کا طریقہ یہ ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اتباع کرے اور اتباع کی واحد صورت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات سے محبت کرے۔

خلاصہ کلام اینکہ عشق رسولؐ کے بغیر اتباع رسولؐ ناممکن ہے۔ اور اتباعِ رسولؐ کے بغیر خودی مرتبۂ کمال تک نہیں پہنچ سکتی۔ اور جب تک خودی مرتبۂ کمال کو نہ پہنچے انسان اپنا مقصدِ حیات حاصل نہیں کر سکتا اور اگر مقصدِ حیات حاصل نہ ہوا تو عدم اور وجود دونوں برابر ہو گئے۔

یہی وجہ ہے کہ اقبالؔ نے عشقِ رسولؐ پر اپنا سارا زورِ کلام صرف کر دیا ہے۔

اقبالؔ کا یہ فلسفہ قرآن کریم کی اس آیتِ شریفہ سے ماخوذ ہے :-

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ	یعنی اے رسولؐ آپ مسلمانوں سے فرما دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو اُس کی صورت یہ ہے کہ میری اتباع کرو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ خود تم سے محبت کرنے لگے گا۔

(سورۂ آل عمران)

اس آیت کو سمجھنے کے لیے ذیل کی آیت کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے :-

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ	جو لوگ ایمان دار (مومن) ہیں اُن کی پہچان یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔

(سورۂ بقرہ)

یعنی ایمان کی بنیاد، محبّتِ الٰہی ہے۔ اور اللہ سے محبّت کرنے کی صورت یہ ہے کہ رسولؐ اللہ کی اتباع کی جائے[1] اور اتباعِ رسولؐ، بغیر محبّتِ رسولؐ ممکن نہیں ہو سکتی۔ اس لیے دراصل ایمان کی بنیاد محبتِ رسولؐ ہے۔

اب اس نظم کے اشعار کا مطلب مختصر طور پر لکھتا ہوں۔

شعر۱ انسانی خودی کی ترقی، اور ارتقائے کامل اس بات پر موقوف ہے کہ انسان کلمۂ توحید پر اس طرح ایمان لائے کہ اس کے عمل سے یہ ثابت ہو کہ وہ کائنات میں اللہ کے سوا نہ کسی ہستی سے ڈرتا ہے نہ کسی کی اطاعت کرتا ہے۔ یعنی اللہ کے سوا نہ وہ کسی کو اپنا معبود قرار دیتا ہے، نہ مقصود، نہ مطلوب، اس کا مرنا اور جینا صرف اللہ ہی کے لیے ہے (یہ کیفیت پیدا نہیں ہو سکتی جب تک اللہ سے شدید محبت نہ ہو) لیعنی توحید پر عامل ہونے سے خودی کی مخفی قوتیں بروئے کار آ سکتی ہیں۔ اور وہ اپنے مرتبۂ کمال کو پہنچ سکتی ہے۔

خودی کو اگر تیغ سے تشبیہ دی جائے تو جب تک تلوار میں دھار نہ ہو اور کاٹ میں تیزی نہ ہو، تلوار بیکار ہے، اس لیے توحید خودی کے لیے بمنزلۂ فسان ہے۔ جس طرح سان پر چڑھانے سے "تلوار" صحیح معنی میں تلوار بن جاتی ہے۔ اُسی طرح جب مسلمان حقیقی معنی میں موحّد بن جاتا ہے، تو اُس کی خودی اپنے مرتبۂ کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ اسی نکتہ کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے ؎

[1] اللہ تعالیٰ کی ذات چونکہ وراء الوراء اور نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ اس لیے کوئی انسان اُس سے براہِ راست محبّت نہیں کر سکتا۔ صرف آنحضرتؐ کے واسطہ سے اُس ذاتِ بے چوں تک پہنچ سکتا ہے۔ ۱۲

چڑھتی ہے جب فقر کی سان پر تیغ خودی
ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کارِ سپاہ

شعر۲۔ فرماتے ہیں کہ جس طرح حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ میں نمرود نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا اور اللہ کے بندوں کو اپنی پرستش پر مجبور کیا تھا اور حضرت موصوف نے اس کا خاتمہ کیا تھا، اسی طرح موجودہ زمانہ میں کئی نمرود پیدا ہوگئے ہیں، جو خدائی کا دعویٰ کرکے اللہ کے بندوں کو گمراہ کررہے ہیں۔ اس لیے موجودہ زمانہ بھی اس بات کا متمنی ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ ایسا پیدا ہو جو عصر حاضر کے بتوں کو پاش پاش کردے۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ یہ دنیا تو صنم کدہ ہے۔ اور پرستش اور اطاعت کے لائق صرف اللہ کی ذات ہے۔

شعر۳۔ اے مسلمان! اگر تو نے اس دنیائے فانی سے دل لگایا ہے تو بلاشبہ تو نے "متاعِ غرور" کا سودا کیا ہے۔ اقبال نے یہاں دُنیا کی زندگی کو قرآنی تعلیم کے مطابق متاع غرور یعنی دھوکہ کی پونجی قرار دیا ہے۔ جیسا کہ اللہ فرماتا ہے :۔ وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ط۔ نہیں ہے دُنیا کی زندگی مگر دھوکہ کی پونجی۔

اے انسان! تو دُنیا کی دلچسپیوں میں منہمک ہوگیا ہے اور سمجھتا ہے کہ اگر میں نے سچ بولا تو حکومت ناراض ہوجائے گی اور مالی نقصان ہوجائے گا۔ اور اگر میں خدا کے بجائے اربابِ اقتدار کی اطاعت کروں گا تو مجھے دولت اور عزت نصیب ہوگی۔ یہ سب خیالات بالکل مہمل ہیں۔ تو غلط طور پر نفع اور نقصان کے فریب میں مبتلا ہو گیا ہے۔ ارے نادان! نہ اِس دُنیا کی کوئی اصلیت ہے۔ اور

نہ اس کا سود وزیاں کوئی حقیقت رکھتا ہے۔ کیونکہ اللہ کے سوا نہ کوئی معبود ہے، نہ مقصود، نہ مطلوب۔

شعر۴۔ اے مخاطب! دنیا اور اُس کے متعلقات اور اس کے گوناگوں مناظر اور مظاہر، مثلاً مال و دولت، بیوی بچے، رشتہ دار اور مادی سامانِ آرائش، جن کے لیے تو اللہ اور اُس کے احکام سے روگردانی کرتا ہے۔ یہ سب بے حقیقت اور فانی چیزیں ہیں یہ سب تیرے وہم اور گمان کے تراشے ہوئے بُت ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے سوا، مسلم کا نہ کوئی معبود ہو سکتا ہے نہ مطلوب نہ مقصود اللہ ہی ایک مستقل، قائم بالذات اور باقی ہستی ہے۔ وہی اس لائق ہے کہ اُس سے محبت کی جائے۔ اور صرف وہی اِس لائق ہے کہ اُسے مقصودِ زندگی بنایا جائے۔ مال، دولت، جاگیر عہدے، بیوی بچّے، ان میں سے کسی کو ثبات نہیں ہے۔ اور اس لیے ان میں سے کسی کے ساتھ دل لگانا سراسر نادانی ہے۔ کیونکہ نہ اُنہیں دوام ہے اور نہ تو ان کو اپنے ساتھ قبر میں لے جا سکتا ہے

شعر۵۔ زمان و مکان کی بحث چونکہ بہت طویل ہے۔ اور کالج کے طلبہ کی فہم سے بھی بالاتر ہے، اس لیے اس سے قطع نظر کرکے شعر کا مطلب یہ ہے کہ دُنیا کے عقلاء اور حکما، مدتوں سے اس مسئلہ میں اُلجھے ہوئے ہیں کہ زمان و مکان (TIME AND SPACE) کی حقیقت کیا ہے؟ یہ خارج میں موجود ہیں یا نہیں؟ اس بحث میں عقلاء اس قدر منہمک ہوئے کہ خدا کے بجائے زمان و مکان کے تصورات کی پرستش کرنے لگے۔ حالانکہ اصلی اور بنیادی چیز حیات ہے۔ انسان کو سب سے

زیادہ توجہ اِس بات پر دینی چاہیئے کہ زندگی کا مقصد کیا ہے؟ رہا "زمان" یا "زمانہ" تو وہ ہماری زندگی (حیات) ہی کا دوسرا نام ہے۔
اور اس کا تصور زندگی ہی سے وابستہ ہے ؎

زندگی دہر است و دہر از زندگی است
لَا تَسُبُّوا الدَّهْرَ فرمان نبی است [1]

اور حیات خود اللہ تعالیٰ کے حکم سے موجود ہوئی ہے۔ جیسا کہ قرآن حکیم فرماتا ہے۔

قُلِ الرُّوحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا

آپ کہہ دیجئے کہ روح میرے رب کے "امر" سے موجود ہوئی ہے اور تم لوگ اس کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہو سکتے کیونکہ تمہیں حقائق اشیاء کا بہت قلیل علم دیا گیا ہے۔

یعنی روح کی ماہیت عقل انسانی کی دسترس سے بالاتر ہے۔ اور زمان و مکان کا تصور، خود روح یا حیات سے وابستہ ہے۔ اس لیے اس کی حقیقت کا سمجھنا بھی بہت دشوار ہے۔ بقول اقبال صرف وہ شخص زمانہ کی حقیقت کو سمجھ سکتا ہے۔ جو "خودی" کی حقیقت سمجھ سکتا ہے جب

[1] اقبال نے اسرار خودی میں یہ شعر لکھا ہے کہ زندگی، زمانہ ہی کی ایک شان ہے۔ اور زمانہ کا وجود زندگی ہی سے وابستہ ہے۔ یعنی زندگی نہ ہو تو زمانہ کا تصور نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جب تصور کرنے والا ہی نہیں تو تصور کون کرے گا؟ اسی لیے حضورؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ زمانہ کو بُرا مت کہو۔ ۱۲

تک نفس کی معرفت حاصل نہ ہو زمان و مکان کی ماہیت یا حقیقت معلوم نہیں ہو سکتی۔

پس ایک مسلمان کو معلوم ہونا چاہیئے کہ دراصل نہ زمانہ کا وجود ہے نہ مکان کا وجود ہے۔ ان دونوں کا وجود اعتبار معتبر[1] پر موقوف ہے۔ دراصل ایک ہی ذات ہے جس کا وجود حقیقی ہے۔ اور وہ اللہ ہے۔ اُسی کے فیض سے حیات موجود ہوئی (اللہ نہ ہوتا تو یہ کائنات بھی نہ ہوتی) اور حیات نے زمان و مکان کے تصورات پیدا کئے۔ کیونکہ حادثات و واقعات عالم کا عقلی تقاضا یہ ہے کہ ماضی بھی ہو حال بھی ہو، استقبال بھی ہو۔ مثلاً آپ جب انقلاب ۱۸۵۷ء کا ذکر کریں گے تو زمانہ ماضی کا تصور لامحالہ پیدا ہو جائے گا۔

الغرض زمانہ موقوف ہے حیات انسانی پر، حیات منحصر ہے ذاتِ باری کے فیضان یا اُس کی صفتِ ربوبیت کی تجلی پر تو اقبال کہتے ہیں کہ دراصل نہ ہے زمان نہ مکان، صرف اللہ ہی موجود ہے۔ اور یہ دنیا اور اس کے مظاہر، یعنی زمان و مکان، سب ظلّی وجود رکھتے ہیں۔ یہ سب اس کے سہارے سے موجود ہیں، اِن کا وجود حقیقی یا خانہ زاد نہیں ہے۔ چنانچہ اس حقیقت کو اقبال نے بالِ جبریل میں بایں الفاظ بیان کیا ہے۔

وہی اصل مکان و لامکان ہے
مکاں کیا شئے ہے؟ انداز بیاں ہے
خضر کیونکر بتائے؟ کیا بتائے؟
اگر ماہی کہے، "دریا کہاں ہے"

[1] یعنی زمان کے وجود کا تحقق، نفس مدرک کے وجود پر موقوف (باقی بر صفحہ ۴۲)

اقبال کی رائے میں زمان (TIME) خود اسرارِ کائنات میں سے ایک سِر یا راز (MYSTRY) ہے اور محض عقل اُس کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہو سکتی۔ ان چیزوں کی ماہیت صرف عارف کو حاصل ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اقبال خود کہتے ہیں۔ ؎۵

نغمۂ خاموش دارد سازِ وقت؛
غوطہ در دل زن کہ بینی رازِ وقت؛

اور ظاہر ہے کہ غوطہ لگانے کا طریقہ مرشد کامل کی صحبت میں رہ کر حاصل ہو سکتا ہے۔

شعر ۶ "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ" ایک ایسی حقیقت ثابتہ ہے کہ ہر وقت اور ہر حال میں درست ہے۔ عموماً لوگ موسم بہار میں موسیقی پسند کرتے ہیں لیکن یہ "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ" کا نغمہ ایسا دلپذیر ہے کہ بہار ہو یا خزاں، ہر موسم میں دل کو بھاتا ہے۔ یعنی توحیدِ الٰہی زندگی کی ہر حالت میں انسان کو روحانی سکون اور طمانیت عطا کر سکتی ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ہے۔ جس طرح موسیقی کا وجود، سُننے والے پر منحصر ہے ۱۲

(۵) خدا، ربط حادث بالقدیم، وجود، وحدۃ الوجود، روح، زمان و مکان، علم ربطِ عالم با معلوم، روشنی یا نور، ایتھر، بجلی، ربطِ روح با جسم انسانی وغیرہ، یہ سب اسرار کائنات میں داخل ہیں۔ اور صرف وہ شخص ان سے واقف ہو سکتا ہے۔ جو اپنی خودی سے واقف ہو۔ ۱۲

شعر ۷ اگرچہ مسلمانوں کے دل و دماغ میں مختلف اقسام کے بُت پوشیدہ ہیں، اور وہ توحید کی حقیقت سے بیگانہ ہو چکے ہیں۔ لیکن میں تو بہر حال اسلام کا پیغام دنیا کو عموماً، اور مسلمانوں کو خصوصاً سناؤں گا کہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود یا حاکم نہیں ہے۔ چنانچہ اسی مضمون کو بانگِ درا میں یوں ادا کیا ہے ؎

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی، باقی بُتانِ آزری

تن بہ تقدیر

ع۱ قرآن مجید نے مسلمانوں کو ایمان کے ساتھ، عمل صالح، جد و جہد سعیٔ پیہم اور جہاد کا حکم دیا تھا۔ چنانچہ اس تعلیم کی بدولت مسلمان دنیا میں حکمراں بن گئے، لیکن غیر اسلامی تصوّف کے زیر اثر آکر مسلمانوں نے قرآنی تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا۔ اور ترکِ دنیا کا غلط اصول اختیار کر لیا، اور یہ سمجھ لیا کہ اسلام ترکِ دنیا کا حکم دیتا ہے۔ حالانکہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ پہلے دنیا کو فتح کرو، تاکہ اسلامی نظام قائم ہو سکے پھر دنیا اور اُس کی لذات کو اللہ کی خوشنودی کے لیے قربان کر دو۔ چنانچہ فاروق اعظم کی سطوت کے سامنے قیصر و کسریٰ لرزہ براندام تھے لیکن وہ پیوند لگی ہوئی قمیص پہنتے تھے۔ اور چٹائی پر سوتے تھے۔

ع۲ ایک زمانہ تھا، جب مسلمان، اللہ کے لیے زندگی بسر کرتے تھے۔ اور اس کا صلہ انہیں خدا نے یہ دیا تھا کہ ان کے ارادوں میں مشیتِ ایزدی

پوشیدہ تھی، یعنی وہ جس طرف نکل جاتے تھے، تائیدِ ایزدی اُن کے ساتھ ہوتی تھی۔ لیکن جب مسلمانوں نے احکامِ الٰہی سے روگردانی کر لی تو اللہ نے بھی اُن کو بھلا دیا۔ اور آج ان کی حالت یہ ہے کہ عمل صالح سے کنارہ کر کے، تقدیر پر بھروسہ کیے بیٹھے ہیں، حالانکہ خدا کی تقدیر یعنی اس کا قانون یہ ہے کہ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی انسان کو اللہ وہی عطا کرتا ہے، جس کے لیے وہ کوشش کرتا ہے۔

اقبال کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں نے تقدیر کا غلط مفہوم دماغوں میں جاگزیں کر لیا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے۔

معنیٔ تقدیر کم فہمیدۂ
نے خدا را نے خودی را دیدۂ[1]

۳؎ اب وہ اس انقلاب کی وجہ بیان کرتے ہیں کہ ایسا کیوں ہوا؟ یعنی بے عملی جو بہت بُری بات تھی وہ اچھی کیسے ہو گئی؟ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ غلامی ایسی لعنت ہے کہ اس میں قوموں کا ضمیر بدل جاتا ہے۔ یعنی جب کوئی قوم اپنی بداعمالیوں کی بدولت، غلام بن جاتی ہے تو اس کا معیار خیر و شر بھی بدل جاتا ہے۔ وہ اچھی باتوں کو بُری اور بُری باتوں کو اچھی سمجھنے لگتی ہے۔ مسلمانوں کو دیکھ لو جہالت رسوم پرستی، تقلیدِ کور، اسراف، تن آسانی، عیاشی، یہ سب بُری باتیں ہیں۔ لیکن مسلمان ان کو اچھا سمجھتے ہیں۔ علم، محنت ایثار، اتحاد

---

[1] اے مسلمان تو نے تقدیر کا مفہوم ہی نہیں سمجھا، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نہ تجھے اللہ کی معرفت حاصل ہے۔ اور نہ تو اپنی خودی کی حقیقت سے آگاہ ہے ۱۲

کفایت شعاری اور ایمانداری، یہ سب اچھی باتیں ہیں۔ لیکن مسلمان ان سب باتوں سے دور بھاگتے ہیں۔

معراج

۱؎ اگر کسی معمولی مسلمان میں عشقِ رسولؐ کا جذبہ پیدا ہو جائے، تو وہ اس جذبہ کی بدولت دنیا میں انقلاب پیدا کر سکتا ہے۔ اور حیرت انگیز کارنامے انجام دے سکتا ہے۔

۲؎ اے مسلمانو! مانا کہ تم کمزور ہو، لیکن اگر تمہارے سینہ میں عشقِ رسول کا سوز پیدا ہو جائے تو تم باجبروت اور طاقتور دشمن کو مغلوب کر سکتے ہو۔

۳؎ فرماتے ہیں کہ میں نے تو معراجِ نبویؐ کے واقعہ سے یہ سبق اخذ کیا ہے کہ مسلمان، اگر اس میں محبتِ رسول (محبت الٰہی) کا جذبہ کارفرما ہو تو زمین کی کیا حقیقت ہے، وہ عناصر کائنات پر حکمران ہو سکتا ہے۔

۴؎ لیکن اے مسلمان! تیرا مدّوجزر ابھی تک چاند کا محتاج ہے یعنی تو ابھی تک عناصر اربعہ کی قید میں ہے۔ اور زندگی کے ہر شعبہ میں مادّی اسباب کا محتاج ہے۔ تو نے ابھی تک اپنی خودی کو نہیں پہچانا تو نے عشقِ رسولؐ کی بدولت ابھی تک اپنی روحانی قوتوں کو مرتبۂ کمال تک نہیں پہنچایا۔ اس لیے، اگر تیری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس جسم کے ساتھ کس طرح آسمان پر تشریف لے

گئے، تو مجھے اس پر مطلق حیرت نہیں ہے[1]

ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام

یہ نظم اگرچہ علامہ نے ایک فلسفہ زدہ سید زادہ کے خیالات کی اصلاح کے لیے لکھی تھی۔ لیکن اس زمانہ کے بہت سے فلسفہ زدہ مسلمان اس سے سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ "فلسفہ زدہ" اُس شخص کو کہتے ہیں جو وحی کے مقابلہ میں، عقل انسانی کی برتری کا قائل ہو، فرماتے ہیں کہ :-

اے نوجوان! اگر تو اپنے دین (اسلام) سے بیگانگی کے باعث اپنی خودی کو تباہ نہ کر دیتا، تو کبھی حکمائے مغرب کے خیالاتِ باطلہ کا پیرو نہ ہوتا۔

یہاں "خودی" سے اسلامی زندگی مراد ہے۔ اور برگساں سے مغربی حکماء کی جماعت مراد ہے۔ برگساں (HENRY BERGSON) مشہور فرانسیسی فلسفی ہے۔ ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوا۔ اور اس زمانہ میں عقلیت کے خلاف تحریک کا (ANTI RATIONLISTIC) (MOVEMENT) علمبردار ہے۔ اس کے فلسفہ کا خلاصہ یہ ہے کہ عقل (INTELLECT) ادراک حقائق نہیں کر سکتی۔ اس لیے ہمیں وجدان (INTUITION) کو اپنا رہنما بنانا چاہیئے۔ اقبال

[1] سورۂ والنجم، قرآن مجید میں ایک سورۃ ہے جس میں حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معراج کا ذکر کیا گیا ہے، اور اُس کا مطلب (باقی برصفحہ ۴۷)

اور برگساں میں یہی خاص نقطۂ اتصال ہے۔

اے نوجوان میں تجھے آگاہ کرتا ہوں کہ ہیگل[1] (HEGEL) کا فلسفہ، محض لفظوں کا طومار ہے۔ پوست تو ہے مگر مغز نہیں ہے اور اُس نے جو خیالات ظاہر کئے ہیں۔ ان کی حقیقت ایک طلسم سے زیادہ نہیں) اس کا فلسفہ بظاہر بہت عظیم الشان نظر آتا ہے، لیکن جب اس کے خیالات کا تجزیہ کرتے ہیں تو کچھ پلّے نہیں پڑتا۔

ہیگل، برگساں، اور دوسرے فلسفی دور از کار باتیں تو بہت کرتے ہیں، لیکن اس سوال کا اُن کے پاس نہ کوئی جواب ہے نہ حل ہے کہ زندگی کس طرح محکم ہو سکتی ہے۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) اسی وقت سمجھ میں آ سکتا ہے۔ جب انسان اپنی خودی کی معرفت حاصل کر کے عناصرِ کائنات پر حکمراں ہو جائے ۱۲

[1] ہیگل، انیسویں صدی کا نہایت مشہور جرمن فلسفی گذرا ہے۔ ۱۷۷۰ء میں پیدا ہوا۔ ۱۸۳۱ء میں وفات پائی۔ اُس کا فلسفہ ایک خاص قسم کی تصوریت ہے جسے ہیگل کی تصوریت (HEGALIAN IDEALISM) کہتے ہیں۔ اور بعض باتوں میں افلاطون کے فلسفہ سے مشابہ ہے۔ افسوس کہ میں اس شرح میں، برگساں اور ہیگل کے فلسفہ کی تشریح نہیں کر سکتا۔ چند صفحے لکھوں تو اجمال کی وجہ سے ابہام پیدا ہو جائے گا۔ وضاحت کروں تو کتاب اتنی ضخیم ہو جائے گی کہ طلبہ کے لیے خریدنا دشوار ہو جائے گا۔ اس لیے جس طالب علم کو ہیگل یا برگساں کے فلسفہ سے آگاہی مطلوب ہو وہ (WEBER یا TNILLY) کی تاریخ فلسفہ کا مطالعہ کرے۔ ۱۲

مثلاً کانٹ کہتا ہے کہ کائنات کا وجود حقیقی ہے۔ اس کے مقابلہ میں ہیگل کہتا ہے کہ غیر حقیقی ہے۔ یہ اور اسی قسم کے صدہا فلسفیانہ مسائل ذہنی دلچسپی کا سامان تو بہم پہنچا سکتے ہیں۔ لیکن ان مسائل سے حیاتِ انسانی مستحکم نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے اسلام نے ہمیں ان مسائل میں اُلجھانے کے بجائے زندگی کو محکم کرنے کے طریقے بتائے ہیں۔

اقبال کہتے ہیں کہ انسان کو جن مسائل سے فائدہ پہنچ سکتا ہے وہ، وہ نہیں، جن میں فلاسفہ اُلجھے ہوئے ہیں، بلکہ یہ ہیں۔ مثلاً

(ا) زندگی کیسے محکم ہو سکتی ہے؟

(ب) خودی کیسے زمان و مکان کی قیود سے بالاتر ہو سکتی ہے؟

۴ انسان کو جس بات کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ اُسے ثبات کیسے حاصل ہو، نیز وہ زندگی بسر کرنے کا بہترین نظام چاہتا ہے جن مسائل میں حکمار منہمک رہتے ہیں، مثلاً زمانہ موجود ہے یا معدوم ہے؟ یا موہوم ہے؟ اور حقیقی ہے یا غیر حقیقی ہے؟ ان سے ہمارے تمدنی، اقتصادی، معاشی، سیاسی، اور عمرانی مسائل حل نہیں ہو سکتے۔

اس کی مثال یوں سمجھو کہ ایک شخص بھوکا ہے، وہ آپ کے پاس اگر روٹی کا طالب ہوا، آپ نے اُس سے کہا کہ تم تو صرف روٹی کے طالب ہو، میں تم کو یہ بتا سکتا ہوں کہ گیہوں کے عناصرِ ترکیبی کیا ہیں۔ چنانچہ آپ نے پہلے گیہوں کے اجزا کی تشریح کی، پھر علم نباتات پر لکچر دیا، اور اُس کے بعد یہ بتایا کہ روٹی جب معدہ میں جاتی ہے تو اس کا نشاستہ، مٹھاس میں کس طرح تبدیل ہو جاتا ہے۔

اور جگر کیا فعل کرتا ہے۔ پھر اس سے اخلاط اربعہ بنتے ہیں۔ وغیر ذالک۔

تو سوال یہ ہے کہ کیا آپ کی تقریر سے اس کی بھوک کا مسئلہ حل ہو گیا؟ کیا اس کا پیٹ بھر گیا؟ اب پڑھئے اس شعر کو:۔

آدم کو ثبات کی طلب ہے
دستورِ حیات کی طلب ہے

(۵) اے نوجوان! جس بات سے دنیا کی تاریکی دُور ہو سکتی ہے۔ یعنی انسانی مشکلات کا خاتمہ ہو سکتا ہے، وہ فلسفہ نہیں ہے (کہ وہ محض ظن و تخمین کا نام ہے) بلکہ مومن کی اذان یعنی نکتہ توحیدِ الٰہی ہے۔

۶ اب اقبال اُس نوجوان کو بعض حقائق تلقین کرتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں
۷ کہ میں برہمنوں کی اولاد ہوں، میرے آباواجداد کشمیری برہمن تھے۔ اور بُت پرست تھے۔ تو سید زادہ ہے۔ میں برہمن زادہ ہوں، اسلئے
۸ فلسفہ تو میری رگ رگ میں سمایا ہوا ہے، کیونکہ برہمنوں کا مشغلۂ حیات فلسفہ ہی ہے۔

(۹) اگرچہ میں دنیاوی اعتبار سے کوئی عروج حاصل نہ کر سکا، اور دنیا میں ترقی کا فن مجھے نہیں آتا، لیکن فلسفہ سے اچھی طرح واقف ہوں بلکہ دنیا میں آج تک جتنے فلسفیانہ مدارس فکر (VARIOUS SCHOOLS OF PHILOSPHY) قائم ہوئے ہیں۔ سب پر ناقدانہ نظر ڈال چکا ہوں۔

(۱۰) اس لیے میں اپنی ساری عمر کے تجربہ کا خلاصہ تجھ سے بیان کرتا ہوں کہ

(۱۱) "انجام خرد ہے بے حضوری"

یعنی عقل کا منتہیٰ یہ ہے کہ انسان انجام کار، اللہ سے دُور ہو جاتا ہے اور الحاد اور انکار میں نہیں تو تشکیک میں تو ضرور مبتلا ہو جاتا ہے اور آدمی کتنا ہی بڑا فلسفی کیوں نہ ہو، محض فلسفہ سے زندگی کے پیچیدہ مسائل حل نہیں کر سکتا۔ "زندگی سے دوری" کے معنی یہ ہیں کہ فلسفی یہ تو بتا سکتا ہے کہ علم اور عالم اور معلوم میں کیا نسبت ہے۔ یا علم، حاضر عند المدرک کو کہتے ہیں یا مابہ الانکشاف کو؟ لیکن وہ زندگی کے سیاسی معاشی معاشرتی اور تمدنی مسائل کا حل نہیں کر سکتا۔

(۱۲) نیز فلسفہ میں انہماک، انسان کی قوتِ عمل کو مردہ کر دیتا ہے۔ اور فلسفی آدمی، حجرہ میں بیٹھ کر غور و فکر تو کر سکتا ہے، لیکن نہ تزکیہ نفس کر سکتا ہے، نہ اس میں جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ پیدا ہو سکتا ہے۔

(۱۳) لیکن فلسفہ کے بالمقابل، دین ایک حقیقتِ ثابتہ ہے، دین یعنی اسلام فلسفہ کی طرح چند نظریات یا قیاسات یا ظن و تخمین کا نام نہیں بلکہ وہ مسلک زندگی کی تقویم ہے۔ یعنی زندگی بسر کرنے کا دستور العمل ہے۔ اور حیاتِ انسانی کے لیے مکمل ضابطہ ہے۔

دین اسلام تو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اقدس سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے روحانی کمالات کا آئینہ ہے۔ اس دین میں ان قدسی نفوس کی عظمت پوشیدہ ہے۔ اگر کسی کو مثلاً آنحضرتؐ کے مقام سے آگاہی مقصود ہو تو دین اسلام اور اُس کے اصُول و فروع کا

مطالعہ کرے یا کم از کم بخاری شریف یا مُسلم شریف، یا ترمذی شریف ہی غور سے پڑھ لے۔

(۱۴) پس اے مسلمان نوجوان! ہیگلؔ اور برگساںؔ، یعنی فلسفۂ مغرب سے قطع تعلق کر کے، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاداتِ گرامی یعنی حدیث شریف کا مطالعہ کر۔ یہ مت دیکھ کہ حکمائے مغرب کیا کہتے ہیں، کیونکہ وہ خود اندھے ہیں۔ اور اندھا دوسروں کو راستہ نہیں دکھا سکتا۔ بلکہ یہ دیکھ کہ فلاں مسئلہ میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کیا فرماتے ہیں۔ اے علی کے بیٹے، تو بو علی سینا کے فلسفہ کا کب تک اتباع کرتا رہے گا۔

نوٹ:۔ پورِ علی اور بو علی میں بہت عمدہ شاعرانہ لطفِ بیان ہے۔ ان لفظوں کے لفظی معنی بھی ہو سکتے ہیں۔ اور مرادی معنیٰ بھی لفظی معنی تو علی کا بیٹا اور علی کا باپ، لیکن مراد ہے وہ سیدزادہ اور مشہور فلسفی بو علی سینا۔

آخرؔ میں علامہ اس نوجوان کے واسطہ سے مسلمان نوجوان کو نصیحت کرتے ہیں کہ

اگر "دیدۂ راہ بیں" حاصل نہ ہو، یعنی اگر تمہیں اسلامی علوم سے آگاہی نہ ہو تو پھر تمہارے لیے محفوظ راستہ یہ ہے کہ تم بخاریؔ کے بجائے قرشیؔ کو اپنا رہنما بناؤ۔

بخاری کے پہلے اور لغوی معنی ہیں بخارا کا رہنے والا۔ مرادی معنی ہیں، ابو علی ابن سینا، کیونکہ وہ مدتوں امیر بخارا کا طبیب رہا۔ قرشی کے لغوی معنی ہیں، قبیلہ قریش سے تعلق رکھنے والا، مرادی معنی ہیں،

دین اسلام کا جاننے والا۔

یہ بڑی سبق آموز نظم ہے۔ اور اس میں اقبالؔ نے دینؔ اور فلسفہ دونوں کا بہت عمدگی کے ساتھ موازنہ کیا ہے۔ اور اس ضمن میں اپنا زاویۂ نگاہ بھی واضح کر دیا ہے۔ یعنی اقبال فہمی کے لیے یہ نظم بہت مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ اس لیے اس کا مطالعہ بہت غور کے ساتھ کرنا چاہیے۔

زمین و آسماں

دُنیا میں انسانوں کے زاویائے نگاہ باہم مختلف ہوتے ہیں: زیدؔ کی نظر میں جو چیز مفید اور اچھی ہے۔ بکرؔ کی نگاہ میں وہی چیز مضر اور بُری ہے۔ علاوہ بریں جو شئے زیدؔ کے لیے مضر ہے۔ عین ممکن ہے کہ وہی شئے بکرؔ کے لیے مفید ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ حالات کے بدلنے سے انسان کا زاویۂ نگاہ بدل جاتا ہے۔ اور زاویۂ نگاہ کے بدل جانے سے حالات بدل جاتے ہیں

---

۵ ابو علی سینا، دسویں صدی عیسوی میں دنیائے اسلام کا نامور حکیم اور فلسفی گزرا ہے۔ منطق فلسفہ اور طب میں یدِ طولیٰ رکھتا تھا۔ اس نے ارسطو کے فلسفہ کی شرح لکھی ہے اس کی دو کتابیں بہت مشہور ہیں۔ اشارات اور شفاء محقق طوسی نے اشارات کی شرح لکھی ہے اور یہ کتاب عام طور پر ہمارے عربی مدارس میں پڑھائی جاتی ہے ۱۲

لہٰذا جو بات آج موجب نقصان نظر آتی ہے وہی بات کل باعثِ نفع بن جاتی ہے۔ مثلاً ایک آدمی کے مکان میں نیم کا پیڑ کھڑا ہے۔ وہ اُسے بہت بُرا سمجھتا ہے کیونکہ پتے بھی گرتے ہیں اور نمکولیاں بھی، اور دھوپ بھی نہیں آتی۔ وہ شخص اس درخت کو کٹوانے کی فکر میں ہے قضارا وہ مرضِ سودا میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور طبیب اُسے نیم کی چھال اور نمکولیوں کا مغز استعمال کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔ تو وہی درخت جو کل تک بُرا تھا آج بیحد مفید بن جاتا ہے۔

بس اسی طرح یہ سمجھو کہ تم آسمان کو اونچا سمجھتے ہو۔ ممکن ہے اس کے اوپر کوئی اور عالم ہو۔ اور یہ آسمان اُس عالم کے لیے بمنزلۂ زمین ہو۔ یعنی جسے تم اونچا سمجھتے ہو۔ بالائے آسمان رہنے والے اُسی کو نیچا سمجھتے ہیں۔

---

۱ گول زرد رنگ کا پھل، جو نیم میں لگتا ہے ۱۲۔

مُسلمان کا زوال

نظم کا خلاصہ یہ ہے کہ اقبالؔ کی رائے میں مُسلمان کے زوال کا باعث یہ نہیں کہ وہ بے زر ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ اُس میں شانِ فقر نہیں پائی جاتی۔

خودی کی طرح اقبالؔ نے فقر کو بھی بڑی اہمیّت دی ہے۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ خودی کی تربیت اور اس کا مرتبۂ کمال تک پہنچنا، سب کچھ فقر پر منحصر ہے۔ اس لیے مختصر طور پر فقر کو بھی سمجھ لینا چاہیئے۔

فقر کے ایک معنی تو مفلسی کے ہیں۔ مثلاً کَادَ الْفَقْرُ اَنْ یَّکُوْنَ کُفْرًا قریب ہے کہ مفلسی انسان کو کافر بنا دے۔ یعنی مفلسی انسان کو کفر کے قریب پہنچا دیتی ہے۔

فقر کے دوسرے معنی ہیں صرف اللہ پر بھروسہ کرنا اور دُنیا سے بے نیاز ہو کر، اپنی تمام حاجات، اللہ کی درگاہ میں پیش کرنا۔ یہ وہ صورت ہے کہ مردِ مومن پہلے دنیا کو فتح کرتا ہے۔ پھر اللہ کے لیے اس دُنیا اور اس کی دلفریبی اور لذّت پر لات مارتا ہے۔ اگرچہ رُومؔ اور شامؔ عراقؔ اور ایرانؔ اُس کے باجگذار ہوتے ہیں۔ لیکن وہ بوریئے پر سوتا ہے اور پیوند لگا ہوا کرتا پہنتا ہے۔

(دوسری مثال) سارا عرب اس کے زیرِ نگیں ہوتا ہے۔ لیکن ایک ایک مہینہ تک اُس کے چولھے میں آگ نہیں جلتی۔ اور جس کمرے میں وہ (صلی اللہ علیہ وسلم) رہتا ہے، اُس میں ایک چارپائی، ایک بوریا اور ایک پانی کے گھڑے کے علاوہ اور کوئی سامان نہیں ہوتا۔

چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ "اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ" میں اپنی شان فقر پر فخر کرتا ہوں۔ یا فقر، میرے لیے باعثِ فخر ہے۔

یعنی جس طرح دُنیا کے بادشاہ اپنی دولت، فوج اور طاقت پر فخر کرتے ہیں، میں فقر پر فخر کرتا ہوں کہ دُنیا میں کسی کا محتاج نہیں ہوں۔ صرف اللہ کا محتاج ہوں۔

فقر، اقبال کی اصطلاح بھی ہے۔ اور مجھے افسوس ہے کہ میں اس جگہ اس کی پوری تشریح نہیں کر سکتا۔ کیونکہ میں نے اس کی تشریح میں دو سو صفحے کی کتاب انگریزی میں لکھی ہے۔ جو ابھی تک طبع نہیں ہوئی بس دو لفظوں میں اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ فقر کے تیسرے معنی یعنی اقبالی معنی روحِ اسلام کے ہیں، اور یہی وہ جوہر ہے جس کی بدولت خودی مرتبۂ کمال تک پہنچتی ہے۔

اب اقبال کی زبان سے اس کی تشریح سنو!

اقبال کہتے ہیں کہ

فقرِ قرآں اختلاطِ ذکر و فکر
فکر را کامل ندیدم جز بہ ذکر

یعنی فقر دو چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے ذکر اور فکر

ذکر کے معنی ہیں یاد کرنا، یاد رکھنا، دھیان رکھنا، ہر گھڑی مدِ نظر رکھنا، محبّت کرنا، اطاعت کرنا، تعمیل احکام کرنا، فرمانبرداری۔ اور فکر کے معنی ہیں تدبر کرنا۔ غور کرنا، تعقل کرنا، تفقہ کرنا، غور و خوض کرنا، استدلال استنباط اور استخراج کرنا اور ادراکِ حقائق کرنا، اور جزئیات سے کلیات بنانا۔

یہ دو لفظ اس آیت سے ماخوذ ہیں :-

اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِہِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا	صاحبان عقل وہ لوگ ہیں، جو کھڑے بیٹھے اور لیٹے یعنی ہر حالت میں اور ہر وقت اللہ کو یاد کرتے ہیں، یعنی ہر حال میں اُس کی اطاعت کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور و فکر کرتے ہیں اور اس غور و فکر کی بنا پر وہ بے اختیار یہ کہہ اُٹھتے ہیں کہ اے ہمارے رب! تو نے اس کائنات کو بلا مقصد پیدا نہیں کیا ہے ۱۲
(سورۂ آل عمران آیت ۱۹۱)	

اقبال کہتے ہیں کہ ایک فقر تو وہ ہے جس کی تلقین دنیا کے اکثر مذاہب کرتے ہیں، یعنی رہبانیت یا ترکِ دنیا۔ لیکن اسلام جس فقر کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ رہبانیت نہیں، بلکہ وہ ذکر اور فکر کے امتزاج کا نام ہے یعنی مومن اللہ سے محبت کرتا ہے۔ اور بوجہ محبت اُس کے احکام کی اطاعت کرتا ہے۔ اور ساتھ ساتھ اپنی عقل خداداد سے کام لے کر کائنات میں غور و فکر کرتا ہے، اور تحقیق سے کام لے کر عناصر پر حکمرانی کرتا ہے۔ یعنی فقر کا مفہوم ہے اللہ کی اطاعت اور کائنات پر حکومت میں نے خودی کی طرح فقر کا مفہوم بھی قدرے وضاحت کے ساتھ لکھ دیا ہے۔ کیونکہ اقبال کے کلام میں خودی اور فقر یہ دو اصطلاحیں اکثر استعمال ہوئی ہیں۔

یہی وہ فقر ہے جس کی بدولت خودی مرتبۂ کمال کو پہنچتی ہے۔ چنانچہ اقبال خود لکھتے ہیں ؎

چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغِ خودی!
ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کارِ سپاہ!

اس جگہ ایک نکتہ اور بھی واضح کر دوں۔ ابتدا میں ہم لکھ چکے ہیں کہ

خودی ہے تیغ، فساں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

یعنی خودی کو اگر تلوار فرض کیا جائے تو توحید بمنزلہ فساں یعنی سان ہے یہاں اُنھوں نے کہا ہے کہ

چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغِ خودی

یعنی خودی تیغ ہے، فقر سان ہے۔

پس ثابت ہوا کہ توحید اور فقر ہم معنیٰ ہیں۔ کیونکہ خودی کے حق میں دونوں کا اثر یکساں ہے۔ توحید بھی سان ہے اور فقر بھی۔

بات یہ ہے کہ غور سے دیکھو تو جب تک آدمی صحیح معنوں میں موحِد نہ ہو، اُس میں شانِ فقر پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔ یعنی دراصل، موحِد اور فقیر مرادف الفاظ ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ جب کسی مسلمان میں شانِ فقر پیدا ہو جاتی ہے، تب وہ موحِدِ کامل بنتا ہے۔

اب نظم کا مطلب بیان کرتا ہوں۔ اور اُمید ہے کہ بآسانی سمجھ میں آ جائے گا۔

(۱) اگرچہ دولت بھی اس دُنیا میں ہماری ضرورتوں کو پورا کر سکتی ہے۔ لیکن جو عزت اور وجاہت، ایک انسان کو شانِ فقر سے حاصل ہو سکتی ہے وہ دولت سے حاصل نہیں ہو سکتی۔

(۲) اگر مسلمان نوجوان اپنے اندر بہادری اور غیرت کا جذبہ پیدا کر لیں تو قوم مفلسی کے باوجود دنیا میں سکندری یعنی حکمرانی کر سکتی ہے۔ حکومت

کے لیے دراصل دولت اور کثرتِ افراد درکار نہیں، بلکہ جسارت حوصلہ، بے جگری، اور غیرتِ دینی درکار ہے۔ یعنی دین پر مر مٹنے کا جذبہ۔

(۳) اگر دنیا میں مسلمانوں کا زوال ہوا تو وہ بے زری سے نہیں ہوا بلکہ اس کا سبب کچھ اور ہے، جس کو تو خود سمجھتا ہے یعنی بے غیرتی[1] اسی خیال کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے:-

تا کجا بے غیرتِ دیں زیستن
اے مسلمان مردن است ایں زیستن!

(۴) اگر دنیا میں میری عزت ہوئی، یا میرا جوہر نمایاں ہوا، تو یہ شرف مجھے تونگری سے حاصل نہیں ہوا، کیونکہ دولت میرے پاس ہے ہی نہیں، بلکہ یہ عزت مجھے قلندری سے حاصل ہوئی ہے۔

واضح ہو کہ اقبال نے قلندری کو فقر کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔

---

[1] موجودہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی دینی بے غیرتی کی بہترین مثال ہے۔ جس کی تشریح بالکل لاحاصل ہے۔ کیونکہ وہ تو اظہر من الشمس ہے ۱۲

علم و عشق

خودی اور فقر کی طرح عشق بھی اقبال کی خاص اصطلاحوں میں سے ہے اور اُنھوں نے اس کی توصیف میں ہر کتاب میں متعدد اشعار لکھے ہیں۔ مولانا رومؒ کی طرح اقبال بھی عشق کے بہت مداح ہیں۔ اور اس کو علم یا عقل پر فضیلت دیتے ہیں۔

اقبال کی رائے میں عشق، انسانی زندگی میں سب سے بڑی قوتِ محرکہ ہے۔ اور اس کی بدولت انسان محیر العقول کارنامے انجام دے سکتا ہے خودی کی پرورش اور تربیت محض عشق پر موقوف ہے۔ بالِ جبریل سے صرف ایک شعر نقل کرتا ہوں، جس سے عشق کا مقام واضح ہو سکتا ہے ؎

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

عشق سے اقبال کی مراد، دراصل عشقِ رسولؐ ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ جب تک کسی فرد یا جماعت کو کسی ذات یا کسی شئے سے عشق نہ ہو، وہ ترقی نہیں کر سکتی۔ اور جب کسی فرد یا قوم میں یہ جذبہ پیدا ہو جاتا ہے، یعنی کسی نصب العین کے حصول کا سودا سر میں سما جاتا ہے تو وہ قوم ناممکن کو ممکن بنا کر دکھا دیتی ہے۔ جب تک کسی کو کسی سے عشق نہ ہو، وہ شخص سرگرم عمل نہیں ہو سکتا۔ فرہاد نے پہاڑ کاٹ کر رکھ دیا، یہ کس قدر ناممکن کام تھا، جو اُس نے کر دکھایا۔ محض اس لیے کہ ایک شخص (شیریں)

کے عشق نے اس میں یہ طاقت پیدا کر دی تھی۔

اس مقصد کے حصول کے لیے اقبالؔ نے اپنی قوم کو عشقِ رسولؐ کا سبق دیا۔ اور کلامِ اقبالؔ شاہد ہے کہ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۳۸ء تک وہ اسی سبق کو مختلف طریقوں سے پڑھاتے رہے۔ اور اُن کے کلام میں جو تاثیر پیدا ہوئی وہ اسی جذبہ کا نتیجہ تھی۔

اقبال کہتے ہیں کہ انسان میں دو قوتیں ہیں۔ علمؔ اور عشقؔ، یہ دونوں ضروری ہیں۔ لیکن عشق کو علم پر تفوق حاصل ہے۔ اور اس نظم میں انہوں نے اسی نکتہ کو بڑے دلپذیر انداز میں بیان کیا ہے۔

(۱) اربابِ علم کہتے ہیں کہ اصحابِ عشق، دیوانے ہوتے ہیں۔ یعنی ایسی باتیں کرتے ہیں جو عقل کے خلاف ہوتی ہیں۔ اس کے جواب میں: اصحابِ عشق کہتے ہیں کہ علمار یعنی حکمار و فلاسفہ ساری عمر قیاس اور گمان کی وادیوں میں سرگرداں رہتے ہیں۔ اقبال عشاق کے ہمنوا ہوکر، عقلا سے کہتے ہیں کہ اگر تم حقیقت سے آشنا ہونا چاہتے ہو تو کتابوں کے کیڑے مت بنو۔ کیونکہ معرفت کتابوں سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ مثلاً کوئی فلسفی آج تک یہ نہ بتا سکا، اور نہ بتا سکتا ہے کہ خدا کیا ہے؟ انسان کیا ہے؟ یہ کائنات کیسے پیدا ہوئی؟ روح کیا ہے۔ اور خدا، روح اور کائنات میں رشتہ کیا ہے؟ مختصر یہ کہ علم تو حجابات پیدا کرتا ہے۔ اگر ایک سوال کا جواب دیتا ہے تو اس جواب سے دس مزید سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً کوئی منطقی آج تک یہ نہ بتا سکا کہ علمؔ کی ماہیت کیا ہے اور عالمؔ کو علم کیسے حاصل ہوتا ہے[1]

[1] اس ایک مسئلہ پر مناطقہ میں چودہ مختلف مذاہب پیدا ہوگئے (باقی صـ۶۱ پر)

ہاں عشق سے تمام حجابات دُور ہو جاتے ہیں۔ اور حقیقت تک رسائی ہو جاتی ہے۔ یعنی اپنی معرفت علم سے حاصل نہیں ہو سکتی، عشق سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اِسی لیے اس کا مرتبہ، عقل سے بلند تر ہے۔

(۲) علم سے ہم کو اشیار کی صفات کا علم حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن ذاتِ شئے کا علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ (بقول کانٹ (KANT) عقل کی مدد سے ہم صرف مظاہر[2] کو جان سکتے ہیں حقائق تک رسائی نہیں ہو سکتی۔)

لیکن عشق کی بدولت انسان، صفات کے درجہ سے آگے بڑھ کر ذات کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔ مثلاً روح کے آثار و مظاہر کو دیکھ کر ایک منطقی روح کے متعلق کچھ قیاسات پیش کر سکتا ہے، لیکن روح کی حقیقت کیا ہے، یہ صرف ایک عاشق ہی سمجھ سکتا ہے۔

واضح ہو کہ عاشق سے یہاں اقبال کی مراد فرہادؔ یا قیسؔ کی قسم کے عاشق نہیں ہیں۔ بلکہ عاشق سے مراد ہے وہ شخص جو اللہ کے عشق میں سرشار ہو، اور کسی مرشدِ کامل کی صحبت میں بیٹھ کر اُس نے تزکیہ و تصفیۂ نفس کر لیا ہو۔ مثلاً حضرت صدیق اکبرؓ، حضرت فاروق اعظمؓ، حضرت مولانا رومؒ، حضرت خواجہ معین الدین اجمیریؒ، حضرت مجدد الف ثانیؒ، حضرت

(بقیہ صـ۶۰) اور عقل آج تک یہ فیصلہ نہ کر سکی کہ ان میں کون حق پر ہے۔ افسوس کہ اس شرح میں اُن مذاہب کی تفصیل نہیں لکھ سکتا۔ ۱۲

[2] کانٹ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "تنقیدِ عقل خالص" میں اس مسئلہ کو بڑی شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا ہے۔ انگریزی میں مظاہر کے لیے PHENOMENA اور حقائق کے لیے NOUMENA کی اصطلاحیں مستعمل ہیں ۱۲

مجدد دہلوی رح۔

الغرض عشق کی بدولت یہ کائنات زندہ ہے، اور اس میں جو عمل ارتقاء نظر آتا ہے، سب عشق کا کرشمہ ہے۔ عشق سے قلب کو اطمینان اور روح کو ثبات حاصل ہوتا ہے۔ علم تو شکوک اور شبہات پیدا کرتا رہتا ہے اِن کا صحیح جواب صرف عشق سے حاصل ہو سکتا ہے۔

(۳) سلطنت، حکومت، فقر، اور دین، یہ سب عشق ہی کے معجزات یعنی کارنامے ہیں۔ اور بڑے بڑے بادشاہ، اربابِ عشق کے سامنے غلاموں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ دُور کیوں جایئے، ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ کر لیجئے۔ سلطان شمس الدین ایلتتمش، حضرت قطب الاقطاب وحید العصر فرید الدہر، حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رح کے سامنے بڑے ادب کے ساتھ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوتا تھا۔

اسی طرح سلطان علاؤالدین خلجی اس آرزو میں رہا کہ حضرت محبوب الٰہی سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء کبھی اس کے دربار میں تشریف لائیں یا اُسی کو حاضری کی اجازت دیں۔ لیکن اس کی یہ آرزو پوری کبھی نہ ہو سکی۔ اسی لیے اقبال نے یہ لکھا ہے ؎

پادشاہاں در قبا ہائے حریر
زرد رو از سہم آں عُریاں فقیر

الغرض عشق اس کائنات میں سب سے بڑی طاقت ہے۔ عاشق عناصر پر حکمراں ہوتا ہے۔ زمان و زمین، مکان و مکیں سب عشق ہی کی بدولت اپنی اپنی جگہ قائم ہیں۔ عشق سے ظن و تخمین کا ازالہ ہو جاتا ہے، اور یقین پیدا ہو جاتا ہے۔ اور یقین سے انسان کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔ خواہ

وہ دینی ہو یا دنیاوی۔ چنانچہ اقبال لکھتے ہیں ؎

یقین پیدا کر اے غافل، یقین سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

(۴) علم یا عقل کا تقاضہ یہ ہے کہ آدمی دنیا میں عیش و عشرت کے سامان مہیا کرے۔ لیکن عشق یا محبت کی شریعت (قانون) میں یہ بات حرام ہے۔ عقل کی نظر میں انسان کو طوفان سے بچنا چاہیئے۔ اور ساحل یعنی عافیت اختیار کرنی چاہیئے۔ لیکن اس کے برعکس محبت کی شریعت میں لذتِ ساحل (عافیت کی زندگی) حرام ہے۔ یعنی عشق آدمی کو عقل کے خلاف راستوں پر چلاتا ہے۔ چنانچہ بانگِ درا میں اقبال کہتے ہیں ؎

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

الغرض عشق کا قانون یا طریقہ عقل کے ضابطہ یا دستور کے بالکل خلاف ہے۔ مثلاً عقل کہتی ہے کہ کھیتی کر کے خرمن جمع کرو اور اُس سے فائدہ اُٹھاؤ۔ لیکن عشق کہتا ہے کہ زندگی کی اعلیٰ اقدار کے لیے، ادنیٰ چیزوں مثلاً مال و دولت، گھر بار سب کو قربان کر دو۔ [1]

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ عقل، کتابوں کا نتیجہ ہے، یا کتابوں سے پیدا ہوتی ہے۔ اور عشق، خود کتابوں کی ماں ہے۔ یعنی کتابی علوم اس کا

---

[1] چنانچہ صدیقِ اکبر رض نے دو مرتبہ اپنا سارا گھر بار اور کل اثاثۂ حیات، اللہ کی راہ میں قربان کر دیا جب ہی تو صدیقِ اکبر رض کا لقب پایا۔ جس پر ساری کائنات کو رشک آیا۔ ۱۲

نتیجہ ہیں۔

نوٹ:۔ اگرچہ میں حتی الوسع اقبال کے مفہوم کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہوں، لیکن اُن کی بعض تراکیب اس قدر جامع اور بلیغ ہوتی ہیں کہ جب تک صفحے سیاہ نہ کئے جائیں، مطلب واضح نہیں ہوتا بمثال کے طور پر اس نظم کے آخری مصرع پر غور کیجیے۔ جو لُطف اس میں ہے کہ

علم ہے ابن الکتاب، عشق ہے اُمّ الکتاب

وہ اس کی شرح سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ "اُمّ الکتاب"، کی ترکیب میں قرآن مجید کی طرف بھی اشارہ ہے۔ کیونکہ قرآن مجید کو اُمّ الکتاب کہتے ہیں۔ یہاں اقبال نے اس ترکیب سے اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ عشق اُمّ الکتاب ہے۔ یعنی عاشق (مومن) حکماء کی کتابوں سے بے نیاز ہوتا ہے۔ کیونکہ عشق اُس کو قرآن حکیم کی روح سے آشنا کر دیتا ہے۔ اور یہ کلامِ ربانی خود جملہ علوم سکھا دیتا ہے۔ چنانچہ مولانا روم رح نے اسی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے۔

بینی اندر خود علومِ انبیاء
بے کتاب و بے معین و اوستا

یعنی جو شخص اللہ کی محبت اختیار کر لیتا ہے، اُس کو تمام علوم آسمانی بغیر کسی کتاب یا اوستاد کی مدد کے حاصل ہو جاتے ہیں۔

ایک اور مخفی مفہوم بھی اس ترکیب سے سمجھ میں آ سکتا ہے۔ وہ یہ کہ خدا سے محبت کا طریقہ، اُمّ الکتاب سے حاصل ہوتا ہے۔ یعنی قرآن مجید انسان کو اللہ سے محبت کرنا سکھا سکتا ہے۔

غرض عالم، کتابوں کا محتاج ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کا دل بیدار نہیں ہوتا۔ لیکن عاشق کتابوں کا محتاج نہیں ہوتا، کیونکہ اُس کو سرچشمۂ علم یعنی قرآن مجید سے نسبت قلبی حاصل ہوتی ہے۔ اور یہ نسبت اس کے قلب کو بیدار کر دیتی ہے۔ اور جملہ علوم سے آگاہ ہو جاتا ہے۔

اجتہاد

اس نظم میں اقبال نے، ہندی مسلمانوں کے دینی ذوق کے فقدان پر ماتم کیا ہے:۔ کہتے ہیں کہ مسلمانوں میں طلبِ علم، تحقیق اور ریسرچ کا مذاق بالکل نہیں رہا۔ حالت یہ ہو گئی ہے۔ کہ جو لوگ:۔

(۱) دینی علوم پڑھتے ہیں، وہ صرف درسی کتابوں کے مطالعہ کو کافی سمجھتے ہیں۔ دین اسلام میں جو حکمت ہے، شریعت میں جو نکات اور اسرار مخفی ہیں، اُن کی تحقیق کا کسی میں ذوق نہیں ہے۔ نہ کہیں عمل کی طرف رغبت نظر آتی ہے۔ نہ علماء میں غور و فکر کا مادّہ دکھائی دیتا ہے۔

(۲) اب رہے صوفی (حلقۂ شوق) تو ان میں بھی جرأتِ غور و خوض نہیں ہے۔ افسوس یہ سب غلامی اور کورانہ تقلید اور ذوقِ تحقیق کے زوال کا نتیجہ ہے۔

(۳) اور جو لوگ، علم دین پڑھتے ہیں، اُن کی حالت یہ ہو گئی ہے کہ وہ اپنے آپ کو تو دین کے سانچے میں ڈھالتے نہیں، بلکہ دین کو اپنے

خیالات کے تابع بناتے رہتے ہیں۔

(۴) غلامی نے ان کی فطرت اس درجہ مسخ کر دی ہے۔ کہ کتاب اللہ سے کفار کی غلامی کے جواز کی دلیلیں "تلاش کرتے ہیں، گویا ان کے اِس طرزِ عمل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی رائے میں کتاب اللہ ناقص ہے، کیونکہ وہ مومنوں کو غلامی کا طریقہ نہیں سکھاتی۔ اس شعر میں ان دنیا پرست علماء کی طرف اشارہ ہے۔ جنہوں نے انگریزوں اور دوسرے کافروں کی حکومت کو قرآن اور حدیث کی رو سے مسلمانوں کے لیے رحمت قرار دیا۔ اور مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا کہ اِن دشمنانِ دین کی حمایت کریں۔

شکر و شکایت

اس نظم میں اقبال نے اللہ کی بارگاہ میں اپنے دردِ دل کا اظہار کیا ہے کہتے ہیں:۔

(۱) کہ اے مولا! اگرچہ میں ایک بندۂ ناداں ہوں، لیکن تیرا شکر ادا کرتا ہوں کہ تو نے اپنی محبت مجھے عطا فرمائی ہے اور میری روح کو عالمِ بالا سے وابستہ کر دیا ہے۔ اور اسی لیے میرے دل میں مذہب و ملّت کی خدمت کا جذبہ موجزن ہے۔

(۲) چنانچہ اسی جذبہ کی بدولت میں نے مسلمانوں کو قرآن مجید کا پیغا
سُنایا۔ اور اُن کے دلوں میں اسلام کو دُنیا میں سر بلند کرنے کا ولو

پیدا کر دیا۔

(۳) اِسی جذبہ کا یہ نتیجہ ہے کہ اس دَورِ مادیت میں، جو لوگ دین سے کچھ بھی نسبت رکھتے تھے، وہ میرے کلام کو ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔

(۴) لیکن بڑے رنج کے ساتھ میں یہ بات تیری جناب میں عرض کرتا ہوں کہ تو نے مجھے ایسے ملک میں پیدا کیا ہے، جس ملک کے لوگ نمازیں بھی پڑھتے ہیں، روزے بھی رکھتے ہیں۔ لیکن انگریز کی غلامی پر راضی ہیں۔ تعجب ہے کہ وہ کلمہ تو تیرا پڑھتے ہیں لیکن اطاعت انگریز کی کرتے ہیں۔

واضح ہو کہ یہ نظم، دراصل ایک لطیف شاعرانہ اندازِ بیان کی حامل ہے۔ دراصل اقبال اپنی قوم سے یہ کہنا چاہتے ہیں، کہ جو مسلمان کافر کی غلامی پر رضا مند ہو اور اس غلامی سے رہائی کی کوشش نہ کرے وہ مسلمان ہی نہیں، کیونکہ اللہ کا بندہ، انگریز کا بندہ کیسے ہو سکتا ہے۔

یا بندۂ خدا بن یا بندۂ زمانہ[۵]

---

[۵] سلطان ٹیپو شہید رح نے اسی اصول پر عمل کیا اور حیاتِ جاوید حاصل کر لی۔ اور نظام علی خاں آف حیدر آباد نے انگریزوں کی حمایت کر کے ابدی لعنت خرید لی۔ ۱۲

ذکر و فکر

(پہلی):

ذکر و فکر کے معنی ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں۔ اقبال اس نظم میں ان کے مفہوم کو اپنے خاص انداز میں بیان کرتے ہیں۔ کہتے ہیں۔ کہ:-

ذکر و فکر، در اصل اُس سالک یا مومن کی روحانی ترقی کی منزلیں ہیں جس کی شان میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:- وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا، اور اللہ نے آدم کو سب چیزوں کے نام سکھا دیے۔ (البقرہ ع ۴)

یعنی اللہ نے حضرت آدم کی فطرت میں جستجو اور تحقیق کا مادّہ ودیعت فرما دیا۔

مقام ذکر کیا ہے؟ اس کا جواب اقبال نے کس قدر دلپذیر انداز میں دیا ہے! کہتے ہیں کہ

جب مومن مقام ذکر پہ فائز ہوتا ہے تو رومیؒ اور عطارؒ بن جاتا ہے۔ یعنی روحانیت میں بلند مرتبہ حاصل کر لیتا ہے۔ اور جب آدمی مقامِ فکر تک پہنچ جاتا ہے تو ابو علی سینا بن جاتا ہے۔

مقالات بو علی سینا سے مراد، اس کی فلسفیانہ تصانیف ہیں۔ جن کا ذکر گذر چکا ہے۔ رومیؒ سے مراد اقبال کے روحانی مرشد حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ ہیں، جن کی مثنوی حقائق و معارف کا ایک زبردست خزانہ ہے۔ چنانچہ علامہ نے مجھ سے ایک مرتبہ کہا تھا کہ "اگرچہ میں نے یورپ کا سارا فلسفہ پڑھا ہے، لیکن در اصل فائدہ مجھ کو دو ہی کتابوں

سے ہوا- ایک قرآن مجید، دوسری مثنوی۔"

عطارؒ سے، حضرت شیخ فرید الدین عطار مراد ہیں، جن کی مثنوی "منطق الطیر" بہت مشہور ہوئی۔ یہ اسلامی تصوف کے بہت بڑے ماہر ہیں۔ چنانچہ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں ؎

عطار روح بود و سنائی دو چشم او
ما از پے سنائی و عطار آمدیم

اقبال نے ان تینوں بزرگوں کی تصانیف سے استفادہ کیا تھا۔ اور یہی وجہ ہے اُن کے کلام میں جا بجا تصوف کا رنگ جھلکتا ہے۔ اور بالِ جبریل میں تو یہ رنگ بہت نمایاں ہے۔

تیسرے شعر میں اقبالؒ نے بلاغت کلام کا اعجاز دکھایا ہے کہتے ہیں کہ قوتِ فکر کا ثمرہ یہ ہے کہ انسان، زمان اور مکان کی ماہیت دریافت کرتا ہے۔ یعنی اہم فلسفیانہ مسائل میں غور کرتا ہے۔ اور قوتِ ذکر کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان، اپنے خالق کے سامنے سر بسجود ہو کر اس کی پاکی بیان کرتا ہے۔

"سبحان ربی الاعلیٰ" یعنی جب مسلمان سجدہ کرتا ہے تو کہتا ہے کہ میرا رب تمام عیوب اور نقائص سے پاک ہے اور سب سے اونچا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ ذکر اور فکر انسان کی دو بنیادی قوتوں (FACULTIES) کا نام ہے۔ جب وہ ذکر میں ترقی کرتا ہے تو رومی اور عطار کی صف میں جگہ پاتا ہے اور جب وہ فکر میں ترقی کرتا ہے تو فارابی اور بو علی سینا کے زمرہ میں شامل ہو جاتا ہے۔ اور اسلام

ایسا دین ہے جو ان دونوں قوتوں کا جامع ہے۔

مُلّائے حرم

(دوسری)

یہ اُن کم سواد مُلاؤں سے خطاب ہے، جو علم دین حاصل کئے بغیر مسلمانوں کی رہنمائی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اور مسجدوں میں امامت کر کے اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔

پہلے مصرع میں نہایت لطیف طنز ہے۔ جو لفظوں میں ادا نہیں ہو سکتا۔ فرماتے ہیں۔

(۱) بہت ممکن ہے تو خدا تک پہنچ گیا ہو، یعنی تو نے بہت سے روحانی مدارج حاصل کر لئے ہوں، لیکن یہ یقینی بات ہے کہ تو ابھی تک آدمیت کے مقام پر نہیں پہنچا۔ یعنی تجھے یہ معلوم نہیں کہ انسان کس حد تک ترقی کر سکتا ہے۔

(۲) یہی وجہ ہے کہ تیری نمازیں بالکل جسدِ بے روح کی طرح ہیں۔ نہ ان میں جلاؔل کا رنگ ہے۔ نہ جماؔل کا۔ اور نہ تیری اذان میں وہ تاثیر ہے کہ مسلمانوں کے مصائب کی تاریک رات ختم ہو، اور وہ سحر نمودار ہو جس کا میں آرزومند ہوں[1]

---

[1] اس شعر میں، دو لفظ غور طلب ہیں، جلاؔل اور جماؔل، میں اس کی تفصیل تو کر نہیں سکتا، صرف اتنا بتانا کافی ہو گا کہ یہ دونوں اللہ کی دو (باقی برصفحہ)

تقدیر

اقباؔل نے مسئلہ تقدیر پر اس قدر لکھا ہے کہ اگر ان کی تمام کتابوں سے اس موضوع سے متعلق اشعار کو ایک جگہ جمع کر کے ان کی شرح لکھی جائے تو بلا مبالغہ ایک ضخیم کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ اُنہوں نے اِس مہتم بالشان مسئلہ پر مختلف پہلوؤں سے نگاہ ڈالی ہے۔ چنانچہ اس نظم میں ایک خاص زاویۂ نگاہ پیش کیا ہے۔

(۱) کہتے ہیں کہ:۔ اگرچہ یہ بات صحیح ہے کہ اس دنیا میں کبھی کبھی نااہلوں کو طاقت اور حکومت حاصل ہو جاتی ہے اور باکمالوں کی کوئی قدر نہیں ہوتی (جیسا آج کل ہو رہا ہے)

(۲) اور یہ بھی صحیح ہے کہ تقدیر، منطق کے تابع نہیں نظر آتی، یعنی بعض اوقات ہماری عقل کا تقاضہ کچھ ہوتا ہے۔ اور دنیا میں جو کچھ رونما ہوتا ہے وہ بالکل اس کے خلاف ہوتا ہے۔

(۳) لیکن ایک حقیقت ایسی ہے جو ہر اُس شخص کے سامنے واضح ہے جو

(بقیہ صفحہ گذشتہ) خاص شانیں (ASPECTS) ہیں۔ اور مومن کے اندر ان کا عکس پایا جانا اشد ضروری ہے۔ جَلَال = شان و شوکت، قوت حکومت، سرداری، جَمَال = لطف و کرم، رحمت، نوازش، مہربانی کلمۂ توحید ان دونوں کا جامع ہے۔ لَا اِلٰہ سے جلال، اور اِلَّا اللّٰہ سے جمال کا رنگ پیدا ہوتا ہے۔ ۱۲۔

قوموں کی تاریخ کا مطالعہ کرے۔ اور وہ یہ ہے کہ تقدیر قوموں کے عمل پر نظر رکھتی ہے۔ اور اس کی نظر نہایت تیز ہے۔ ایسی تیز ہے، جیسی تلوار کی دھار۔ اور تاریخ سے ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو قومیں فطرت کے قوانین کی پابندی کرتی ہیں۔ وہ ترقی کرتی ہیں، اور جو قومیں، نافرمانی کرتی ہیں، وہ مٹ جاتی ہیں۔

یعنی فطرت، افراد کے گناہوں کو تو کبھی کبھی معاف بھی کر دیتی ہے۔ لیکن ملت کے گناہوں کو معاف نہیں کرتی۔

اسی خیال کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے ؎

فطرت افراد سے اغماض تو کر لیتی ہے!
نہیں کرتی دلے ملت کے گناہوں کو معاف

اس کی مثال یوں سمجھو کہ یہ تو ممکن ہے کہ "بچۂ سقہ" چند روز کے لیے نیرنگیٔ روزگار کی بدولت، تختِ کابل پر جلوہ گر ہو جائے۔ لیکن یہ ممکن نہیں کہ بچہ سقہ کے ٹائپ کے حکمرانوں کا طویل سلسلہ شروع ہو جائے۔ یا ایک قوم مسلسل بد اعمالیوں میں مبتلا رہے۔ اور صفحۂ ہستی سے معدوم نہ ہو جائے۔ چنانچہ عاد اور ثمود کی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ اور انشاء اللہ اب انگریزوں کی باری ہے۔

توحید

اقبال نے اس نظم میں اسلامی عقیدۂ توحید کے حقائق و معارف بیان کئے ہیں۔ لکھتے ہیں، کہ

ایک زمانہ تھا جب مسلمان قرآن و حدیث کو سمجھ کر پڑھتے تھے، اور توحید کے مقتضاء پر عمل کر کے دنیا میں قوت اور شوکت کے مالک تھے مقتضاء پر عمل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جو زبان سے کہتے تھے کہ ہم اللہ کے سوا، کسی کی اطاعت نہیں کرتے، تو واقعی اُن کا طرزِ عمل بھی یہی تھا۔

لیکن آج (سنہ ۱۹۵۰ء میں) کیا حالت ہے؟ مسلمانوں نے توحید کے اقتضاء پر عمل کرنا تو چھوڑ ہی دیا ہے، اس کا مفہوم بھی عام مسلمانوں کے دماغوں سے نکل گیا ہے۔ اب رہے علماء تو (الا ماشاء اللہ) اُن کی کیفیت یہ ہے کہ عقیدۂ توحید اُن کی نظر میں علم کلام کا ایک مسئلہ بن گیا ہے۔ یعنی وہ صرف اس پر اکتفاء کرتے ہیں کہ شرح مقاصد اور شرح مواقف میں توحید سے متعلق جو علمی اور منطقی بحثیں ہوئی ہیں۔ اُن کا اجمالی علم حاصل ہو جائے، توحید کا تقاضہ کیا ہے، اس سے ان کو بھی کوئی سروکار نہیں ہے۔

واضح ہو کہ علم کلام وہ علم ہے جس میں اسلامی عقائد کا فلسفہ بیان کیا جاتا ہے۔ اور اُن کو عقل کے مطابق ثابت کیا جاتا ہے۔ اور غیروں کے اعتراضات کے جواب دیئے جاتے ہیں۔

اقبال کا کہنا یہ ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں اللہ کی ذات اور صفات میں منطقی بحثوں سے منع فرما دیا تھا۔ اس کے بجائے یہ حکم دیا تھا کہ ہم توحید پر ایمان لا کر، اس کے اقتضاء پر عمل کریں۔ ہم نے ارشادِ نبوی کو پس پشت ڈال دیا۔ اور اس کے برعکس طریقہ اختیار کر لیا۔ چنانچہ آج کیفیت یہ ہے کہ توحید کے اقتضاء پر مسلمانوں کے کسی ملک میں عمل نہیں ہوتا، ہاں مسئلہ توحید پر منطقی بحثیں ضرور ہوتی ہیں، جن سے فرد یا قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔

(۲) توحید ایک روشنی ہے، اور اگر اس سے بداعمالی کی تاریکی دُور نہ ہو تو خود مسلمان سے، مسلمان کا مقام پوشیدہ رہے گا۔ یعنی توحید کے اُصول پر عمل کرنے سے مسلمان اپنے اصلی مقام یعنی خلافتِ الٰہیہ پر فائز ہو سکتا ہے۔

(۳) اے مسلمانوں کے لیڈر! میں نے تیری فوج دیکھی ہے۔ اُن کے پاس سب کچھ ہے، لیکن توحید کی تلوار نہیں ہے۔

(۴) افسوس نہ ہمارے علماء اس راز سے واقف ہیں، نہ فقہا کہ جب تک قوم میں کردار کی وحدت پیدا نہ ہو، افکار کی وحدت اگر پیدا بھی ہو جائے تو کوئی فائدہ نہیں دیتی۔

اور حقیقتِ حال یہ ہے کہ مسلمانوں میں نہ وحدتِ کردار ہے نہ وحدتِ افکار ہے۔ اور آج ۱۹۵۰ء میں تو سیاسی وحدت بھی ختم ہوتی نظر آ رہی ہے۔

(۵) آخر میں اقبال اس بات پر افسوس کرتے ہیں کہ ہمارے موجودہ "امام"۔ جو صرف نمازوں میں امامت کرتے ہیں، یہ لوگ اس

حقیقت سے واقف نہیں کہ قوم کا مفہوم کیا ہے اور قومیں کیسے برسرِ عروج آتی ہیں۔ اور ان کی امامت و قیادت کیسے کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ قوم کی رہنمائی سے قاصر ہیں۔

نوٹ:۔ میں اس جگہ اقبال کے اس تبصرہ پر اتنا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ ان دو رکعت کے اماموں سے زیادہ لائقِ ملامت وہ امام ہیں، جو مسجدوں کے دائرے سے باہر مسلمانوں کی رہنمائی کر رہے ہیں۔ بیشک مساجد کے مُلاّ، اس حقیقت سے باخبر نہیں کہ قوم کیا چیز ہے؟ اور قوموں کی امامت کیا ہے۔ لیکن ہمارے یہ قائدین اور رہنما جو، عالی شان ایوانوں میں صوفوں پر براجمان ہیں، یہ بھی تو اس حقیقت سے نابلد ہیں کہ قوم کسے کہتے ہیں اور قوموں کی امامت کیا چیز ہے۔ اور میری رائے میں یہ لیڈر زیادہ قابلِ ملامت ہیں۔ کیونکہ قوم مسجدوں میں تو بہت کم جاتی ہے۔ دن رات انہی کی کوٹھیوں کا طواف کرتی رہتی ہے ملاؤں سے واسطہ تو تھوڑی دیر کا ہے۔ سارا وقت تو انہی لیڈروں کی خوشامد میں بسر ہوتا ہے۔

علم اور دین

اقبالؔ کا مقصد یہ ہے کہ صحیح علم، دین سے جُدا نہیں ہے۔ اُنہوں نے اس نکتہ کو بہت مشکل انداز سے پیش کیا ہے۔ اور میں اختصار پر مجبور ہوں۔

(۱) کہتے ہیں کہ جو علم قرآن و حدیث کے تابع ہے (دل و نظر کا ندیم ہے) وہ خود اپنے غلط اصُول کی اصلاح کر سکتا ہے۔ مثلاً فلسفہ اور سائنس اگر پابندِ قرآن ہو تو انسان کو الحاد اور کُفر سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ اور قوم کے حق میں رحمت بن سکتا ہے۔ یعنی نفع پہنچا سکتا ہے لیکن اگر ایسا نہ ہو تو پھر یہی فلسفہ اور سائنس بنی آدم کے حق میں لعنت بن جائے گا۔ بلکہ موجبِ ہلاکت۔

(۲) کہتے ہیں کہ علم ایک وحدت ہے، اور ہمیشہ سے ایک رہا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ "زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک" جب کائنات میں ہر جگہ وحدت کارفرما ہے، تو علم میں وحدت کیوں نہ ہو، لہٰذا یہ کہنا کہ فلاں علم جدید ہے، فلاں قدیم ہے، کم نظری کی دلیل ہے۔

(۳) اب خرد اور نظر، دونوں میں مطابقت دکھاتے ہیں۔ اور اس کو ایک مادی مثال سے واضح کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ذرا غنچہ کی طرف دیکھو! اگر نسیمِ سحر کے ساتھ قطرۂ شبنم شریک نہ ہو، اگر خارجی یا مادی مظہر کے ساتھ، فیضانِ آسمانی شامل نہ ہو، تو چمن میں کسی غنچہ کی

پرورش نہیں ہو سکتی۔

اسی طرح اگر انسانی عقل (نسیم) کے ساتھ الہام ربانی (شبنم) شامل نہ ہو تو علم کی صحیح تربیت نہیں ہو سکتی۔

(۴) یاد رکھو! وہ علم، علم ہی نہیں، بلکہ جہالت ہے جس میں مشاہدات حکیم (عقل) کے ساتھ تجلیاتِ کلیم (الہام) ہمکنار نہ ہو۔ یعنی صحیح اور سچا علم وہی ہے، جس کی تصدیق، قرآن و حدیث سے ہو سکے۔

الغرض دینِ اسلام سراپا علم ہے، اور علم سراسر دین سے ماخوذ ہے جو علمِ دین سے ماخوذ نہیں، وہ علم ہی نہیں جہالت ہے۔

ہندی مسلمان

اس مختصر نظم میں اقبالؔ نے ۱۹۳۶ء کے ہندی مسلمانوں کی حالت کا نقشہ کھینچا ہے۔ اگرچہ یہ نظم آج سے ۱۵ سال پہلے لکھی گئی تھی، لیکن اس کا مضمون آج بھی صحیح ہے۔ کہتے ہیں کہ برہمن یعنی ہندو تو مسلمان کو غدارِ وطن سمجھتے ہیں، کیونکہ اُن کے خیال کے مطابق مسلمان رہتا تو ہے ہندوستان میں، لیکن محبت کرتا ہے عرب سے۔ اور یہ بات مسلکِ وطن پرستی (نیشنلزم) کی رو سے وہ جُرم ہے، جو کبھی معاف نہیں ہو سکتا۔ اس کا دوسرا تصور یہ ہے کہ اپنی قومیت کی بنیاد وطن پر نہیں رکھتا۔ جب اس سے دریافت کیا جاتا ہے کہ تم کون ہو؟ تو وہ یہ نہیں کہتا کہ میں ہندی ہوں، بلکہ بلاتامل اور برملا یہ کہتا ہے کہ میں مسلمان ہوں۔

تیسرا قصور یہ ہے کہ وہ پانی تو پیتا ہے، گنگا اور جمنا کا۔ پھل کھاتا ہے اُن درختوں کے جو ہندوستان کی مٹی سے اُگتے ہیں، لیکن نام رکھتا ہے بدیشی، زبان بولتا ہے بدیشی، لباس پہنتا ہے تو وہ بھی بدیشی، کاشی[1] اور پریاگ[2] کو آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ بلکہ ان شہروں میں رہتا سہتا ہے، لیکن ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ اور مکۂ مدینہ کا نام بھی سن لیتا ہے تو تڑپ جاتا ہے اور کچھ نہیں تو جو لوگ وہاں سے واپس آتے ہیں اُنہی کے ہاتھوں کو بوسہ دے کر دل خوش کر لیتا ہے۔ لہٰذا اس کی غداری میں کیا شک ہو سکتا ہے!

اب رہے انگریز، تو وہ مسلمان کو گداگر سمجھتے ہیں۔ کیونکہ نہ اس قوم میں تعلیم ہے، نہ فراست، نہ تجارت ہے نہ دولت، نہ اتحاد ہے، نہ طاقت، نہ ہمدردی ہے نہ رفاقت۔ وہ دیکھتے ہیں کہ اس قوم کے اکثر اُمراء عیاش ہیں، اعلیٰ عہدیدار (اِلّا ماشاء اللہ) دین سے بیگانہ ہیں۔ اور ہماری نقالی میں مست ہیں۔ جاگیردار اوّل درجہ کے ضمیر فروش۔ اور خطابات کے لالچی ہیں، اور پروفیسر تو ہمارے افکار و خیالات کی فی الحقیقت گدائی کر رہے ہیں۔ اب رہے لیڈر تو وہ بقول اکبر الہ آبادی ؎

دفع دل سے اثر یاس کیا کرتے ہیں
ریزولیوشن ہی فقط پاس کیا کرتے ہیں

جب دیکھو اپنے کالجوں اور اسکولوں کی امداد کے لیے کاسۂ گدائی لے کر ہماری خدمت میں حاضر ہوتے رہتے ہیں۔ اور ایڈریس کے

[1] بنارس ۱۲ [2] الہ آباد ۱۲

پردہ میں ہم سے بھیک مانگتے رہتے ہیں۔ بزدلی کا یہ عالم ہے کہ ہم نے تقسیم بنگالہ (جو اُن کے لیے مفید تھی) منسوخ کر دی۔ لیکن اس قوم کے کسی نوجوان نے بم بنا کر کسی انگریز کو ہلاک نہیں کیا۔ اندریں حالات اس قوم کے گداگر ہونے میں کیا شک ہے!

(۲) الغرض ہندو تو مسلمان کو غدار کہتا ہے، انگریز، اُسے گداگر سمجھتا ہے۔ اب رہا اس کی زندگی کا مذہبی پہلو، تو پنجاب کے اربابِ نبوت کی شریعت اسے صاف لفظوں میں ”کافر“ قرار دیتی ہے۔

(۳) میرا دل اس صورتِ حال کو دیکھ کر بہت رنجیدہ ہوتا ہے اور میں منتظر ہوں کہ آوازۂ حق کب اور کس طرف سے بلند ہوتا ہے۔ آوازۂ حق سے اقبال کی مراد یہ ہے کہ دیکھیے وہ دن کب آتا ہے جب مسلمان اس لائق ہو گا کہ ان تینوں طاقتوں کے سامنے ”کلمہ حق“ بلند کر سکے[1]

آزادیٔ شمشیر کے اعلان پر

جب ۱۹۳۵ء میں حکومت پنجاب نے تلوار کو لائسنس سے مستثنیٰ کر دیا تو اقبال نے مسلمانوں کو اس سلسلہ میں ایک نکتہ سمجھایا تھا۔ کہ اب جبکہ تمہیں تلوار کے لیے لائسنس لینے کی ضرورت نہیں ہے یعنی

[1] افسوس! اقبال کی اس آرزو کے پورے ہونے کی بظاہر کوئی صورت آج بھی نظر نہیں آتی، بلکہ اب تو حالات اور بھی خراب ہو گئے ہیں۔ ۱۲

تم آزادی کے ساتھ تلوار رکھ سکتے ہو تو اس بات پر غور کرو :۔

(۱) کہ فولاد کی تیز تلوار کیا چیز ہے ؟

(۲) اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ توحید کے اسرار دو چیزوں میں پوشیدہ ہیں، ایک تو یہی فولاد کی تلوار ۔

(۳) دوسری چیز فقر کی تلوار ہے ۔ اور اگر فولاد کی تلوار کے ساتھ ساتھ مسلمان کے اندر شانِ فقر بھی پیدا ہو جائے تو مومن ، یا خالدؓ جانباز بن جاتا ہے یا حیدرِ کرارؓ ۔

جہاد

اس نظم میں اقبالؔ نے انگریزوں کی حمایت کرنے والی جماعت سے یہ سوال کیا ہے کہ اگر جہاد اور قتال بُری بات ہے تو تم لوگ یورپ کو ترکِ جہاد کا مشورہ کیوں نہیں دیتے ؟ آخر مسلمانوں ہی سے کیوں کہتے ہو کہ اے دوستو! اب جہاد کا خیال ، اپنے دل سے نکال دو۔[1]

(۱) شیخ نے فتویٰ دیا ہے کہ یہ زمانہ قلم کا ہے ۔ یعنی اسلام قلم کے زور سے دنیا کے ادیان پر غالب آئے گا ۔ اب مسلمانوں کو جہاد کی ضرورت نہیں ہے ۔ کیونکہ تلوار کارگر ہی نہیں رہی ۔

(۲) لیکن کیا جناب شیخ اس حقیقت سے آگاہ نہیں ہیں کہ مسجدوں میں

---

[1] یہ فقرہ اس گوہر آبدار سے ماخوذ ہے :۔
اے دوستو! جہاد کا اب چھوڑ دو خیال + دیں کے لیے حرام ہے اب جنگ اور قتال

یہ وعظ بالکل بے سود ہے ؟

(۳) مسلمانوں کے پاس تلوار ہے کہاں جو جناب شیخ اُسے نیام میں رکھنے کا مشورہ دے رہے ہیں ۔ اور اگر کسی مسلمان کے پاس تلوار ہے بھی تو اس کا دل جہاد کے جذبہ سے بالکل خالی ہو چکا ہے ۔ کیونکہ انگریزی حکومت صرف اسی مسلمان کو ہتھیار رکھنے کی اجازت دیتی تھی ، جس کے متعلق اُسے یقین ہوتا تھا کہ یہ شخص کبھی اس ہتھیار کو ہمارے خلاف استعمال نہیں کرے گا، صرف شیروں کا شکار کرکے اُن کی کھالوں سے اپنے "دربار ہال" کو سجالیا کرے گا۔

جس مسلمان کی حالت یہ ہے کہ وہ کافر کی موت مرنا بھی نہیں چاہتا ، یعنی چارپائی پر بھی مرنا نہیں چاہتا ، اُس بزدل سے کون یہ کہہ سکتا ہے کہ تو ایک مسلمان کی موت مر۔ یعنی درجۂ شہادت حاصل کر !

نوٹ :۔ مسلمانوں کی اصطلاح میں چارپائی پر مرنا گویا کافر کی موت مرنا ہے ۔ اور مسلمان کی موت یہ ہے کہ میدان جنگ میں شہادت حاصل کی جائے ۔ چنانچہ دنیائے اسلام کا متفقہ فیصلہ ہے کہ سلطان ٹیپو شہید مسلمان کی موت مرے ۔ اور نظام علی خاں کافر کی موت مرا۔ بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ سلطان شہید، مرے ہی نہیں ، وہ تو زندہ ہیں ۔

(۴) دراصل جناب شیخ کو، اس قوم کو ترک جہاد کا مشورہ دینا چاہیئے جس کی خونریزی ، اور سفاکی سے ایک دُنیا تنگ آ چکی ہے ۔ جس نے بلاوجہ سوڈان اور فلسطین ، عراق اور ہندوستان میں مسلمانوں کا خون بہایا ، اور مدّتوں تک بلاسبب آزاد علاقہ

(مابین پاکستان وافغانستان) پر بمباری کی۔

(۵) اقوامِ یورپ اپنے باطل تنظام اور غلط عقائد کی حفاظت کے لیے ہر وقت جنگی تیاریوں میں مشغول ہیں۔

(۶) اگر اقوامِ مشرق کے لیے جنگ وجدال بُری بات ہے تو یقیناً اقوامِ مغرب کے لیے بھی یہ فعل مذموم ہی ہے۔

(۷) اس لیے ہم کلیسا کی حمایت کرنے والے علماء سے یہ پوچھتے ہیں کہ اگر تم حق کی اشاعت کر رہے ہو تو یہ کیا بات ہے، کہ مسلمانوں کو جنگ سے بچنے کی تلقین کرتے ہو، اور یورپ کو اس فعل سے باز نہیں رکھتے! اگر یورپ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے اصولِ زندگی کی حمایت یا استحکام کے لیے تلوار اُٹھا سکتا ہے تو مسلمانوں کو بھی یہ حق ضرور حاصل ہونا چاہیے۔

قوّت اور دین

اس نظم میں اقبالؔ نے طاقت اور مذہب کے باہمی رشتہ کو واضح کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ

(۱) تاریخ شاہد ہے کہ سکندؔر اور چنگیزؔ، ہلاکو اور نادر شاہ اور اسی قسم کے دوسرے فاتحین نے بلاوجہ بنی آدم کا خون بہایا۔

(۲) غرض تاریخ کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ قوّت کا نشہ بہت خطرناک ہوتا ہے۔

(۳) یہ قوت کا نشہ ایسا زبردست سیلاب ہے کہ اِس کے آگے عقل

اور ایمان، علم اور ہنر سب تنکوں کی طرح بہہ جاتے ہیں۔ کوئی چیز حکومت کے نشہ کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔

(۴) اگر طاقت کا یہ نشہ، دین کے زیرِ اثر نہ ہو، یعنی اگر اُس طاقتور حکمران یا فاتح کے اندر خوفِ خدا نہ ہو تو وہ تمام دنیا میں ہلاکت برپا کرسکتا ہے۔ لیکن اگر وہ قوت، دین کی حفاظت میں صرف کی جائے تو پھر وہی زہر تریاق بن جاتا ہے اور وہ بادشاہ ہر کمزور کا حمایتی اور حق و صداقت کا علمبردار بن جاتا ہے۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ فاروقِ اعظمؓ[1] سلطان نورالدین زنگیؒ اور سلطانؒ صلاح الدین ایوبی، دُنیا اور دُنیا والوں کے لیے مجسم رحمت تھے۔

فقر اور ملوکیت

اس نظم میں اقبالؔ نے روحِ اسلام (فقر) اور ملوکیت کا موازنہ پیش کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ

(۱) دنیا پرست بادشاہ تو ظاہری ساز و سامان پر بھروسہ کرتے ہیں، لیکن

---

[1] جناب فاروقِ اعظمؓ کا زمانہ خلافت بلاشبہ، بنی آدم کے حق میں رحمت تھا، جب آپ بیت المقدس کے گرجہ میں تشریف لے گئے تو وہاں نماز کا وقت آگیا۔ نصاریٰ نے عرض کی کہ آپ یہیں نماز پڑھ لیجئے لیکن آپ نے یہ کہہ کر گرجہ کے اندر نماز پڑھنے سے انکار فرمایا کہ ممکن ہے میرے بعد مسلمان اس گرجہ کو مسجد قرار دے کر تم لوگوں کو اس مقام سے محروم کردیں، کیا یہ ایک واقعہ آپ کے مجسم رحمت ہونے کا ثبوت نہیں ہے؟

(۲ اور ۳ کے لیے دیکھو صہ ۸۴، صہ ۸۵)

جو لوگ اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں، وہ لوگ صرف اللہ پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اور سازو سامان کی چنداں پرواہ نہیں کرتے۔ اگر میسر آ جائے تو بہت خوب ورنہ وہ لوگ بے سازو سامان ہی میدانِ جہاد میں کود پڑتے ہیں۔ اور سچی بات یہ ہے کہ اگر سینوں میں اللہ اور اُس کے رسولؐ کی محبت موجزن ہو تو، مجاہد فی سبیل اللہ، دشمنوں پر بجلی بن کر گرتا ہے۔ ۱

(۲) اور ایسی بے جگری اور بہادری سے لڑتا ہے کہ ہر دَور میں فرعون اور کلیم کا واقعہ تازہ ہو جاتا ہے۔

(۳) اب اقبال رُخ بدل کر کہتے ہیں کہ اے مسلمانو! اگر تمہارے پاس سازو سامان کی کمی ہے، تو ہرگز آزردہ خاطر نہ ہونا۔ اسلام کی کامیابی کا دَور عنقریب آنے والا ہے، کیونکہ اقوام یورپ کے سامنے کوئی اخلاقی نصب العین نہیں ہے، وہ سب دولت اور استعمار کی حرص میں مبتلا ہیں، اور اس ناپاک جذبہ کی بنا پر اُن کی اخلاقی

(بقیہ) ۵۳ سلطان عادل نورالدین محمود زنگی، دوسری صلیبی جنگ کا ہیرو ۱۱۴۶ء تخت نشین ہوا۔ یہ سلطان نہایت عادل، رحمدل، علم دوست، غریب نواز، رعایا پرور، اور اسلام دوست تھا۔ اس کی صفات حمیدہ کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اس کے دشمن اُس کی مدح پر مجبور تھے۔ چنانچہ ولیم بشپ آف ٹائر لکھتا ہے کہ نورالدین اگرچہ نصاریٰ کا شدید ترین دشمن تھا، لیکن نہایت عادل، حوصلہ مند، عقلمند، اور اپنی قومی روایات کے اعتبار سے مذہب دوست تھا اس کے عہدِ حکومت میں کوئی دولت مند کسی غریب کو کسی قسم کا آزار نہیں پہنچا سکتا تھا۔ اس کی معدلت شعاری کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اُس کی وفات کے بعد

حالت بالکل تباہ ہو چکی ہے۔ میں شاید اس حقیقت کو ابھی واضح نہ کرتا لیکن جس طرح موجِ نسیم سے غنچہ شگفتہ ہو جاتا ہے، اُسی طرح عشق و مستی نے مجھے اظہارِ حق پر مجبور کر دیا ہے۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) اگر کوئی شخص کسی پر ظلم کرتا تو، مظلوم اُس کی قبر پر جا کر، فریاد کیا کرتا تھا کہ اے سلطان تیری وفات کے بعد، دنیا کے لوگ پھر ظلم و ستم پر مائل ہو گئے ہیں۔ ۱۱۷۴ء میں وفات پائی۔

۵۳ سلطان صلاح الدین ایوبی کی رحمدلی کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ عیسائیوں نے جب بیت المقدس فتح کیا تو ساٹھ ہزار مسلمانوں کو تہ تیغ کر دیا۔ جن میں عورتیں بچے اور بوڑھے بھی شامل تھے۔ لیکن جب سلطان نے اس شہر کو فتح کیا تو سب کو معاف کر دیا۔ اور اجازت دیدی کہ چالیس دن کے اندر شہر کو خالی کر دیں، اور سلطان کی مملکت میں جہاں چاہیں آباد ہو جائیں۔ اگرچہ ہر مرد پر دس دینار، اور ہر عورت پر پانچ دینار، اور ہر بچہ پر ایک دینار زرِ فدیہ عائد کیا گیا تھا۔ لیکن دس ہزار نادار عیسائیوں کا زرِ فدیہ خود سلطان نے ادا کیا۔ اور کئی ہزار آدمیوں کا فدیہ معاف کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ سلطان نے بیوہ عورتوں، اور یتیموں کو اپنے پاس سے بہت سا روپیہ دیا۔ اور کسی شخص کو قتل نہیں کیا۔

میرا خیال ہے کہ یورپ کی تاریخ اس رحمدلی اور انسانیت کی، ایک مثال بھی پیش نہیں کر سکتی۔

اسلام

(پہلی)

اس نظم میں اقبالؔ نے اسلام کی حقیقت بیان کی ہے کہ در اصل اسلام "فقر غیور" کا دوسرا نام ہے۔ فرماتے ہیں۔

(۱) اسلام کی روح، نورِ خودی اور نارِ خودی ہے۔ یعنی اسلام خودی میں نورؔ اور نارؔ کا رنگ پیدا کر دیتا ہے۔ نور سے مراد ہے شانِ جمال اور نار سے مراد ہے شان جلال۔ اور ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ "لَا اِلٰہ" سے جلال اور اِلَّا اللّٰہ سے جمال کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ یہی اصل اسلام ہے۔ یعنی اسلام کی روح ہے۔

اور انسانی زندگی کی تکمیل کے لیے انہی دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ مختصر طور پر یوں کہہ سکتے ہیں:۔

نار + نور = جلال + جمال = لا الٰہ + الّا اللّٰہ = روح اسلام

نیز، نور سے حضور، یعنی اللہ کی موجودگی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اِس کی تفصیل یہ ہے کہ جب الّا اللّٰہ کہا تو اللہ کی ہستی کا اثبات ہو گیا۔ اِسی سے رنگِ جمال پیدا ہوا، اور اِسی سے ہستی باری کا اثبات یعنی رنگ حضور پیدا ہو گیا۔ گویا نور اور حضور ایک ہی چیز ہے۔

(۲) بس یہی نور و نار، ہر شئے کی بنیاد ہے۔ اور یہی نمود کی اصل ہے۔ یعنی خودیؔ ہر شئے میں موجود ہے، حتیٰ کہ جمادات میں بھی۔ لیکن فطرت نے اس روح کو نظروں سے پوشیدہ رکھا ہے۔ یہ نکتہ صرف

غور کرنے سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ تفصیل سنو!

واضح ہو کہ یہ کائنات، اللہ کے اسمار کا پرتو ہے۔ اور اُس کے جس قدر اسمار ہیں وہ سب اس کی صفات ہی تو ہیں۔ مثلاً رحیم و کریم، اور قہار و جبّار انہی صفات کی تجلی ہر دم ہوتی رہتی ہے۔ اور یہ صفات دو قسم کی ہیں۔ جلالیؔ اور جمالیؔ۔ گویا اللہ کی دو شانیں ہیں، شانِ جلال اور شان جمال لَا اِلٰہ اس کی شانِ جلال کا مظہر ہے۔ اور اِلّا اللّٰہ اس کی شانِ جمال کا مظہر ہے۔ اور ہم ابھی بیان کر چکے ہیں کہ کائنات پر اس کی صفات ہر دم تجلی فرماتی رہتی ہیں۔ اس لیے رنگِ جلال اور رنگ جمال (یعنی نورؔ اور نارؔ) ہر شئے کی تقویم، اور ہر شئے کی نمود کی اصل ہے۔ اور یہی رُوح اسلام ہے۔ یعنی اسلام انسانی خودی میں یہی دونوں شانیں پیدا کر دیتا ہے۔ جسے اقبال نے نور اور نار سے تعبیر کیا ہے۔ جب مومن اپنے آپ کو صبغۃ اللہ، یعنی اللہ کے رنگ میں رنگ لیتا ہے تو اس میں بھی جلالی اور جمالی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یہ رنگینی صرف اسلام یعنی کامل اطاعت کی بدولت ممکن ہے۔ اس لیے جلال اور جمال اسلام کی روح ہے۔ اور یہی دونوں شانیں جن کو اقبال نے نور اور نار سے تعبیر کیا ہے، ہر شئے کی بنیاد ہیں۔

(۳) اگر یورپ کو لفظِ اسلام سے نفرت ہے تو ہم اُسے اسی دین کا دوسرا نام بتاتے ہیں۔ اور وہ نام "فقرِ غیور" ہے۔

فقر غیور سے مراد وہ فقر ہے جس میں غیرت کا مادہ پایا جائے۔ یعنی ایک فقر تو مسکینی اور گداگری سکھاتا ہے، اسلام کو اس فقر سے کوئی علاقہ یا رابطہ نہیں ہے۔

اسلام انسان میں ایسا فقر پیدا کرتا ہے جس میں مسکینی اور دلگیری نہیں ہوتی، بلکہ اللہ اور اُس کے رُسولؐ کے لیے غیرت ہوتی ہے۔ اور مسلمان کی شناخت یہ ہے کہ وہ غیور ہوتا ہے۔ کسی کے آگے سربسجود نہیں ہوتا۔ اور کفر سے کسی صورت میں بھی مفاہمت نہیں کرتا۔ دُنیا کو ہیچ سمجھتا ہے۔ دولت کو خاطر میں نہیں لاتا۔ بوریئے پر سوتا ہے، پیوند لگا ہوا کرتا پہنتا ہے۔ لیکن سلاطین کے سامنے کلمۂ حق کہتا ہے۔ اور مطلق نہیں ڈرتا، بلکہ سلاطین خود اُس کے سامنے لرزہ بر اندام رہتے ہیں۔

اسلام جس فقر کی تعلیم دیتا ہے۔ اقبال نے بالِ جبریل میں خود اُس کی تصریح کی ہے ؎

ایک فقر سکھاتا ہے مسکینی و دلگیری
اک فقر سے کھلتے ہیں اسرارِ جہانگیری

اسلام بھی فقر کی شان پیدا کرتا ہے۔ لیکن وہ فقر انسان کو دُنیا میں سربلند اور حکمراں کر دیتا ہے۔ بلکہ

بادشاہاں در قباہائے حریر
زرد رو از سہم آں عریاں فقیر[۱]

یعنی اسلام، مسلمان میں جو شانِ فقر پیدا کرتا ہے۔ اُس سے بادشاہ بھی لرزہ بر اندام ہو جاتے ہیں۔ اقبال نے اس فقر کی تشریح اپنی فارسی کتابوں میں کی ہے۔ مثلاً مثنوی پس چہ باید کرد، لہٰذا جن لوگوں کو

---

[۱] بادشاہ لوگ جو ریشمی لباس پہنتے ہیں اُس ننگے فقیر کو دیکھ کر اُس کے خوف سے پیلے پڑ جاتے ہیں۔ ۱۲

اقبال کے اصلی رنگ سے آگاہی مطلوب ہو، انہیں لازم ہے کہ اُن کی فارسی کتابوں کا مطالعہ کریں۔

نوٹ:۔ میں مثنوی "پس چہ باید کرد" کی شرح بھی لکھ رہا ہوں — انشاء اللہ جلد ہی شائع ہو جائے گی۔ اور اس کے بعد اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی کی شرح شائع کروں گا۔ (انشاء اللہ تعالیٰ)

حیاتِ ابدی

(دوسری)

اقبال نے دو شعروں میں ہمیں حیاتِ ابدی حاصل کرنے کا طریقہ بتایا ہے۔ کہتے ہیں کہ

اگر ہم زندگی (حیات) کو صدف سے تشبیہ دیں تو خودی کو قطرۂ نیساں کہہ سکتے ہیں۔ اور صدف کا وظیفہ یہ ہوتا ہے کہ وہ قطرہ کی پرورش کر کے اُسے موتی بنا دے۔ پس ہم کو اپنی زندگی اِس طرح بسر کرنی چاہیئے کہ اعمالِ صالحہ کی بدولت ہماری خودی اپنے مرتبۂ کمال کو پہنچ سکے۔ جس طرح قطرہ جب گہر (موتی) بن جاتا ہے تو مرتبۂ کمال کو پہنچ جاتا ہے۔

اس کی صورت یہ ہے کہ انسان کو اپنی خودی کی حفاظت کرنی یعنی اُسے مستحکم کرنا لازم ہے۔ (واضح ہو کہ خودی صرف عشق سے مستحکم ہو سکتی ہے) پس اگر ہماری خودی میں تین صفات پیدا ہو جائیں تو وہ لازوال ہو سکتی ہے۔ یعنی اُسے حیاتِ ابدی حاصل ہو سکتی ہے۔ وہ تین صفات یہ ہیں

خودنگر ۔ خودگر ۔ خودگیر ۔

خودنگر کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے ماحول سے آگاہ ہوں ، دنیا کو دیکھنے اور سمجھنے میں دوسروں کے محتاج نہ ہوں۔ مثلاً دُنیا کو کافروں کی نگاہ سے نہ دیکھیں ۔

خودگر کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی تربیت اور اصلاح خود کر سکیں دوسروں کے دستِ نگر نہ ہوں۔ مثلاً انگریزوں کا ضابطۂ حیات اختیار نہ کریں ۔

خودگیر کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی حفاظت خود کر سکیں دوسروں کے سہارے اپنی زندگی بسر نہ کریں ۔ مثلاً کامن ویلتھ یا یو این او پر اعتماد نہ کریں ۔

ان تینوں صفات سے خودی میں پختگی پیدا ہو سکتی ہے اور اقبال خود کہتے ہیں ؎

خودی چوں پختہ گردد لازوال است

سلطانی

یہ نظم بلندیٔ افکار اور عمقِ معانی کے لحاظ سے ضربِ کلیم کی بہترین نظموں میں سے ہے ۔ اس نظم میں اقبال نے سلطانی (بادشاہت) کا حقیقی مفہوم سمجھایا ہے ۔ یوں سمجھو کہ سلطانی کی دو قسمیں ہیں ۔ ایک نقلی یا مجازی دوسری اصلی یا حقیقی ۔ فرماتے ہیں ۔ کہ

(۱) وہ فقر جو قرآن حکیم کی روح کو اپنی زندگی میں داخل کرنے سے پیدا ہوتا ہے ، ہزاروں مقام رکھتا ہے ۔

(۲) چنانچہ جب مسلمان اپنے اندر شانِ فقر پیدا کر لیتا ہے ۔ تو خودی اپنی مخفی قوتوں سے آگاہ ہو جاتی ہے ۔ یعنی اُس وقت مومن کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ مجھ میں کس قدر زبردست طاقتیں موجود ہیں تو جب خودی اپنی شانِ قاہری سے آگاہ ہوتی ہے تو اسی مقام یا اس وقوف کو "سلطانی" کہتے ہیں ۔

غرض سلطانی کی اصل حقیقت وقوف یا شعور ہے ، نہ کہ تخت و تاج یعنی اُس وقت مومن کو اس حقیقت کا احساس ہوتا ہے کہ دراصل سلطان میں ہوں ، نہ کہ وہ سلاطین جو تخت پر جلوہ گر ہیں ۔ اُس وقت وہ ان نقلی سلاطین کو ایسی ہی حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے ، جیسے یہ دنیاوی سلاطین اپنے امیروں کو دیکھتے ہیں ۔

اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب پانی پت کے گورنر کے چوبدار نے حضرت بو علی قلندر رح پانی پتی کے ایک مرید کو مارا ۔ اور وہ حضرت کی

خدمت میں فریاد لے کر حاضر ہوا، تو حضرت نے اپنے کاتب کو حکم دیا کہ دہلی کے بادشاہ کو میری طرف سے خط لکھ دو کہ اگر تو نے اس بدطینت عامل (گورنر) کو پانی پت سے فوراً دوسری جگہ تبدیل نہیں کیا تو میں دہلی کے تخت کو کسی دوسرے بادشاہ کے حوالہ کر دوں گا۔

باز گیر ایں عاملِ بد گوہرے
ورنہ بخشم ملکِ تو با دیگرے[۱]

غور کیجئے، حضرت قلندر پانی پتیؒ محض ایک گدائے گوشہ نشین تھے نہ اُن کے پاس فوج تھی نہ خزانہ۔ لیکن اس کے باوجود اُن میں اس قدر طاقت تھی کہ اُنہوں نے ہندوستان کے مطلق العنان بادشاہ کو ایسا سخت خط لکھ دیا۔ سوال یہ ہے کہ اُن میں یہ طاقت اور یہ شوکت کیسے پیدا ہوئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ

خودی کو جب نظر آتی ہے قاہری اپنی
یہی مقام ہے کہتے ہیں جس کو سلطانی

(۳) یہی مقام یعنی شانِ فقر جسے حقیقی معنی میں سلطانی کہہ سکتے ہیں، مومن کی قوتوں کی کسوٹی ہے۔ مومن اپنی قوتوں کو اِسی سلطانی کی کسوٹی پر پرکھتا ہے۔ اور اسی مقام پر پہنچ کر وہ حقیقی معنیٰ میں خلیفۃ اللہ علی الارض بن جاتا ہے۔ بظاہر وہ چٹائی پر بیٹھا ہوا ہوتا ہے۔ لیکن در اصل ساری دُنیا پر حکومت کرتا ہے۔ اور ساری دنیا اُس ایک فقیر سے کانپتی رہتی ہے۔

---

[۱] اقبال نے اس شعر میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ۱۲

(۴) واضح ہو کہ یہ سلطانی، اپنے اندر جبر و قہر (ظلم و ستم) کا رنگ نہیں رکھتی، بلکہ عشق و مستی کا رنگ رکھتی ہے۔ بالفاظ دگر، دُنیاوی سلاطین تو صرف لوگوں کے جسم پر حکومت کرتے ہیں، لیکن مومن (صاحبِ فقر) لوگوں کے دلوں پر حکمراں ہوتا ہے۔ دنیاوی سلاطین تو تلوار کے زور سے حکومت کرتے ہیں۔ لیکن مومن محبت کی مدد سے حکومت کرتا ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جبر و قہر سے جہانبانی ممکن نہیں ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ، جن بادشاہوں نے جبر و قہر سے حکومت کی ہے، اُن کا انجام نہایت بُرا ہوا ہے۔

(۵) یہ شعر اس نظم کی جان ہے۔ کہتے ہیں کہ اے تجھ کو (مسلمان قوم سے خطاب ہے) جو غلامی میں مبتلا کیا گیا ہے، اس کا سبب یہی تو ہے کہ اللہ نے تجھے حقیقی سلطانی عطا فرمائی تھی یعنی سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم نے تجھے فقر کا سبق پڑھایا تھا، لیکن تو نے وہ سبق بالکل بھُلا دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم کو بھُلا دینے کے معنی یہ ہیں کہ تو نے اللہ کو بھُلا دیا، پس اُس نے اپنے قانون کے مطابق تجھے بھُلا دیا۔

(۶) افسوس کہ تو نے چند روزہ زندگی کو عیش و آرام سے بسر کرنے کی خاطر فرنگی کی غلامی قبول کر لی ہے۔

کاش! پاکستان کے مسلمان اپنے اندر شانِ فقر پیدا کرلیں، تو پھر سب
[illegible] ئیں - ۱۲

(۷) اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تیری قوم کے (ستاروں) افراد کی عزت خاک میں مل گئی۔ اور وہ تمام دُنیا کی نظروں میں ذلیل وخوار ہوگئی۔

صُوفی

اس نظم میں اقبالؒ نے موجودہ دَور کے گوشہ نشین رہبانیت پسند اور بے عمل صوفیوں سے خطاب کیا ہے۔ جو سائنس اور علومِ جدیدہ سے بالکل بے خبر ہیں۔ کہتے ہیں کہ

(۱) تو فوق العادت، امور میں اس درجہ منہمک رہتا ہے کہ اُمورِ عادی کی طرف کبھی متوجہ ہی نہیں ہوتا۔ حالانکہ اس مادّی دُنیا کا کاروبار معجزات پر نہیں، بلکہ قوانین فطرت پر چل رہا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اللہ معجزات بھی دکھاتا ہے، لیکن شاذونادر ہی ایسا کرتا ہے۔

تجھے لازم ہے کہ معجزات کی دنیا سے باہر نکل کر حادثات کی دُنیا کا بھی مطالعہ کرے۔ یعنی یہ دیکھ کہ کائنات میں جس قدر حوادث رونما ہوتے ہیں، اُن کی علت کیا ہے۔

واضح ہو کہ حوادثِ کائنات کی علت دریافت کرنا، یہی تو سائنس کی بنیاد ہے۔ اور مسلمانوں کو دین کے ساتھ ساتھ سائنس[1] کا علم حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔

۱؎ سائنس سے میری مراد طبیعات، کیمیا، اور علم الحیات ہے۔ ۱۲

(۲) یہ سچ ہے کہ تخیلات کی دُنیا جس میں تو رہتا ہے، بہت دلچسپ اور عجیب وغریب ہے۔ لیکن زندگی اور موت کی دُنیا اُس سے بھی زیادہ عجیب ہے۔ یعنی علم الحیوٰۃ (BIOLOGY) اور علم الحیوان (ZOOLOGY) کا مطالعہ انسان کے لیے جس قدر ضروری ہے اُس سے زیادہ دلچسپ ہے۔ ان علوم سے ہم کو یہ معلوم ہوسکتا ہے کہ اللہ نے جہاں ہاتھی جیسی بڑی چیز پیدا کی ہے، وہاں ایسے چھوٹے کیڑے بھی پیدا کئے ہیں جو خوردبین کے بغیر نظر بھی نہیں آسکتے۔ علاوہ بریں یہ معلوم کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ جاندار مخلوقات کیسے زندہ رہتی ہیں، اور کیسے مرتی ہیں۔

(۳) پس اے صوفی! تو کبھی کبھی ممکنات کی دنیا کی طرف بھی متوجہ ہو جس طرح مراقبہ ضروری ہے، اُسی طرح مشاہدہ بھی تو ضروری ہے مسلمانوں کو ان دونوں کی ضرورت ہے۔ مراقبہ سے ذکر کی قوت ترقی کرتی ہے، مشاہدہ سے فکر کی قوّت میں ترقی ہوتی ہے۔ اور اقبال کہتے ہیں کہ کوئی تعجب نہیں، اگر تو ممکنات کی دنیا میں انقلاب پیدا کردے۔ یعنی سائنسداں تو صرف ظاہری اسباب کو مدِّنظر رکھتا ہے یعنی وہ صرف یہ کہہ سکتا ہے کہ پانی میں یہ تاثیر ہے کہ وہ پیاس بُجھا سکتا ہے۔ لیکن ایک صوفی اس سے آگے بڑھ کر یہ معلوم کرتا ہے کہ یہ تاثیر کہاں سے آئی، اور وہ مراقبہ سے یہ معلوم کرتا ہے کہ کوئی ہستی ہے جس نے پانی کے عناصر کو اس طرح ترتیب دیا کہ ان میں پیاس بجھانے کی تاثیر پیدا ہوگئی۔

نوٹ:۔ یہ صرف تین شعروں کی نظم ہے۔ لیکن بار بار پڑھنے اور

سمجھنے کے لائق ہے۔ ضربِ کلیم کی خصوصیت یہ ہے کہ نہ الفاظ مشکل ہیں نہ تراکیب مشکل ہیں، نہ اسلوب بیان مشکل ہے۔ لیکن معانی اور مطالب بہت عمیق ہیں۔ اور یہی کمال شاعری ہے۔ کہ آسان لفظوں میں ایسے بلند مضامین ادا کردئے ہیں۔

افرنگ زدہ

اس نظم میں اقبال نے کالج کے لڑکوں اور لڑکیوں کی غیر اسلامی زندگی پر تنقید کی ہے۔ ان کی رائے میں کالجوں اور اسکولوں کی تعلیم کا صرف ایک نتیجہ برآمد ہوا ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلمان لڑکے اور لڑکیاں چال ڈھال، وضع ولباس، خورد نوش، گفتگو، زبان اور تمدن و تہذیب اور معاشرت، عقائد اور افکار، غرضکہ زندگی کے ہر شعبہ میں کافروں کی مقلد ہو گئی ہیں۔ اقبال نے اسی چیز کو "افرنگ زدہ" سے تعبیر کیا ہے۔ یہ افرنگ زدہ کی ترکیب "سگ زدہ" کو مدِ نظر رکھ کر وضع کی گئی ہے۔ جس طرح سگ زدہ وہ ہے جس کی رگ رگ میں دیوانے کتے کا زہر سرایت کر جائے۔ اسی طرح افرنگ زدہ وہ لڑکا یا لڑکی ہے جس کی رگ رگ میں فرنگی کافروں کے ناپاک خیالات سرایت کر جائیں اور جس طرح کُتے کے زہر سے جسمانی موت واقع ہو جاتی ہے، اُسی طرح فرنگیوں کے ناپاک خیالات کے زہر سے مسلمان کی روحانی موت واقع ہو جاتی ہے۔

(۱) کہتے ہیں کہ اے مسلمان نوجوان! تیرے وجود میں مجھے کہیں اسلام کی جھلک نظر نہیں آتی۔ اس کے برعکس، تیری شخصیت سے، از سرتاپا فرنگیت ٹپکتی ہے۔ اور اُس کی وجہ یہ ہے کہ تیرے والدین نے تیری شخصیت کی تعمیر میں، اسلام، اور اُس کی روایات کو کسی وقت بھی داخل نہیں ہونے دیا۔ بلکہ بچپن ہی سے تجھ کو فرنگی اساتذہ کے سپرد کر دیا۔ اور اُنہوں نے تجھ کو پورے طور سے کفر کے سانچہ میں ڈھال دیا۔

(۲) یہی وجہ ہے کہ تیرا جسم، خودی سے بالکل معرّا ہے۔ یعنی تو ایک نیام ہے، جس پر سونے کا نفیس کام بنا ہوا ہو، لیکن ہو خالی۔ اب تو خود سوچ لے کہ میدانِ جنگ میں خالی نیام کیا کام دے سکتی ہے۔

(۲)

یہ تو ہوا تیری شخصیت کا حال، اب جہاں تک تیرے ذہن کا تعلق ہے، اس کی کیفیت یہ ہے کہ تو، مغربی تعلیم کی بدولت خدا کا منکر ہو گیا۔ تیری گفتگو سے صاف مترشح ہے کہ تیری نگاہ میں خدا کا وجود ثابت نہیں ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تو نے کالج میں صرف روسو، کارل مارکس، اور فرائڈ[1] کے نظریات کا مطالعہ کیا ہے۔ قرآن اور حدیث، یعنی اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات تو تیری زندگی میں کبھی داخل ہی نہیں ہوئیں۔ لیکن میری نگاہ میں تو خود تیرا ہی وجود ثابت نہیں ہے، کیوں؟

---

[1] ڈاکٹر زیگ مونڈ فرائڈ (SIGMUND FREUD) ۱۸۵۶ء تا (باقی بر صفحہ ۹۸)

(۲) اس لیے کہ وجود کیا ہے؟ وہ جوہر خودی کی نمود، اور اس کے اظہار ہی کا تو نام ہے۔ اور تیرے اندر اول تو خودی ہی نہیں، اور اگر تھوڑی دیر کے لیے، اس کا وجود، فرض بھی کر لیا جائے تو کافرانہ تعلیم کی وجہ سے اس کا جوہر فنا ہو چکا ہے۔ یعنی اُس کے نشوونما کا اب کوئی امکان باقی نہیں ہے۔

(بقیہ ص۹۷) ۱۹۳۹ء آسٹریا کا مشہور ماہر علم اعصاب (NEURO LOGIST) اور طبیب اور نظریہ تحلیل نفسی (PSYCHO ANLYSIS) کا موجد یہودی الاصل تھا۔ زندگی کا بڑا حصّہ ویانا میں بسر کیا ۱۸۸۳ء میں نیوروپیتھالوجی کا پروفیسر مقرر ہوا۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ انسانی زندگی جنسی جذبات کے گرد گھومتی ہے۔ ۱۲

رسو، ۱۷۱۲ء تا ۱۷۷۸ء جنیوا میں پیدا ہوا، فرانس میں زندگی بسر کی ساری عمر مختلف حوادث کا شکار رہا۔ اس کی مشہور کتاب "سوشل کانٹریکٹ" (SOCIAL CONTRACT) ہے جو ۱۷۶۲ء میں شائع ہوئی۔ مذہب، سیاست، تمدن، اور تعلیم، اس کے خاص موضوع تھے۔ جمہوریت کا بہت بڑا علمبردار تھا۔ چنانچہ انقلاب فرانس، بڑی حد تک اس کے انقلاب آفریں خیالات کا نتیجہ تھا۔ جرمنی کا مشہور فلاسفر کانٹ، نیز گوئٹے اور کارل مارکس بھی اس کی تعلیمات سے متاثر ہوئے۔ ۱۲

پس اے مسلمان! سردست تو اس بحث میں مت پڑ کہ خُدا ہے یا نہیں؟ بلکہ تو اس بات پر غور کر کہ میں خود موجود ہوں یا نہیں؟ خدا کا وجود تو بعد میں ثابت ہوگا، تو پہلے اپنا وجود تو ثابت کر۔ پس تو یہ کر یہ مصرع بار بار پڑھنے کے قابل ہے:-

"کر اپنی فکر، کہ جوہر ہے بے نمود تیرا"

کیا اس نظم سے ناظرین، اُس درد کا کچھ اندازہ نہیں کر سکتے جو اقبال کے دل میں ملت کے نوجوانوں کے لیے موجود تھا! سچی بات تو یہ ہے کہ اسی درد کی کسک نے اقبالؔ اور کلامِ اقبالؔ دونوں کو لازوال بنا دیا۔

اقبالؔ نے اس نظم میں افرنگ زدہ نوجوان مسلمان لڑکوں، اور لڑکیوں سے خطاب کیا ہے۔ اور جو کچھ کہا ہے، بالکل درست اور بجا ہے۔ لیکن میں اتنا اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ اصلی مجرم یہ نادان لڑکے اور لڑکیاں نہیں، بلکہ ان کے والدین ہیں۔ جو محض دنیا پرستی میں مبتلا ہیں۔ وہ دُنیاوی نمود کے لیے ان بیگناہوں کو کالجوں کی بھٹی میں بے دریغ جھونک رہے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ قوم کے نونہالوں کی خودی آگ میں جل کر بھسم ہو جاتی ہے۔ اور پاکستان بن جانے کے بعد تو لڑکوں سے زیادہ تیزی کے ساتھ ہماری لڑکیاں، گمراہی اور تباہی کی طرف جا رہی ہیں۔ کاش اقبال آج زندہ ہوتے اور اپنی آنکھوں سے دیکھتے کہ مسلمان لڑکیاں کیسے ذوق و شوق کے ساتھ نارجحیم کی طرف دوڑی چلی جا رہی ہیں۔ اور اُن کے نابینا والدین ہر قدم پر الحمد للہ، اور سبحان اللہ کہہ رہے ہیں!

جس وقت ہماری قوم کی نوجوان لڑکیاں کسی سرکاری تقریب کے موقع پر، زنانہ نیشنل گارڈ کی دلفریب وردی پہن کر، اور پوری قوت کے ساتھ سینہ تان کر، انگریزی انداز سے غیر ملکی مہمانوں کو سلامی دیتی ہیں، تو اُن کے والدین خوشی کے مارے پھولے نہیں سماتے۔ اور یہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان جس مقصد کے لیے بنایا گیا تھا وہ سَو فی صدی پورا ہو گیا۔

کاش اقبال آج زندہ ہوتے تو میں اُنہیں، اُنہی کے یہ دو شعر پڑھ کر سناتا؎

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی ٭ قوم نے ڈھونڈ لی فلاح کی راہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین ٭ پردہ اُٹھنے کی منتظر ہے نگاہ[1]

---

[1] واضح ہو کہ جس زمانہ میں (یعنی ۱۹۱۵ء سے پہلے) اقبال نے یہ قطعہ لکھا تھا اس وقت تک "پردہ" نہیں اُٹھا تھا۔ لیکن آج ۱۹۶۰ء میں قوم کی خوش نصیبی سے پردہ تقریباً اُٹھ چکا ہے۔ صرف جاہل عورتوں میں باقی رہ گیا ہے۔ ۱۲



تصوّف

یہ نظم معانی و مطالب، سوز و گداز، اور حقیقتِ بیان کے لحاظ سے اقبال کی غیر فانی نظموں میں سے ہے۔ اس قدر سلیس، اور دلکش انداز ہے کہ ہر شعر دل کی گہرائیوں میں اُترتا چلا جاتا ہے۔ اور اثر آفرینی کا تو یہ عالم ہے کہ پندرہ سال سے مسلسل اس کو پڑھ رہا ہوں، لیکن ہنوز طبیعت کو سیری نہیں ہوئی ہے۔

حالانکہ فلسفیانہ نظم ہے۔ یعنی جس میں تصوف کی حقیقت بیان کی ہے اور نہایت عمیق خیالات ظاہر کئے ہیں، لیکن ہر مصرع ثانی میں بالکل میرؔ کا رنگ نظر آتا ہے۔ اور وہی سوز و گداز، اور وہی تاثیر ہے جو میرؔ کا طغرائے امتیاز ہے۔

فرماتے ہیں کہ اگر اربابِ تصوف کی لکھی ہوئی تفاسیر، اور اُن کا مدوّن کردہ علم باطنی اسلام کی مصیبتوں کا ازالہ نہیں کر سکتا تو پھر یہ سب چیزیں، اور سارے علوم و فنون بالکل بیکار ہیں۔ یعنی اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگاہ میں اُن کی کوئی قیمت نہیں۔

جو تصوّف، حرم یعنی اسلام کے درد کا علاج نہیں کر سکتا، وہ کسی کام کا نہیں۔

مختصر یہ کہ جو حکمت، اور جو علم، مسلمان صوفیوں کو جہاد فی سبیل اللہ پر آمادہ نہیں کر سکتا، وہ بالکل بیکار ہے۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی، اور آپؐ کے جانثاروں یعنی صحابۂ کرام رضؓ کی زندگیوں پر نظر کرو، کیا کوئی صوفی اُن سے بڑھ کر قرآن اور سنت سے باخبر ہو سکتا ہے؟ کیا کوئی صوفی اُن سے بڑھ کر تصوف سے آگاہ ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں!

تو اُن کی زندگیوں کا مطالعہ کرو اور دیکھو۔ کیا اُن لوگوں نے ساری عمر حجروں میں بیٹھ کر مراقبہ میں بسر کی۔ یا ساری عمر میدانِ جنگ میں جہاد فی سبیل اللہ میں بسر کی؟ پھر غور کرو کہ سرکار دوعالم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سب سے بڑی آرزو کیا تھی؟ کیا حضور پر نورؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ میری سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ میں اللہ کے راستہ میں جہاد کروں اور قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر جہاد کروں اور پھر قتل کیا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، اور اللہ کے راستہ میں جہاد کروں، اور پھر قتل کیا جاؤں۔"

کیا اس میں کوئی شک ہے کہ جیسا نازک زمانہ، اسلام پر آج آیا ہوا ہے، گذشتہ چودہ سو سال میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ کیونکہ آج ساری دُنیا اسلام کو مٹا دینے کے درپے ہے۔ کفر کی جس قدر صورتیں دنیا میں موجود ہیں، سب نے اسلام کے خلاف متحدہ محاذِ جنگ قائم کر رکھا ہے۔ جتنے مذاہب ہیں سب نے اسلام کے خلاف سازش کر رکھی ہے۔ اور جس قدر سیاسی نظام ہیں، سب اسلام کے خلاف صف آرا ہو چکے ہیں۔ آج طاغوتی قوتیں صاف لفظوں میں اعلان کر رہی ہیں کہ دُنیا میں جہالت، سفاہت، ضلالت اور تمام برائیوں کے لیے جگہ نکل سکتی ہے لیکن محمد عربی (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

کے قائم کردہ نظام کے لیے کہیں گنجائش نہیں ہے۔

صدر جمہوریہ امریکہ چار ہزار سال پُرانے نظام حیات، اور ضابطۂ اخلاق سے استفادہ کرنے کو تیار ہے۔ وہ تبت کے گمنام لاما کے گمنام ضابطۂ اخلاق سے استمداد کے لیے آمادہ ہے، وہ ہزاروں سال سے مُردہ زبان (سنسکرت) کی اخلاقی کتابوں سے دریوزہ گری کر سکتا ہے۔ لیکن زندہ رسولؐ اور زندہ زبان کی زندہ کتاب (قرآن) کے زندگی بخش اخلاقی ضابطہ (MORAL CODE) کا ذکر بھی زبان پر نہیں لاتا[1]۔ مبادا شیطان اُس سے ناراض ہو کر، اُس کی حمایت سے دستبردار ہو جائے۔

اندریں حالات اگر تصوف کا لٹریچر، اور تصوف کے وظائف، صوفیوں کو سربکف ہونے پر آمادہ نہیں کر سکتے، تو کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اور ان چیزوں کا کچھ فائدہ نہیں۔

(۲) اگر صوفیوں کے یہ مراقبے، یہ راتوں کے اذکار سری وجہری (خاموشی اور بلند آواز سے اللہ کا ذکر) اور یہ سارا جوش وخروش اور یہ اللہ ہو، کے نعرے، یہ قوالی کی کیف انگیز محفلیں، یہ ختم خواجگانِ چشت ومشائخ نقشبند، یہ حلقۂ ذکر، یہ کیف ومستی، یہ زلفیں اور یہ عمامے، یہ عبائیں اور یہ قبائیں، یہ تسبیحیں اور یہ مصلے، غرضکہ یہ تمام لوازمات اگر تیری خودی کی نگہبانی نہیں کر سکتے، یعنی تجھے جہاد پر آمادہ نہیں کر سکتے تو پھر سب بیکار ہیں۔

---

[1] ماخوذ از ڈان، ۲۴ نومبر ۸۵ء

(۳) اور یہ عقل، جو آسمان کے تارے توڑ کر لاتی ہے اور لا سکتی ہے یہ عقل جس کی بدولت (سائنس دان) مریخ سے نامہ و پیام کا سلسلہ قائم کر رہا ہے، جس کی بدولت چاند تک پہنچنے کا انتظام کر رہا ہے، جس کی بدولت فطرت کے راز ہائے سربستہ کھول[1] رہا ہے۔ یہ عقل اگر،

شریکِ شورشِ پنہاں نہیں، تو کچھ بھی نہیں

میں اس جملہ کی تشریح میں صفحے سیاہ کر سکتا ہوں۔ لیکن مجھے اعتراف ہے کہ جو لطف اس "شریکِ شورشِ پنہاں" کی ترکیب میں پنہاں ہے۔ وہ اس کی تشریح سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

شورشِ پنہاں سے اقبال کی مراد وہی جذبۂ عشق حقیقی ہے جس کی تشریح قبل ازیں کر چکا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر انسانی عقل و خرد محبّتِ الٰہی کے تحت نہ ہو تو پھر وہ عقل و خرد بالکل بیکار ہے۔ کیونکہ وہ دُنیا تو عطا کر سکتی ہے، دین عطا نہیں کر سکتی، یعنی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی عزّت کے لیے سرفروشی کا جذبہ پیدا نہیں کر سکتی۔ جہاد فی سبیل اللہ کے لیے میدانِ جنگ میں سر سے کفن باندھ کر جانے کا مشورہ نہیں دے سکتی۔

(۴) اگر کوئی شخص، اپنی عقل سلیم کی بدولت اس نتیجہ پر پہنچ جائے کہ ضرور کوئی ہستی ایسی ہے جس نے یہ دُنیا بنائی ہے، تو بھی چنداں فائدہ

---

[1] مثلاً ٹیلیفون، ٹیلیگراف، ٹیلی ویژن، لاسلکی (وائرلیس) ایکس رے ہوائی جہاز، آب دوز، اور ایٹم بمب۔ ۱۲

مرتب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جب تک خرد کے ساتھ مسلمان کا دل اور اُس کی نگاہ یہ دونوں قوتیں بھی مسلمان نہ ہو جائیں اُس وقت تک، وہ مسلمان، حقیقی معنی میں مسلمان یعنی مومن نہیں ہو سکتا واضح ہو کہ مغربی فلسفہ میں دل و نگاہ کی نہ کوئی حیثیت تسلیم کی گئی ہے اور نہ اُن کا ذکر کیا گیا ہے۔ مغربی حکماء دِل کو محض ایک پارۂ گوشت تصوّر کرتے ہیں جس کا کام خون پھینکنا ہے اور بس۔ لیکن اسلام میں دل کا مرتبہ عقل سے بھی بڑھا ہوا ہے۔ جس طرح عقل انسانی زندگی کا مرکز ہے، دل بھی مرکز ہے۔ لیکن جب ہم یہ کہتے ہیں کہ "دل" کی اصلاح کرو، یا دِل مُردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دو بارہ، تو اس وقت دل سے ہماری مراد یہ پارۂ گوشت نہیں ہوتی بلکہ اُس میں جو روحانی قوّتِ مخفی ہے، وہ مراد ہوتی ہے۔ یوں سمجھو کہ جس طرح دماغ بظاہر ایک مضغۂ گوشت ہے، لیکن اُس میں قوّت مدرکہ ایک ناقابل فہم طریقہ سے تصرف کرتی ہے۔ اسی طرح دَل بھی بظاہر گوشت کا لوتھڑا ہی ہے۔ لیکن اس میں بعض روحانی قوتیں مخفی ہیں، جن کا علاقہ اس عالم سے نہیں، بلکہ اُس عالم، یعنی عالمِ لاہوت سے ہے اور انسان کے اخلاق کی اصلاح صرف دل کی اصلاح سے ہو سکتی ہے اسی لیے صوفیائے کرام نے تزکیۂ قلب کو مقدم قرار دیا ہے۔

اللہ نے حضور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی بعثتِ مبارکہ کا سب سے بڑا مقصد یہی قرار دیا ہے کہ آپؐ تزکیۂ نفوسِ انسانی کا بہترین طریقہ دُنیا کو سکھا دیں، تاکہ انسان اللہ سے رابطۂ قلبی پیدا

کر سکے۔ جو مقصدِ حیاتِ انسانی ہے۔ اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کو اللہ نے بندوں پر احسانِ عظیم سے تعبیر فرمایا ہے :-

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ
اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا
مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ
اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ
وَيُعَلِّمُهُمُ
الْكِتٰبَ
وَالْحِكْمَةَ

بیشک اللہ نے مومنوں پر بڑا احسان کیا کہ انہی کی جنس میں سے ان کی اصلاح کے لیے ایک رسولؐ کو مبعوث کیا، جو ان کو اللہ کی کتاب پڑھ کر سُناتا ہے اور ان کا تزکیۂ نفس کرتا ہے، اور اُنہیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔

(سورۂ آلِ عمران)

خود حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں :-

بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ
الْاَخْلَاقَ

میں اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ بہترین قسم کے اخلاق کو پایۂ تکمیل تک پہنچادوں

الحق، انسانی اخلاق کا مرکز چونکہ قلب ہے اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام تر توجہ قلب کی اصلاح پر مبذول فرمائی۔ اس مرکز کی اہمیت کا اندازہ اس حدیث سے ہو سکتا ہے :-

اَلَا اِنَّ فِي الْجَسَدِ لَمُضْغَةً
اِذَا صَلَحَتْ، صَلَحَ
الْجَسَدُ كُلُّهٗ،
وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ
الْجَسَدُ كُلُّهٗ،
اَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ

فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ انسان کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، اگر وہ فاسد ہو جائے تو سارا جسم فاسد ہو جاتا ہے۔ اور اگر اس کی اصلاح ہو جائے تو سارے جسم کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ آگاہ ہو جاؤ کہ وہ (مضغہ) گوشت، قلب ہے۔

غرض اگر عقل کے ساتھ قلب بھی مسلمان ہو جائے۔ یعنی اُس کی بھی قرآنی طریق پر اصلاح ہو جائے تو انسان کامل ہو جاتا ہے۔

اور تیسری چیز نگاہ ہے، یعنی وہ بصیرت یا فراستِ مومنانہ، جو عقل اور دل کے مسلمان ہو جانے کے بعد پیدا ہوتی ہے، اور یہ نگاہ دراصل وہ نور ہے جو مومن کے قلب میں پیدا ہو جاتا ہے۔ یا صحیح تر الفاظ میں جب مومن کے دل کا آئینہ چمکنے لگتا ہے تو اس میں انوارِ الٰہی کا عکس پڑنے لگتا ہے۔ اور اقبال اُسی عکس یا چمک کو نگاہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ پس مومن سب کچھ اُسی کے ذریعہ سے دیکھتا ہے اور پھر سارے علوم اُس پر منکشف ہو جاتے ہیں۔

لہٰذا اقبال یہ کہتے ہیں کہ حقیقی تصوف یہ ہے کہ مسلمان اپنی عقل کے ساتھ ساتھ اپنے دل اور اپنی نگاہ کو بھی مسلمان بنائے۔ اگر اُس نے یہ نہیں کیا، تو پھر کچھ بھی نہیں کیا۔

واضح ہو کہ اُن کو مسلمان بنانے کا طریقہ اقبال نے بالِ جبریل میں بیان کر دیا ہے ؎

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات!

(۵) اے مخاطب! اگر تجھ کو میری گفتگو کچھ عجیب سی یا کچھ پریشان سی معلوم ہو تو حیرانی کی کوئی بات نہیں ہے، وجہ یہ ہے کہ میری گفتگو، میرا پیغام، میری تعلیم، کفر کی تاریکی کو دُور کرنے والی ہے گویا کفر کی رات کے لیے پیامِ صبح ہے۔ اور سب جانتے ہیں کہ جب صبح ہوتی ہے تو دُنیا میں ہر جگہ ہلچل پڑ جاتی ہے، ہر جگہ

حرکت کے آثار نظر آتے ہیں۔ اسی لیے فروغِ صبح کو پریشانی سے تعبیر کیا۔

ہندی اسلام

اس سے پہلے اقبالؔ نے "ہندی مسلمان" کی حالت پر تبصرہ کیا ہے۔ اس نظم میں اُنھوں نے "ہندی اسلام" کا نقشہ کھینچا ہے۔

(۱) جس طرح فرد کی زندگی خورد نوش پر منحصر ہے، اُسی طرح قوم کی زندگی وحدتِ افکار پر موقوف ہے۔ یعنی قوم اُس وقت ترقی کر سکتی ہے، اور حقیقی معنیٰ میں اس پر لفظ قوم کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ جب اس کے تمام افراد ہمخیال ہو جائیں۔ ہمخیال کے بھی دو معنی ہیں، ایک تو یہ کہ عقائد کے لحاظ سے افراد میں افتراق نہ ہو۔ سب لوگ یکساں عقائد کے پابند ہوں، دوسرے معنیٰ یہ ہیں کہ اُن کے سامنے نصب العین بھی ایک ہی ہو۔ اس صورت میں قوم کے تمام افراد ایک ہی طریقہ پر سوچ بچار کرتے ہیں۔ اسی کو وحدتِ افکار کہتے ہیں۔

یہ وحدتِ افکار اس قدر ضروری چیز ہے کہ اگر قوم کے کسی فرد کو، ایسا الہام ہو، جس سے یہ وحدت فنا ہوتی ہو تو وہ الہام بھی مفید نہیں، بلکہ قوم کے حق میں خالص الحاد ہے۔

(۲) واضح ہو کر، وحدت کی حفاظت حکومت کے بغیر ممکن نہیں ہے یعنی قوم کے پاس طاقت ہونی لازمی ہے۔ کہ اگر کوئی فرد اس وحدت کو فنا کرنے کی کوشش کرے تو قوم، طاقت سے کام لے کر اس شخص کی اصلاح کر سکے۔ یعنی پہلے اُسے سمجھائے اور اگر وہ راہِ راست پر نہ آئے تو پھر اُسے قرار واقعی سزا دے سکے۔

ایسے مفسدوں کا علاج عقل خداداد سے ممکن نہیں ہے۔ یعنی اگر اُن سے مناظرہ کیا جائے، تو وہ باز نہیں آ سکتے۔ ان کا علاج صرف ایک ہی ہے کہ طاقت سے کام لے کر ان کا خاتمہ کر دیا جائے کیونکہ جس طرح پورے جسم کی بقا کے لیے ڈاکٹر، ایک اُنگلی کاٹ دیتا ہے۔ اور ہر شخص اس کے اس فعل کو اچھا سمجھتا ہے۔ اسی طرح پوری قوم کی بقا کے لیے ایک شخص کو قتل یا محبوس کر دینا بالکل جائز ہے۔

(۳) اے مسلمان! اگر تجھ میں یہ قوت نہیں کہ تو بزورِ شمشیر اپنی قوم کی وحدت کو برقرار رکھ سکے تو پھر اس کے سوا اور صورت ہی کیا ہے کہ تو کسی غار میں بیٹھ کر اللہ اللہ کیا کرے۔

(۴) یا پھر ایسا اسلام ایجاد کر جس کا تصوف تجھے مسکینی و محکومی اور دائمی مایوسی کی تلقین کرے۔

(۵) مسلمان کو ہندوستان میں جو نماز پڑھنے کی اجازت ہے تو وہ نادان یہ سمجھتا ہے کہ اسلام آزاد ہے۔ حالانکہ اسلام ایک مستقل نظامِ زندگی کا نام ہے۔ اور نماز اس نظام کا صرف ایک جزو ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ انگریز نے مسلمان کو قدرے آزادی دے دی ہے کہ کلب میں جا سکتا ہے، سینما دیکھ سکتا ہے، گھوڑ دوڑ میں

جوا کھیل سکتا ہے۔ ہوٹل میں شراب پی سکتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ لیکن اسلام کو پوری طرح محبوس کر رکھا ہے۔ اگر کوئی مسلمان اسلامی زندگی بسر کرنا چاہے تو اس کی سزا اُسے فوراً ملے گی۔ ایک دن بھی اُس کو آزاد نہیں چھوڑا جائے گا۔ کیونکہ انگریز کی نگاہ میں اسلامی زندگی بسر کرنے سے امن عامہ میں خلل عظیم واقع ہوتا ہے۔ اور اسی فتنہ کی روک تھام کے لیے "سیفٹی ایکٹ" ایجاد کیا گیا تھا۔

غزل

(۱) اے مسلمان! تیرا دل جذبۂ محبت سے خالی ہے۔ اس لیے مُردہ ہے لہٰذا اگر تو دُنیا میں سربلندی حاصل کرنا چاہتا ہے، تو اپنے دل کو زندہ کرلے۔ کیونکہ دنیا میں قوموں کے مرض کہن یعنی غلامی کا علاج صرف یہی ہے کہ وہ اپنے دلوں میں آزادی کا بے پناہ جذبہ پیدا کرلیں۔

جب دل میں کسی شئے کے حصول کی آرزو پیدا ہوجاتی ہے تو گویا وہ زندہ ہوجاتا ہے۔

(۲) مجھے افسوس ہے کہ تیرے دل میں کوئی جذبہ پیدا نہیں ہوتا کوئی اُمنگ نظر نہیں آتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے تجھ پر جادو کر

کے تجھ کو عقل وخرد سے بیگانہ کر دیا ہے۔ جو تو مشکلات اور مصائب سے اس قدر گھبرا جاتا ہے۔

(۳) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تو نے قوانین فطرت کا مطالعہ ہی نہیں کیا۔ تو نے اس پر غور ہی نہیں کیا کہ فطرت کا تقاضہ تو یہ ہے کہ ہر شخص آزاد فضا میں زندگی بسر کرے۔

(۴) اسی لیے میں نے تیری زندگی میں ہلچل پیدا کرنے کا انتظام کیا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تیرے دل میں آزادی کی تڑپ پیدا ہو جائے۔ لیکن تیرے دل میں یہ تڑپ اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب تو میرے کلام کو غور سے پڑھے اور سمجھے اور فطرت کا مطالعہ میرے زاویۂ نگاہ سے کرے۔

دُنیا

(پہلی)

اس نظم میں اقبالؔ نے اس حقیقت کو بیان کیا ہے کہ صرف انسانی خودی کا وجود حقیقی ہے۔ یعنی خودی باقی رہنے والی شئے ہے۔ اور اس کے علاوہ کائنات کی سب چیزیں غیر حقیقی اور فانی ہیں۔ اس نکتہ کی صراحت ضروری ہے۔ کیونکہ انسان بھی فانی ہے بایں معنیٰ کہ اس پر بھی موت وارد ہوگی۔ لیکن انسان اور دوسری چیزوں میں فرق یہ ہے کہ انسان کی خودی باقی رہے گی، دوسری اشیاء مثلاً سورج، چاند، ستارے، پتھر پہاڑ، جواہرات، دریا، آسمان، اور زمین حشرات الارض وحوش و طیور، یہ سب فنا ہو جائیں گی۔

(۱) کہتے ہیں کہ دُنیا میں جو بوقلمونی، یعنی اختلاف ہیئت نظر آتا ہے میں اس کا انکار نہیں کرتا، مثلاً چاند، تارا، پتھر اور نگینہ باہم مختلف نظر آتے ہیں۔

(۲) اور میری بصیرت مجھے یہ بھی بتاتی ہے کہ فلاں شئے پہاڑ ہے فلاں شئے دریا ہے۔

(۳) لیکن جو بات حق ہے میں اُسے پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتا اور وہ سچی بات یہ ہے کہ اے انسان! صرف تو حقیقی معنیٰ میں موجود ہے۔ تیرے علاوہ جو کچھ ہے اس کا وجود حقیقی نہیں ہے۔ صرف تیری خودی باقی ہے۔ یہ دُنیا فانی

ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کا مقصود اس فعل تخلیق کائنات سے صرف یہ ہے کہ تو اپنی خودی کو اُس کے رسول پاکؐ کی غلامی اختیار کر کے مرتبۂ کمال تک پہنچا سکے۔ اور یہ جو کچھ تیرے علاوہ، اس کائنات میں تجھے نظر آتا ہے، یہ سب اِسی مقصدِ عظمیٰ کے لیے پیدا کیا گیا ہے، یہ کوہ و دریا، شمس و قمر، آسمان اور زمین، سب تیرے خدمت گذار ہیں۔ ان کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اگر ہے تو صرف اتنی کہ تو اُن کو اپنی خودی کی تکمیل کے لیے استعمال کرے۔

یہی وجہ ہے کہ تیری خودی باقی ہے، اور یہ ساری کائنات فانی ہے اقبال نے اس خیال کو متعدد مقامات پر مختلف طریقوں سے ظاہر ہے مثلاً بالِ جبریل میں لکھتے ہیں:-

اک تو ہے کہ حق ہے اس جہاں میں
باقی ہے نمودِ سیمائی

گلشنِ راز میں لکھتے ہیں:-

وجودِ کوہسار و دشت و در ہیچ
جہاں فانی، خودی باقی دگر ہیچ

مقصود اقبال کا اس اظہار حقیقت سے یہ ہے کہ اے مسلمان! جب یہ مسلم ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہے وہ نہ ہونے کے برابر ہے، کیونکہ کسی چیز کو ثبات و دوام نہیں ہے۔ آج ہے کل نہیں ہے، تو کس قدر بیوقوفی کی بات ہے کہ تو ان موہوم اشیاء کی طلب میں اپنی تخلیق کے اصل مقصود سے غافل ہو جائے، تجھے اللہ نے اس لیے تو پیدا نہیں کیا کہ تو زَن زَر یا زمین کے حصول میں تضیع اوقات کرکے، اپنی خودی کو تباہ کرے۔ یاد رکھ

دُنیا کی کوئی چیز مومن کے لیے مقصود بالذات نہیں ہو سکتی۔ بیشک وہ شادی بھی کرتا ہے، تجارت بھی کرتا ہے۔ اور مکان بھی بناتا ہے۔ لیکن عورت دولت اور عمارت، ان فانی چیزوں سے دل نہیں لگاتا۔ وہ ان سب کو اپنی خودی کی تکمیل کے لیے استعمال کرتا ہے۔ لیکن اُن کی محبت میں گرفتار ہو کر اللہ سے غافل نہیں ہوتا۔ وہ ہر گھڑی اس صداقت کو پیشِ نظر رکھتا ہے کہ دُنیا اور اُس کی زندگی سراسر دھوکا ہے۔ اور عقل مند وہ ہے جو اس دھوکے میں نہ آئے۔ اور صرف اللہ سے لَو لگائے۔ جہاں کسی مُسلمان نے اللہ کو چھوڑ کر غیر سے دل لگایا، اُسی وقت وہ اپنے مقام سے گر جاتا ہے۔ اور اگر توبہ نہ کرے تو اس کی بربادی بالکل یقینی ہے۔

نماز

(دوسری)

اس دو شعر کی نظم میں اقبال نے نماز کی حقیقت بیان کی ہے۔ یعنی اگر مسلمان سچے دل سے خدا پرستی اختیار کرے تو ساری دُنیا سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ

(۱) اے مسلمان! کفر اور اسلام کی آویزش آدمؑ کے وقت سے چلی آرہی ہے۔ اس لیے کفر (شیطان) ہر زمانہ میں مسلمان کو راہِ راست سے برگشتہ کرنے کے لیے، نئی نئی قسم کے بُت تراشتا رہتا ہے۔ اور ان کو دلفریب شکلوں میں مسلمان کے سامنے پیش کرتا رہتا ہے۔ مثلاً پہلے زمانہ میں لات و منات مشہور بُت تھے، اس زمانہ میں عہدے، مناصب

خطابات، فارن سروس، اور جاگیریں، وہ دلفریب بُت ہیں جو مُسلمان کو صراطِ مستقیم سے برگشتہ کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔

(۲) ان بلند مناصب کے حصول کے لیے، مسلمان اربابِ حکومت کی عیش گاہوں، اور کوٹھیوں کا طواف کرتا ہے، اور جب باریاب ہوتا ہے، تو مسلسل سجدے کرتا ہے اور کبھی کبھی تو برسوں سجدے کرنا پڑتے ہیں، تب کوئی عہدہ ملتا ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ اے مسلمان! اگر تو صرف خدائے واحد کو اپنا معبود اور مسجود بنا لے، اور صرف اُس کے سامنے خلوص سے سجدہ کرے تو میں تجھے یقین دلاتا ہوں کہ تجھے سینکڑوں جھوٹے اور فانی خداؤں کے سامنے سجدہ کرنے سے نجات مل جائے گی۔

لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ تو اس "ایک سجدہ" کو تو بہت گراں سمجھتا ہے۔ اور مجازی خداؤں کے سامنے ہزاروں سجدے کرنا آسان سمجھتا ہے!

"ایک سجدہ" کے معنی ہیں، صرف ایک خدا کو سجدہ کرنا۔

وحی

اس نظم میں اقبالؔ نے وحی کی ضرورت عقلاً ثابت کی ہے کہتے ہیں کہ

(۱) عقل چونکہ بے مایہ ہے، یعنی اسرارِ حیات سے واقف نہیں ہے اس لیے عقلاً ثابت ہے کہ وہ امامت یا رہبری یا رہنمائی کی سزاوار نہیں ہے۔

عقل کا سرمایہ محض ظن وتخمین ہے۔ یعنی قیاس گمان، اندازہ یا اٹکل اور اگر انسان، محض قیاسات پر زندگی بسر کرنے لگے، تو اُس کی [illegible] یقینی ہے۔

مثلاً ہمیں ایک لق ودق صحرا کو عبور کرنا ہے۔ ہم نے قیاس کر لیا کہ اس صحرا (ریگستان) میں کہیں نہ کہیں پانی ضرور ملے گا، اس لیے پانی کا ذخیرہ ساتھ نہیں لیا۔ اتفاق ایسا ہوا کہ پانی کہیں نہ ملا۔ لہٰذا ہماری بربادی (موت) یقینی ہے۔

(۲) اے انسان! تیری عقل بے مایہ ہے، تیری فکر بے نور ہے۔ یعنی تو اکثر اوقات اپنے استنباط اور استخراج میں غلطی کر جاتا ہے۔ اور تیرا جذبِ عمل بے بنیاد ہے۔ یعنی عمل کرنے کے لیے جو جذبہ تیرے اند[ر] پیدا ہوتا ہے، یا جس جذبہ کی بنا پر تو آمادۂ عمل ہوتا ہے، وہ جذ[بہ] کسی مضبوط بنیاد پر قائم نہیں ہے۔ بعض اوقات تو کسی عمل پر راغب ہوتا ہے، لیکن فوراً دوسرا خیال آتا ہے، اور اُس جذبہ کو فنا کر دیتا ہے۔ اور جب عمل کا داعیہ ہی ختم ہو جائے تو عمل کس طرح [ہو] سکتا ہے۔

واضح ہو کہ تمام عقلائے دہر کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ فکر انسانی سے غلطی کا صدور ممکن ہے۔ اس لیے اُنھوں نے منطق کا فن ایجاد کیا، جس کا مقصد ذہن انسانی کو بوقت استدلال و استنباط و استخراجِ مسائل، غلطی سے محفوظ رکھنا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ بڑے بڑے عقل مندوں سے روزمرہ بڑی بڑی غلطیاں سرزد ہوتی رہتی ہیں، اور یہ بات ہر انسان کے تجربہ میں آتی رہتی ہے کہ وہ قیاس کچھ کرتا ہے اور وقوع میں کچھ آتا ہے، پس وحی کی ضرورت ثابت ہے ۱۲

اندریں حالات جبکہ تیری عقل بے مایہ ہے، تیری قوتِ متفکرہ بے نور ہے اور تیرا جذبۂ عمل بے بنیاد ہے۔ زندگی کی تاریک رات کیسے منوّر ہو سکتی ہے؟ یعنی زندگی کے پیچیدہ اور دشوار مسائل کیسے حل ہو سکتے ہیں۔

پس ہم عقلاً اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اگر حیات، اپنے اسرار ورموز کی شرح، خود ہی نہ کرے تو ہمیں کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ فلاں عمل اچھا ہے، فلاں عمل بُرا ہے؟

اگر حیات، خود شرحِ اسرار نہیں کرتی، تو پھر فعل تخلیق انسان، عبث قرار پائے گا۔ یعنی جب کوئی صحیح راہنما نہیں تو انسان، راہِ حیات کس طرح طے کر سکتا ہے؟ تو پھر اُسے پیدا کر کے خُدا نے اُس سے یہ کیوں کہا کہ صراطِ مستقیم پر چل؟ پس ثابت ہوا کہ خود حیات کا تقاضا ہے کہ اُسے ہدایت ملے۔ اور یہ ہدایت جو بعض کامل اور اکمل انسانوں کے واسطہ سے دُنیا کو ملتی ہے، اصطلاح میں وحی کہلاتی ہے۔ اور سرکارِ دوعالمؐ کی ذات بابرکات اس کائنات میں وحی کا سب سے بڑا اور سب سے اعلیٰ سرچشمہ ہے۔

شکست

(پہلی)

اس نظم میں اقبال نے مسلمانوں کو شکست کا حقیقی مفہوم سمجھایا ہے [illegible] ہیں۔ کہ

(۱) صوفی میں جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ بالکل سرد ہو چکا ہے۔ اور اس حرارت کے فنا ہو جانے کا باعث یہ ہے کہ موجودہ دَور کے صوفی کے ذہن میں، بہت سے غیر اسلامی عقیدے راسخ ہو گئے ہیں۔ مثلاً یہ قرآنی آیت :-

اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ ؟ قَالُوْا بَلٰی !	کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں ؟ تو تمام روحوں نے کہا بیشک تو ہمارا رب ہے

جس میں اقرار عبودیت کی صراحت کی گئی ہے۔ جاہل صوفیوں کے لیے بے عملی کا بہانہ بن گئی۔ اس طرح کہ حجرے میں بیٹھے ہوئے خدا کی یاد کی شراب پیتے رہو، یعنی بس حجرے میں بیٹھ کر خدا کو یاد کرتے رہو اور دُنیا سے بے خبر ہو جاؤ۔ اور جب کوئی سوال کرے کہ کیا کرتے ہو تو کہہ دو کہ ہم تو جام الست پی کر، دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو چکے ہیں۔

(۲) یہ تو ہوا موجودہ دَور کے صوفی کا حال۔ اب رہے علماء اور فقہا تو وہ بھی اگرچہ زبان سے رہبانیت کی تردید کرتے ہیں، لیکن عمل اُن کا اسی غیر اسلامی اُصول پر ہے، یعنی جہاد سے وہ بھی جان چُراتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حکومت کے سامنے، کلمہ حق کہنے سے تو آدمی "سیفٹی ایکٹ"[1] کے شکنجہ میں کس دیا جاتا ہے۔

(۳) پس کشمکش حیات سے مسلمانوں کا گریز کرنا دراصل یہی تو شکست ہے ورنہ اگر مومنوں کو بحکم الٰہی کسی معرکہ میں شکست ہو جائے تو وہ

[1] یہ سیفٹی ایکٹ دراصل حکومت برطانیہ نے اپنی سیفٹی کے لیے بنایا تھا، تاکہ ہر مجاہد کو محبوس زنداں کیا جا سکے۔ ۱۲

شکست نہیں[1] ہے۔ اصلی شکست یہ ہے کہ مسلمان، قید و بند، یا جیلخانہ کی سختیوں یا میدان جنگ میں جانے سے جان چُرائے۔ پس مسلمانوں کو لازم ہے کہ وہ اپنے اندر ہمت اور حوصلہ پیدا کریں۔

عقل و دل

(دوسری)

اس نظم میں اقبال نے عقل و دل کے باہمی رشتہ کو واضح کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ :-

(۱) کائنات کی ہر چیز پر خواہ وہ مادی ہو یا غیر مادی، عقل کی حکومت ہے اور دُنیا کی ہر چیز تک عقل کی رسائی ہے۔

(۲) غرض ایک دُنیا، عقل کی غلام ہے، اور اُس کے فرمان کے سامنے سر تسلیم خم کرتی ہے۔ لیکن اس کائنات میں صرف ایک چیز ایسی ہے جو ہر لحظہ اس فرمان روا یعنی عقل سے اُلجھتی رہتی ہے۔ اور اس کے کہنے کے خلاف کرتی رہتی ہے، اور وہ چیز دل ہے۔

مثلاً عقل یہ کہتی ہے کہ دیکھو! ارباب حکومت کی شان میں قصیدہ خوانی کرو، وہ اگر دن کو رات کہیں تو تم یہ کہو بیشک رات ہے، وہ دیکھ لیجیے تارے بھی تو نکلے ہوئے ہیں۔ اُن کے ظلم کو کرم سے تعبیر کرو

[1] جس طرح جنگِ اُحد میں جو مسلمانوں کو شکست ہوئی اُسے ہم شکست تو نہیں کہتے کیونکہ یہی شکست، فتح مکہ کا ذریعہ بن گئی۔ شکست یہ ہے کہ مسلمان ہمت ہار کر بیٹھ جائے یا میدان جنگ میں جانے سے جی چُرائے۔ ۱۲

اُن کی بُرائیوں کو، بھلائیوں کے رنگ میں پیش کرو، تاکہ تمہیں عہدے اور جاگیریں حاصل ہوسکیں۔

لیکن دل کہتا ہے۔ چند روزہ زندگی کے لیے ضمیر فروشی، اور دروغ بافی کرنا مسلمان کا شیوہ نہیں ہے ؎

ملے خشک روٹی جو آزاد رہ کر
وہ خوف وذلت کے حلوے سے بہتر

مستئ کردار

(پہلی)

اس نظم میں اقبالؔ نے مستی کی مختلف صورتیں بیان کی ہیں۔ اور تین موجودہ صورتوں کا بیان کرنے کے بعد چوتھی صورت کے فقدان پر ماتم کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ

(۱) صوفی کی طریقت میں تو فقط مستئ احوال پائی جاتی ہے، اور مُلّا کی شریعت میں فقط مستئ گفتار نظر آتی ہے۔

"احوال" طریقت کی اصطلاح ہے۔ یعنی وہ روحانی منزلیں جو ایک سالک اپنے روحانی عروج کے سلسلہ میں طے کرتا رہتا ہے۔ یعنی صوفی کے یہاں حال ہی حال ہے، اور مُلّا کے یہاں قال ہی قال ہے۔

(۲) اب رہے شعرا تو اُن کے یہاں نری مستئ افکار ہے۔ وہ ہر وقت فکرِ سخن میں مست رہتے ہیں، اور دُنیا سے بے خبر ہیں۔ اُن کی زندگی بیداری اور خواب کے درمیان بسر ہوتی ہے۔ اور اُن کی شاعری

مردہ اور افسردہ اور بے ذوق ہے۔

(۳) الغرض ہماری قوم میں صوفی بھی ہیں، اور مُلّا بھی ہیں اور شاعر بھی ہیں۔ اور سب ماشاءاللہ قابلِ رشک ہیں۔ لیکن کوئی ایسا مردِ مجاہد نظر نہیں آتا، جس کی رگ وپے میں فقط مستئ کردار ہو۔ یہ مستی کی چوتھی قسم ہے۔ اور اسلام یہی مستی پیدا کرنا چاہتا ہے۔ آپ قرآن اور حدیث کا مطالعہ کریں، ہر جگہ یہی نظر آئے گا۔

اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ۙ اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ — یعنی انسان گھاٹے میں ہے۔ مگر وہ لوگ گھاٹے میں نہیں ہیں، جو ایمان لاکر اعمال صالح بجالائیں۔

اللہ اور اُس کے رسولؐ نے ہر جگہ عمل صالح ہی کی تاکید کی ہے۔ اور ساری دینی اور دنیاوی کامیابیوں کو عمل صالح ہی پر موقوف کیا ہے۔ خود حضور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ مسلسل، اور پیہم عمل صالح کی بہترین مثال ہے۔ اور اس بات کے اظہار کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ اقبال کا فلسفۂ خودی اِس کے سوا اور کیا ہے کہ عمل صالح کی مداومت سے خودی کو مستحکم کرو تاکہ خودی اپنے مقام تک پہنچ سکے اسی لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقبال نے اپنے کلام میں قرآن وحدیث کا عطر کھینچ کر دُنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔

قبر

(دوسری)

اس دو شعر کی نظم میں اقبالؔ نے قلندر (مرد مومن) کی ایک خاص

صفت کا بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں۔

(۱) قلندر کو مر کر بھی آرام اور سکون نصیب نہیں ہوتا۔ مرقد کا شبستان بھی اُسے راس نہیں آتا۔ کیوں؟

(۲) قبر میں افلاک کی سی خاموشی تو ہے۔ لیکن اُن کی سی وسعت نہیں ہے اور قلندر چونکہ مردِ آفاقی ہوتا ہے۔ اس لیے اس کا زاویۂ نگاہ بھی نہایت وسیع ہو جاتا ہے۔ چونکہ دنیاوی زندگی میں وہ ساری دنیا پر حکمراں ہوتا ہے، اس لیے قبر کی چند گز زمین بھلا اُسے کیسے راس آ سکتی ہے!

یہ شاعرانہ اندازِ بیان کی بہترین مثال ہے کہ اقبال نے کس خوبی سے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ قلندر کی طبیعت قید اور حد سے نفرت کرتی ہے، کیونکہ اس میں الٰہی صفات کا پرتو ہوتا ہے۔ اور اللہ کی یہ صفت ہے کہ وہ غیر محدود اور لانہایت ہے، للٰذا مومن (قلندر) میں بھی یہی رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔

قلندر کی پہچان

اس نظم میں اقبال نے ہم کو قلندر کی پہچان بتائی ہے۔ واضح ہو کہ اقبال کے کلام میں قلندر، مومن، مردِ حُر، فقیر، مردِ آزاد، مردِ حق آگاہ، خدا مست، اور بندۂ حق، یہ سب مرادف الفاظ ہیں۔ یعنی وہ شخص جس نے رسول اللہ صلعم کی کامل اتباع سے اپنی خودی کو مرتبۂ کمال تک پہنچا لیا ہو۔ اقبال کہتے ہیں کہ قلندر کی پہچان یہ ہے کہ وہ زمان و مکان پر حکمراں ہوتا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ وہ اللہ کا نائب ہوتا ہے اور چونکہ

اللہ زمان و مکان کی قید سے بالاتر ہے، اس لیے وہ بھی بالاتر ہوتا ہے

اقبال نے اس نظم میں اسی نکتۂ عمیق کو شاعرانہ انداز سے واضح کیا ہے۔

(۱) فرماتے ہیں کہ قلندر زمانہ سے یہ کہتا ہے کہ تجھے مردِ مومن کی مرضی پر چلنا ہوگا۔

واضح ہو کہ کفار کا مقولہ یہ ہے کہ

"انسان کو زمانہ کی پیروی کرنی چاہیئے۔"

لیکن مومن کا مسلک یہ ہے کہ

"زمانہ کو مومن کی اتباع کرنی پڑے گی۔"

(۲) قلندر زمانہ سے کہتا ہے: چونکہ میرے ہنگامے تیری طاقت سے زیادہ ہیں، اس لیے مناسب یہی ہے کہ تو میری قیام گاہ سے کترا کر یعنی اپنا دامن بچا کر نکل جا، اگر تو میری زد پر آ گیا، تو میں تجھے اسیر کیے بغیر نہیں چھوڑوں گا۔ تو ساری دُنیا کو اپنا پابند بنا سکتا ہے، لیکن مومن کو اپنا مطیع نہیں بنا سکتا، کیونکہ وہ تو تجھ پر حکمرانی کے لیے پیدا ہوا ہے۔

(۳) میری شان یہ ہے کہ اگر تو چڑھتے ہوئے دریا کی شکل میں میرے سامنے آئے تو میں کشتی اور ملاح کا محتاج نہیں ہوں گا، بلکہ تجھ کو حکم دوں گا کہ تو پایاب[1] ہو جا۔

(۴) کیا میری تکبیر نے تیرے طلسم کو پاش پاش کر دیا! اگر تجھ میں حقائق تاریخ کو جھٹلانے کی جرأت ہو تو جھٹلا دے۔ لیکن میں جانتا

---

[1] چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دریا کو ایسا حکم دیا تھا، اور وہ بحکم الٰہی اُن کے کہنے سے پایاب ہوگیا۔ ۱۲

ہوں کہ تو ایسا نہیں کر سکتا[1]

(۵) قلندر تو تمام عناصرِ کائنات اور اجرام سماوی کا محاسب ہے، سب پر حکمراں ہے۔ اور زمانہ کا مرکب نہیں بلکہ راکب ہے۔ یعنی زمانہ اُس پر حکمراں نہیں ہے، بلکہ وہ زمانہ پر حکمراں ہے۔

نوٹ :۔ اس جگہ شاید کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ اقبال نے یہ نہیں بتایا کہ قلندر یا مردِ مومن، زمان و مکان پر کس طرح حکمراں ہو جاتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جب مومن، اتباعِ شریعت کا اعلیٰ امتحان پاس کر لیتا ہے تو اُس کی خودی میں یہ طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ اب یہ شبہ کہ کیسے پیدا ہو جاتی ہے، بالکل فضول ہے۔ کیونکہ جس کو یہ آرزو ہو۔ وہ اس نسخہ کو آزما کر دیکھ لے۔

فرض کیجیے آپ کسی مرض میں مبتلا ہیں۔ اور اُس کے ازالہ کے لیے آپ کسی طبیب کے پاس جاتے ہیں، وہ آپ سے کہتا ہے کہ اس نسخہ کا اس طریقہ سے استعمال کرو تو تمہارا مرض دور ہو جائے گا۔ لیکن آپ اُس سے کہتے ہیں کہ پہلے منطقی طور پر ثابت کر دو کہ اس نسخہ سے میرا مرض دور ہو جائے گا، تو آپ خود ہی غور کر لیں وہ طبیب، یا دوسرے عقلاء آپ کے متعلق کیا رائے قائم کریں گے؟

جس طرح محض زبان سے یہ کہنے سے کہ ہائیڈروجن اور آکسیجن

[1] حضرت حکیم الامۃ مجدد تھانوی رحؒ روزانہ ڈیڑھ سو خطوط کا جواب اپنے قلم سے تحریر فرماتے تھے۔ اور زندگی میں چھوٹی بڑی ۸۳۵ کتابیں تصنیف فرمائیں اور ہر روز صدہا افراد سے گفتگو فرماتے تھے، اور ساری عمر مواعظ کا سلسلہ جاری رہا۔ کیا یہ "زمان" پر حکومت کا ثبوت نہیں ہے؟ ۱۲

کے ملانے سے پانی بنتا ہے، درحقیقت پانی نہیں بن سکتا جب تک لیبارٹری میں جا کر دونوں گیسوں کو عملی طور پر ملایا نہ جائے، اسی طرح جب تک مرشد کی خانقاہ میں جا کر اُس سے زمان و مکان پر حکمرانی کا طریقہ عملی طور سے حاصل نہ کیا جائے، کوئی شخص محض اس علم سے یا زبان سے یہ بات کہہ دینے سے زمان و مکان پر حکمراں نہیں بن سکتا۔

اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص آپ سے پوچھے کہ بنارسی آم اور مجری آم اور دسہری آم، ان تینوں آموں کی مٹھاس میں کیا فرق ہے؟ تو کیا آپ زبانی طور پر اس فرق کو بیان کر سکتے ہیں؟ یا سائل کی تسلی کر سکتے ہیں؟ یا سائل خود تینوں آموں کی مٹھاس سے واقف ہو سکتا ہے؟ ہرگز نہیں! کیوں؟ اس لیے کہ مٹھاس کا علم مٹھائی چکھنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح زبان و مکان پر حکومت کا علم، ان پر حکومت کرنے سے، بالفاظِ دگر، شانِ قلندری پیدا کرنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ زبانی طور پر کوئی شخص نہیں بتا سکتا کہ قلندر، زمان و مکان پر کیونکہ حکمراں ہو جاتا ہے۔ کیا خوب کہا ہے کسی شاعر نے :۔

ذوقِ ایں بادہ ندانی بخدا تا نچشی

یعنی شراب کی لذت صرف پینے کے بعد معلوم ہو سکتی ہے۔

فلسفہ

اس نظم میں اقبالؔ نے فلسفہ کی حقیقت بیان کی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ فلسفہ عقلی کاوشوں یا موشگافیوں کا دوسرا نام ہے۔ اور وہ

عقل صرف اربابِ جنوں۔ یعنی عاشقانِ حق کے حلقہ میں بیٹھنے سے پیدا ہو سکتی ہے، جو حق و باطن میں امتیاز کر سکتی ہے۔

(۱) کہتے ہیں کہ کالج کے جوانوں کے افکار خواہ وہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ قلندر کی نگاہ سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔

(۲) اے کالج کے مغرب زدہ مسلمان! مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تو کس قسم کے تشکیک آمیز اور الحاد انگیز خیالات میں مبتلا ہے۔ تیرا دماغ تشکوک اور شبہات کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔ کیونکہ میں خود جب کالج میں، کافروں کے مقرر کردہ نصاب[1] تعلیم کا مطالعہ کر رہا تھا، تو اسی قسم کے ناپاک اور غیر اسلامی خیالات کا شکار رہتا تھا۔

(۳) لیکن عقل مند آدمی کبھی لفظی بحث نہیں کرتے، اُن کو تو معنی سے علاقہ ہوتا ہے نہ کہ لفظ سے، جس طرح، غوطہ خور اگرچہ صدف کی تلاش کرتا ہے لیکن اس کا مقصود صدف نہیں بلکہ گوہر ہوتا ہے۔

(۴) پس اگر تجھے معنی کی آرزو ہو، یعنی حقیقت سے آگاہ ہونے کا شوق ہو تو، وہ عقل پیدا کر جو شعلہ اور شرر میں تمیز کر سکے اور یہ عقل کتابوں سے پیدا نہیں ہوتی۔ بلکہ اربابِ جنوں کی سوسائٹی کا ممبر بننے سے حاصل ہو سکتی ہے۔

(۵) جب تجھے اللہ اور رسول ؐ کے عاشقوں کی صحبت کے طفیل میں وہ عقل حاصل ہو جائے گی (اور اُس عقل کو اصطلاح میں نورِ قلب کہتے ہیں) تو پھر تیرا دل جس فلسفہ کی تصدیق کر دے۔ پس وہی صحیح اور موتیوں سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ اور جس عقلی مسئلہ کی تصدیق

---

[1] یہ کافرانہ نظام اور نصابِ تعلیم ابھی تک ہمارے سروں پر مسلّط ہے۔ ۱۲

نہ کرے، وہ غلط ہے، بلکہ مہمل ہے۔

(۶) یاد رکھ! کہ جو فلسفہ خونِ جگر سے نہ لکھا جائے، یعنی جس فلسفہ کو دل کی تائید حاصل نہ ہو وہ یا تو مردہ ہے، یا قریب الموت ہے۔ یعنی وہ کسی توجہ کا مستحق نہیں ہے۔ بالکل غلط ہے اور گمراہی کا باعث ہے خلاصہ کلام یہ ہے کہ مومن کا دل یا نور ایمانی، فلسفہ کی صحت کی کسوٹی ہے۔ صحیح فلسفہ وہ ہے جس کی صحت کی تصدیق "دل" کر سکے۔

مردانِ خُدا

اس نظم میں اقبالؔ نے مردانِ خدا یعنی قلندروں کی شان واضح کی ہے

(۱) کہتے ہیں کہ مردِ حُر کی شناخت یہ ہے کہ اُس کی ضرب کاری ہوتی ہے وہ کفر کے حق میں بلائے بے درماں ہوتا ہے[1]۔ وہ شخص مردِ حُر کا لقب ہرگز نہیں پا سکتا، جس کی حرب و جنگ، تمام عیاری اور مکاری پر مبنی[2] ہو۔

(۲) احرار کی فطرت میں ہمیشہ سے دو شانیں نظر آتی ہیں۔ قلندری اور کلاہ داری، یعنی درویشی اور سلطانی۔

---

[1] قرآن حکیم میں مومنوں کے لیے "اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ" آیا ہے یعنی مومنوں کی شناخت یہ ہے کہ وہ کافروں پر بڑے ہی شدید سخت ہوتے ہیں۔ اُن کے ساتھ مطلق کسی قسم کی رعایت نہیں کرتے۔ ۱۲

[2] انگریزوں کی تمام جنگیں جو اُنہوں نے ۱۷۵۷ء سے لے کر ۱۸۵۷ء تک ہندوستان میں لڑیں، سب کی سب عیاری و مکاری اور دھوکہ پر مبنی تھیں۔ ۱۲

(۳) اور وہ چنگاری، جس سے زمانہ، دنیا میں آفتاب کی طرح چمکاتا ہے۔ اُسی کی خاک میں پوشیدہ ہے۔ یعنی وہ تمام کارنامے جن پر زمانہ فخر کر سکتا ہے ہمیشہ مردانِ حُر ہی نے انجام دیئے ہیں۔

(۴) اور یہی وہ لوگ ہیں جو ہر قسم کی بُت پرستی سے پاک ہیں۔ یہ دُنیا کی کسی طاقت، یعنی کسی بُت کے سامنے سجدہ نہیں کرتے۔ ورنہ سچ تو یہ ہے کہ مُسلم اور غیر مُسلم دونوں ہی بتوں کے سامنے سر جھکاتے ہیں[۱]

کافر و مومن

اس مختصر سی نظم میں اقبالؔ نے کافر اور مومن میں فرق واضح کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ

کل دریا کے کنارے میری ملاقات حضرت خضرؑ سے ہوئی، انہوں نے مجھ سے پوچھا، تو کیا ڈھونڈ رہا ہے۔؟ میں نے کہا "سم فرنگ کا تریاق ڈھونڈ رہا ہوں۔" یعنی انگریزوں نے میری قوم کی ذہنیت کو مسموم (یعنی غیر اسلامی) کر دیا ہے میں یہ چاہتا ہوں کہ اس کا تریاق ہاتھ آ جائے تو اپنی قوم کو از سر نو مسلمان بنا دوں۔

خضرؑ نے جواب دیا کہ میں تجھے ایسا نکتہ بتاتا ہوں، جو تلوار کی طرح کاٹ کرنے والا، صیقل زدہ، اور روشن ہے، اور وہ یہ ہے کہ تو مسلمان کو یہ بتا دے کہ کافر اور مومن میں فرق کیا ہے تاکہ مسلمان اپنے آپ کو مومن

---

[۱] غیر اسلامی حکومت میں اربابِ حکومت کے سامنے ہاتھ پھیلانا بھی بُت پرستی ہے یا اللہ اور رسول کے سوا کسی کی اطاعت کرنا، یہ بھی بُت پرستی ہے۔ ۱۲

بنالے۔ اور جب وہ مومن بن جائے گا تو وہ "سم افرنگ" کا تریاق بھی حاصل کر سکے گا، بلکہ وہ تریاق خود اُس کے اندر پیدا ہو جائے گا۔ کافر اور مومن میں فرق یہ ہے کہ کافر آفاق میں گم ہو جاتا ہے، اور مومن آفاق کو خود اپنے اندر گم کر دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کافر چونکہ توحید الٰہی سے بیگانہ ہوتا ہے، اس لیے کائنات کی ہر چیز کو اپنا معبود، اور مسجود بنا سکتا ہے۔ بلکہ فی الحقیقت بنا لیتا ہے اس لیے اس کی خودی مردہ ہو جاتی ہے۔ اور وہ کائنات کا غلام ہو جاتا ہے۔ آفتاب ماہتاب، دریا، پہاڑ، حیوانات، مثلاً گائے اور تمام چیزوں کو اپنا معبود بنا لیتا ہے۔ اور اُن سے لامحالہ ڈرتا ہے۔ الغرض آفاق میں اُس کی نہ کوئی حیثیت باقی رہتی ہے، نہ وہ آفاق پر حکمرانی کر سکتا ہے۔ حالانکہ خودی اُس وقت اپنے مرتبۂ کمال کو پہنچ سکتی ہے، جب انسان یہ یقین کرے، کہ اس کائنات میں کوئی شئے نہ مجھ پر حاکم ہو سکتی ہے، نہ میں کسی کا غلام ہو سکتا ہوں، حتی کہ کوئی انسان بھی مجھ پر حکومت نہیں کر سکتا۔ صرف اللہ مجھ پر حکمراں ہے۔ اور یہ کائنات میری غلام ہے۔ لیکن اگر انسان خود عناصر کائنات کو اپنا معبود بنالے تو اُس کی خودی مردہ ہو جائے گی۔ اور یہ مطلب ہے آفاق میں گم ہو جانے کا۔

اس کے برعکس مومن، یہ یقین کرتا ہے کہ اس کائنات میں جو کچھ ہے، وہ میری خدمت کے لیے ہے۔ کیونکہ توحید کا مفہوم یہی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی طاقت مجھ پر حکومت نہیں کر سکتی۔ پس مومن کائنات پر حکمرانی کرتا ہے، وہ اطاعتِ الٰہی کی بدولت اپنی خودی کی مخفی طاقتوں کو مرتبۂ کمال تک پہنچا سکتا ہے۔ اور جب خودی اپنے اصلی مقام

یعنی خلافتِ الٰہیہ پر فائز ہو جاتی ہے تو یہ ساری کائنات ، مومن کی مطیع ہو جاتی ہے۔ اور وہ زمان و مکان پر حکمراں ہو جاتا ہے۔ اسی حقیقت کو اقبالؔ نے یوں بیان کیا ہے کہ آفاق مومن کے اندر گم ہو جاتے ہیں۔ یعنی مومن کے مقابلہ میں آفاق کی کوئی حیثیت نہیں رہتی ۔ اور کافر کی حالت یہ ہے کہ آفاق کی طاقتوں کے سامنے اس کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی ۔

مہدئ برحق

اس نظم میں اقبال نے یہ بتایا ہے کہ دُنیا کو کس قسم کے مہدی کی ضرورت ہے۔ کہتے ہیں کہ

(۱) مشرق کی جامد اقوام ہوں ، یا مغرب کی ترقی پسند اقوام ہوں سب کی سب اُن خیالاتِ فاسدہ میں گرفتار ہیں جو خود اُن کی ناقص عقل کے پیدا کردہ ہیں۔ یعنی یہ قومیں صحیح علم یا معرفت حقائق سے محروم اور بیگانہ ہیں۔ اس لیے لامحالہ غلط خیالات میں مبتلا ہیں۔ ان خیالات کا سرچشمہ وحی الٰہی نہیں ہے بلکہ خود اُن کی عقل ہے جو ناقص ہے اور صحیح رہنمائی سے قاصر ہے۔

(۲) پیرانِ کلیسا ، اور شیوخِ حرم ، دونوں اوہام باطلہ میں گرفتار ہیں۔ نہ ان میں تحقیق کا ذوق ہے ، نہ حقیقت پژوہی کا مادّہ ہے۔ یعنی نہ جدّتِ گفتار ہے نہ جدّتِ کردار

(۳) یہی حال اہلِ سیاست اور شعرا کا ہے۔ اہلِ سیاست بھی قدامت پرستی

میں مبتلا ہیں۔ اور شاعر اور ادیب بھی کوئی نیا خیال قوم کے سامنے پیش نہیں کرتے ۔

(۴) آج دنیا کو ایسے مہدی کی ضرورت ہے جو پرانے فرسودہ اور دور از کار خیالات کا قلع قمع کر کے ایسے خیالات پیش کرے جن کی بدولت ، بنی آدم قدامت پرستی ، کورانہ تقلید ، اور جمود کی دنیا سے نکل کر ، تحقیق ، اور انکشاف کی دُنیا میں داخل ہو سکیں ۔

مومن ـــــ (دُنیا میں)

اس نظم میں اقبالؔ نے یہ بتایا ہے کہ مومن کی اِس دُنیا میں کیا شان ہے ، اور جنت میں کیا شان ہو گی ۔

(۱) اس دنیا میں مومن کی امتیازی خصوصیات یہ ہیں کہ وہ دوستوں یعنی برادرانِ ملت کے حلقہ میں تو آبریشم کی طرح نرم (رحمدل) ہوتا ہے۔ یعنی مسلمانوں کے ساتھ نرمی سے پیش آتا ہے اور میدانِ جہاد میں وہی مومن ، فولاد کی طرح سخت ہو جاتا ہے۔

واضح ہو کہ یہ شعر قرآن مجید کی اس آیت سے ماخوذ ہے ، بلکہ اس کا لفظی ترجمہ ہے :-

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ	حضور سرکار دو عالم صلعم ، بلاشبہ اللہ کے رسول ہیں ، اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں ، یعنی آپ کے متبع ہیں ، اُن کی شان یہ ہے کہ وہ کافروں پر سخت

رُحَمَآءُ بَیۡنَہُمۡ	ہیں اور آپس میں ایک دوسرے پر رحیم ہیں۔

(۲) وہ برابر حوادثات عالم کا مقابلہ کرتا رہتا ہے۔ اور اگرچہ وہ خاکی ہے، لیکن خاک سے آزاد ہے۔ یعنی یہ سچ ہے کہ وہ مٹی سے پیدا ہوا ہے فرشتہ یا جن نہیں ہے، لیکن نہ وہ مادہ پرست ہے نہ دنیا پرست ہے نہ پست خیالات رکھتا ہے۔ نہ لذاتِ دنیاوی کا خواہشمند ہے، نہ حریص و طامع ہے۔

(۳) اس کی بلندیٔ نظر کا یہ عالم ہے، کہ وہ چڑیا اور کبوتر کا شکار نہیں کرتا یعنی عہدوں، جاگیروں اور خطابات کا آرزومند نہیں ہے بلکہ بلند مقاصد اپنے سامنے رکھتا ہے۔

(جنّت میں)

جنّت میں مومن کی زندگی اس نہج پر گذرے گی کہ فرشتے بھی اُس کے حُسنِ سیرت سے متاثر ہو جائیں گے اور اُس کی شخصیت کی دلکشی کا اعتراف کریں گے۔ لیکن حوروں کو یہ شکایت ہو گی کہ مومن اپنا بہت کم وقت ہمارے ساتھ گذارتا ہے۔

یہ اقبال کا خاص اندازِ بیان ہے۔ یعنی حوروں کو مومن سے شکایت ہو گی کہ وہ کم آمیز ہے۔ یہ کتنا دلکش اسلوب ہے اس بات کے اظہار کا، کہ مومن اپنا زیادہ تر وقت، غور و فکر، خلوت، اور دیدار الٰہی کی لذت یا اس کے انتظار میں بسر کرے گا۔

۱؎ اسی حقیقت کو اقبال نے اس شعر میں بیان کیا ہے:-

جہاں میں لذتِ پرواز حق نہیں اسکا ٭ وجود جس کا نہیں جذبِ خاک سے آزاد

محمدّ علی باب

(پہلی)

اس نظم میں اقبال نے اپنے مخصوص انداز میں، محمد علی باب کی جہالت کا پردہ چاک کیا ہے۔ اس شخص نے ۱۸۴۴ء میں بمقام طہران (ایران) یہ دعویٰ کیا کہ میں مامور من اللہ ہوں، تاکہ لوگوں کو مہدی مسعود، اور مسیح موعود کے قبول کرنے کے لیے تیار کروں، جو میرے بعد ظاہر ہو گا۔ اسی لیے میں نے باب کا لقب اختیار کیا یعنی میں وہ دروازہ ہوں جس سے مسیح موعود دنیا میں داخل ہو گا۔

جب اس شخص نے ماموریت کا دعویٰ کیا تو ایران کے مجتہد اعظم نے اس کو طلب کیا، اور بہت سے نامور علماء کو جمع کر کے اس سے گفتگو کی:-
شیعہ علماء کے برافروختہ اور مضطرب ہونے کی خاص وجہ یہ تھی کہ اس کے دعویٰ کی زد براہِ راست شیعہ مذہب پر پڑتی تھی۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ شیعہ (اثنا عشریہ) یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ بارہویں امام جن کا نام محمدؑ تھا، تیسری صدی ہجری میں کسی دینی مصلحت کی بنا پر بارہ سال کی عمر میں روپوش ہو گئے اور ہنوز کسی غار یا مخفی مقام میں زندہ ہیں۔ اور بحکم الٰہی، وقت مقررہ پر خروج کریں گے۔ اور شیعان علی کو خلافتِ ارضی عطا فرمائیں گے۔

اب اگر یہ شخص اپنے دعویٰ میں سچا ہے تو پھر شیعہ مذہب بالکل غلط ہے۔ اس لیے شیعہ علماء نے اس سے مناظرہ کیا۔ دوران مناظرہ میں علی محمدؐ باب نے اپنے دعویٰ کی تائید میں قرآن کی بعض آیات بھی پڑھیں۔ لیکن لفظ

"سموات" کے اعراب[1] غلط پڑھے۔ اس کی اس جہالت پر علماء اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکے، اور بات بھی صحیح تھی۔ جو شخص عربی کی عبارت صحیح نہ پڑھ سکے۔ وہ قرآن مجید کی کسی آیت کی تفسیر کیسے کر سکتا ہے۔

مثلاً جو شخص خَلَقَ السَّمٰوٰتِ کو خلق السمٰوٰتَ پڑھے وہ دوسرے لفظوں میں یہ ثابت کر رہا ہے کہ میں عربی گرامر سے بالکل ناواقف ہوں، اور اس قاعدہ سے واقف نہیں ہوں کہ سمٰوٰت کی حالت نصبی کو فتحہ سے ظاہر نہیں کرتے، بلکہ کسرہ سے ظاہر کرتے ہیں۔

القصہ جب باب صاحب نے یہ دیکھا کہ علماء میری جہالت پر متبسم ہیں تو اس نے اپنی خفت مٹانے کے لیے کمال ایمانداری اور خلوص سے کام لے کر برملا کہہ دیا کہ حضرات! افسوس ہے کہ آپ میری جلالتِ شان سے واقف نہیں ہیں روحانیت کے اس بلند مقام پر پہنچ چکا ہوں، جہاں پہنچ کر انسان صَرف و نحو کی پابندیوں سے بالکل بالاتر ہو جاتا ہے۔ بیشک میرے ظہور سے پہلے آپ لوگوں نے قرآنی آیات کو صرف و نحو کی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا، لیکن اب میری امامت کے طفیل میں، آیاتِ قرآنی، اعراب کی پابندی سے آزاد ہو گئی ہیں چنانچہ آج کی تاریخ سے سَمٰوٰتُ، سَمٰوٰتَ، اور سمٰوٰتِ تینوں صورتیں جائز ہیں[2]

---

[1] اعراب سے حرکات ثلاثہ یعنی زبر زیر اور پیش مراد ہیں۔ عربی زبان میں سامی زبانوں کی طرح، اعراب کی صحت بہت ضروری ہے، ورنہ مفہوم کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ مثلاً وَاِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ کے معنی ہیں جب ابراہیم کے رب نے ابراہیم کو آزمایا وَاِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰهٖمُ رَبَّهٗ۔ جب ابراہیم نے اپنے رب کو آزمایا۔ اور یہ کفر ہے ۱۲

[2] واضح ہو کہ نحوی اعتبار سے صرف ایک صورت جائز ہے یعنی تے کے نیچے زیر ۱۲۔

نظم کا مطلب تو ختم ہو گیا۔ ناظرین کی آگاہی کے لیے اس قدر اور لکھے دیتا ہوں کہ اقبال نے باب کا نام محمدؐ علی لکھا ہے۔ لیکن میں نے اکثر کتابوں میں علی محمد پڑھا ہے۔ بہرحال یہ کوئی بات اہم نہیں کیونکہ وہ تو محض "دروازہ" تھا۔ نہ اُسے محمدؐ سے سروکار تھا نہ علی سے نہ وہ محمد علی تھا نہ علی محمد۔

نوٹ:۔ قرۃ العین طاہرہ، ایران کی مشہور شاعرہ اسی باب کی پیرو تھی باب کو ۱۸۵۰ء میں بحکم شاہ ایران گولی کا نشانہ بنایا گیا۔

تقدیر — (ابلیس و یزداں)

(دوسری)

زمان و مکان کے مسئلہ کے بعد اقبال کو تقدیر کے مسئلہ سے بہت زیادہ دلچسپی رہی، چنانچہ اُنہوں نے ان دونوں اہم مسئلوں پر بہت کچھ لکھا ہے۔ اسرارِ خودی مطبوعہ ۱۹۱۴ء سے لے کر ارمغان حجاز، مطبوعہ ۱۹۳۸ء تک ہر کتاب میں ان دونوں مسئلوں پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالی ہے۔ چنانچہ اس نظم میں اُنہوں نے شیخ اکبر حضرت محی الدین المعروف با بن عربیؒ کی شہرۂ آفاق کتاب فصوص الحکم سے مسئلہ تقدیر سے متعلق کچھ مطالب اخذ کرکے، شعر کے لباس میں پیش کیے ہیں۔ بنیادی تخیل تو شیخ کا ہے، اندازِ بیان اقبال کا ہے:۔

نوٹ:۔ شیخ اکبرؒ دنیا کے اُن چند لوگوں میں سے ہیں جن کے خیالات کو ہر صدی میں صرف چند لوگوں نے سمجھا۔ اگرچہ اقبال، شیخ اکبر کے خیالات سے بکلی متفق نہیں تھے۔ لیکن اُنہوں نے ان کی تصانیف کا مطالعہ بہت غور

سے کیا تھا، اور خود ایک مرتبہ مجھ سے کہا تھا کہ دنیا میں چار آدمی ایسے ہیں کہ جو شخص اُن میں سے کسی ایک کے طلسم میں گرفتار ہو جاتا ہے، مشکل ہی سے رہائی پاتا ہے میں نے سراپا اشتیاق بن کر پوچھا، وہ کون کون ہیں! جواب دیا ابن عربی، شنکر آچاریہ، بیدل، اور ہیگل۔

(۱) ابلیس، یزداں سے کہتا ہے کہ اے خالق کائنات مجھے آدم سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ وہ آدم جو زمان و مکان کی قید میں گرفتار ہے۔ بھلا وہ اس قابل ہی کہاں تھا کہ میں اُس مٹی کے پتلے، اُس "زندانیٔ نزدیک و دور" سے دشمنی کرتا!

اور نہ مجھ میں اس قدر جسارت ہو سکتی ہے کہ میں تیرے سامنے صاف لفظوں میں تیرے حکم کی تعمیل سے انکار کرتا[۱] لیکن یہ انکار، جسے اے خدا تو صرف استکبار سے تعبیر کرتا ہے[۲] اس لیے سرزد ہوا کہ تیری مشیت ہی یہ نہ تھی کہ میں آدم کو سجدہ کروں، پس میں کسی طرح قابلِ سرزنش نہیں ہوں۔

اس پر، یزداں، دریافت کرتا ہے کہ یہ راز کہ میری مشیت نہ تھی کہ تو سجدہ کرے، تجھ پر کب کھلا؟ انکار سے پہلے یا بعد میں؟

ابلیس جواب دیتا ہے کہ اے قادرِ مطلق کہ تو وہ ذات ہے کہ تیری صفات کی تجلیات سے وجود (کائنات، ملائکہ، آفاق اور انسان

---

[۱] وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ط اور جب ہم نے حکم دیا فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو تو سب سجدہ میں گر پڑے شیطان کے سوا۔

[۲] اَبٰی وَاسْتَکْبَرَ وَکَانَ مِنَ الْکٰفِرِیْنَ ط اس نے انکار کیا اور تکبر (غرور) کیا اور اس تکبر کی بنا پر کافروں میں شامل ہو گیا۔ ۱۲

وغیرہ) مرتبۂ کمال کو پہنچتا ہے، یہ راز مجھ پر انکار کے بعد واضح ہوا۔

(۲) یزداں، فرشتوں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:۔ ابلیس کی فطرت کی پستی نے اُسے یہ دلیل سکھائی ہے کہ "میں انکار پر مجبور تھا، کیونکہ تیری مشیت ہی یہ نہیں تھی کہ میں سجدہ کروں" اس کی یہ بات بالکل غلط ہے۔ ظالم اپنی آزادی کو مجبوری کا نام دے رہا ہے۔ میں نے اس کو اس معاملہ میں آزادی دی تھی، یعنی اُسے اختیار بخشا تھا، خواہ سجدہ کرے یا نہ کرے۔ یہ ظالم اپنے شعلۂ سوزاں کو خود ہی دھوئیں سے تعبیر کر رہا ہے۔ آگ کو دھواں کہہ رہا ہے اختیار کو جبر سے تعبیر کر رہا ہے۔ یعنی سراسر غلط بیانی کر رہا ہے۔

اے روحِ محمدؐ

اس نظم میں اقبالؔ نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روح پُر فتوح سے استغاثہ کیا ہے کہ

(۱) اے تاجدار مدینہؐ! آپ کی قوم کا شیرازہ بالکل بکھر چکا ہے اس لیے دنیا میں کوئی قوم اس کی عزت نہیں کرتی۔ اب آپؐ ہی فرمائیں کہ آپؐ کے یہ نالائق غلام کہاں چلے جائیں۔

(۲) مسلمانوں میں سرفروشی کا مادہ بالکل باقی نہیں رہا۔ لہٰذا میں اب کس قوم کو جہاد کی تعلیم دوں۔ مسلمان نہ میری تعلیم کو سنتے ہیں نہ سمجھتے ہیں۔

(۳) یہ سچ ہے کہ اس وقت مسلمان بالکل بے سرو سامانی کی حالت میں ہیں۔ نہ اُن کے پاس دولت ہے، نہ تجارت ہے۔ نہ علم ہے۔ اور نہ اُن کے پاس کسی قسم کی مادی طاقت ہے، نہ روحانی قوت ہے۔

یہ بالکل صحیح ہے۔ لیکن بہرحال وہ آپ کا کلمہ پڑھتے ہیں آخر وہ کس
ملک میں چلے جائیں۔؟

(۴) اب وقت آگیا ہے کہ آپ اِس نافرمان اور نالائق قوم پر نگاہِ کرم فرمائیں اور اس کی دستگیری فرمائیں۔ یہ قوم لاکھ بُری سہی، لیکن آپ کی نام لیوا ہے اور اللہ کے کلام پر عامل نہ سہی، اس کی نگہبان تو ہے۔ آخر یہ دُنیا سے نیست و نابود تو ہو نہیں سکتی، کیونکہ آپ کا پیغام ازلی اور ابدی ہے پس للہ اِن پر نگاہِ کرم فرمایئے اور دنیا میں اِن کی باعزت زندگی کا کوئی انتظام فرمایئے!

میں نے حتی المقدور اِس نظم کے مفہوم کو سلیس انداز میں بیان کر دیا ہے لیکن اگر ناظرین اُس سوز و گداز سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں، جو اس نظم میں ہے تو پھر اس کو اقبال ہی کے لفظوں میں پڑھیں۔ جو سوز و گداز اِس مصرع میں ہے۔

ع "اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے"

وہ میرے لفظوں سے ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا۔

مدنیتِ اسلام

اقبال نے اس فلسفیانہ نظم میں مسلمان کی آئیڈیل (مثالی) زندگی کا نقشہ کھینچا ہے۔ اور فی الحقیقت یہ نظم بہت غور سے پڑھنے کے لائق ہے۔

(۱) کہتے ہیں کہ اے مخاطب! کیا میں تجھے یہ بتاؤں کہ ایک سچے مسلمان کی زندگی کیا ہوتی ہے؟ سُن! اس کی چند اہم خصوصیات یہ ہیں:-

مسلمان کی زندگی نہایت اندیشہ اور کمالِ جنون کا امتزاج ہوتی ہے۔ یعنی اِس کی زندگی میں علم اور عشق دونوں دوش بدوش نظر آتے ہیں۔ وہ اپنی عقل کی تربیت بھی کرتا ہے اور اپنے قلب کی مخفی قوتوں کو بھی اُبھارتا ہے۔ بالفاظِ دگر وہ فکر اور ذکر، دونوں کا جامع ہوتا ہے۔

(۲) وہ آفتاب کی طرح، اگر ادھر غروب ہوتا ہے، تو اُدھر طلوع ہو جاتا ہے[۱] وہ اپنی صفات کے لحاظ سے اقوامِ عالم کے مقابلہ میں یگانہ ہے۔ اور اپنی گوناگوں کارفرمائیوں کے لحاظ سے زمانہ کی طرح مختلف شانیں رکھتا ہے یعنی مومن کو ایک حالت پر قرار نہیں ہے۔ وہ ہر روز ترقی کی کوشش کرتا ہے اور مدارج عالیہ طے کرتا رہتا ہے[۲]

(۳) مومن کی زندگی میں نہ تو عصر حاضر کی سی عُریانی فحاشی، اور بے حیائی پائی جاتی ہے۔ اور نہ عہد کہن کی سی روایات پرستی اور ضعیف الاعتقادی نظر آتی ہے۔

(۴) مسلمان کی زندگی کی بنیاد ابدی حقائق پر ہوتی ہے۔ اور وہ زندگی کو حقیقی سمجھتا ہے، یعنی وہ افلاطون کی طرح زندگی اور کائنات کو غیر حقیقی (UNREAL) نہیں سمجھتا۔

نوٹ:- اقبال نے اس شعر میں دُنیائے فلسفہ کے سب سے بڑے

---

[۱] جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے، اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

[۲] واضح ہو کہ اقبال کے فلسفہ میں سکون موت کا دوسرا نام ہے، چنانچہ پیامِ مشرق میں لکھتے ہیں:-

اگر امروز تو تصویرِ دوش است ÷ بخاکِ تو شرارِ زندگی نیست

مسئلہ کی طرف اشارہ کیا ہے جو یہ ہے کہ یہ کائنات حقیقی ہے یا غیر حقیقی ؟ دو ہزار سال سے اس مسئلہ پر طبع آزمائیاں ہو رہی ہیں۔ لیکن ابھی تک فیصلہ نہیں ہو سکا کہ صداقت کس قول میں ہے ؟ اور نہ کبھی ہو سکتا ہے، کیونکہ ؎

انکشافِ رازِ ہستی عقل کی حد میں نہیں
فلسفی یاں کیا کرے ، اور سارا عالم کیا کرے

افلاطون کا مسلک یہ ہے کہ ہماری خارجی دُنیا نقل یا ظل یا پرتو ہے، اُس دنیا کی جو عالمِ مثال میں ہے۔ اصلی یا حقیقی دنیا حواس کی دسترس سے باہر ہے۔ ہم اِس کا ذہن میں تصور کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ خارج میں موجود نہیں ہے۔ اور جو کچھ خارج میں نظر آتا ہے یہ نقل (COPY) یا ظل (SHADOW) یا پرتو (REFLECTION) یا عکس (IMAGE) ہے، حقیقی دُنیا کا۔

افلاطون کہتا ہے کہ اس عالمِ حسی (WORLD OF SENSE) کے علاوہ ایک عالم اور بھی ہے۔ جسے وہ عالمِ مثال (WORLD OF IDEAS) سے تعبیر کرتا ہے۔ کائنات میں جو کچھ نظر آتا ہے۔ یہ حقیقی (REAL) نہیں ہے۔ اِس کی حقیقت یا اصل، اُس عالم میں ہے ؛ مثلاً آدمی کو لے لیجئے اصلی آدم عالمِ مثال میں ہے یہاں اُس آدم کا ظل یا عکس ہے۔ دگر ہیچ

افلاطون کے اِس خیالی فلسفہ نے آگے چل کر بڑے بڑے گُل کھلائے جن کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں۔ کیونکہ میں اس جگہ فلسفۂ افلاطون پر کوئی مقالہ نہیں لکھ رہا ہوں۔ وہ تو

"مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات"

والا مضمون ہو گیا ہے۔ ورنہ اقبال کے اس مصرع ؎

یہ زندگی ہے نہیں ہے طلسمِ افلاطون

میں جو طلسم کا لفظ ہے، وہ ناظرین کی سمجھ میں نہ آتا۔ چنانچہ اب وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اقبال نے افلاطون کے فلسفہ کو لفظ "طلسم" سے کیوں تعبیر کیا ہے۔

بس اتنا لکھنا کافی ہے کہ آگے چل کر اس افلاطونی مسلک نے تہذیب و ثقافت پر جو مضر اثرات مرتب کئے اور مسلمانوں کو اس فلسفہ سے جو نقصان پہنچا، اُسی نے اقبال کو اس فلسفہ کی تردید پر آمادہ کیا۔ چنانچہ اُنہوں نے اسرارِ خودی میں پوری قوت کے ساتھ افلاطونی فلسفہ کی تردید کی ہے۔ اور اس کے علاوہ ہر کتاب میں ضمنی طور پر، اس فلسفہ کی خرابی کو واضح کیا ہے۔

غرض اقبال کہتے ہیں کہ مسلمان کی نظر میں دنیا اور اُس کی زندگی حقیقی ہے دھوکہ، فریب، نقل یا "مایا" نہیں ہے۔ یہی زندگی اصلی اور حقیقی ہے، یہی کائنات اصلی اور حقیقی ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی کائنات ایسی موجود نہیں، جس کی یہ کائنات نقل یا ظل ہو۔

قرآن مجید نے اس دنیا کو یا انسانی زندگی کو غیر حقیقی یعنی موہوم قرار نہیں دیا، بلکہ حقیقی قرار دیا ہے۔

میں نے اس نکتہ کی اس قدر وضاحت اس لیے کی ہے کہ میں اقبال کا وکیل اور شارح ہوں، اور اقبال نے ساری عمر افلاطونی فلسفہ کی تردید کی، کیونکہ وہ اس کو اسلامی تعلیمات کے خلاف یقین کرتے تھے، اور اُن کا یہ عقیدہ تھا کہ اس فلسفہ نے مسلمانوں کی قوتِ عمل کو مفلوج کر دیا۔

آخر میں اقبال، مسلمانوں کی زندگی کے عناصرِ ترکیبی کا ذکر کرتے ہیں۔

(۵) کہ مسلمان کی زندگی میں تین چیزیں پائی جاتی ہیں :۔

روح القدس کا ذوقِ جمال، عجم کا حسنِ طبیعت، اور عرب کا سوزِ دروں،

اس کی تشریح یہ ہے کہ جس طرح روح القدس، جمال یعنی نیکی، پاکیزگی اور

خیر و برکت کا ذوق رکھتی ہے۔ اسی طرح مسلمان بھی نیکی پاکیزگی اور اچھی بات کی طرف راغب ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ متقی ہوتا ہے۔

ایران کے لوگ جس طرح ذہنی اعتبار سے سر برآوردہ ہیں اسی طرح مسلمان بھی علم و فن کا دلدادہ ہوتا ہے۔ اور جس طرح عربوں نے سرکارِ دوعالمؐ سے عشق کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا تھا، یا جس طرح عربوں میں محبت اور ایثار کا مادہ ہے، اسی طرح مسلمان کا دل بھی جذبۂ عشق رسولؐ سے سرشار ہوتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ مسلمان وہ ہے، جو متقی ہو، طالبِ علم ہو، اور عاشقِ رسولؐ ہو۔

نوٹ:۔ روح القدس کے دو معنیٰ ہیں:۔

(۱) عیسایوں کی اصطلاح میں روح القدس تین خداؤں میں کا تیسرا خدا ہے۔ جو باپ اور بیٹے سے صادر ہوتا ہے۔

(۲) مسلمانوں کی اصطلاح میں روح القدس تائید غیبی، یا توفیق الٰہی کو کہتے ہیں۔ چنانچہ قرآن حکیم میں وارد ہے۔ کہ

وَاَیَّدۡنٰهُ بِرُوۡحِ الۡقُدُسِ۔ اور ہم نے روح القدس سے اس کی تائید کی۔

امامت

اس دلکش نظم میں اقبالؔ نے امامت کی حقیقت بیان کی ہے۔ کہتے ہیں کہ:۔

(۱) تو مجھ سے دریافت کرتا ہے کہ امامت کی حقیقت کیا ہے؟ میں تیرے حق میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تجھے بھی میری طرح فہم حقائق سے بہرہ ور کردے، سُن!

تیرا صحیح اور سچا امام وہ ہے۔ جس میں حسبِ ذیل صفات پائی جائیں۔

(۲) وہ تجھے حاضر و موجود سے بیزار کر سکے۔ یعنی تجھے عصرِ حاضر، اور اس کی خرابیوں سے متنفر کر سکے۔ اس کے علاوہ تجھ کو تیری موجودہ غیر اسلامی زندگی سے بھی بیزار کر سکے۔ حاضر و موجود سے مراد ہے، موجود غیر اسلامی ماحول۔

(۳) وہ تجھے یہ سمجھا سکے، یا اس حقیقتِ کبریٰ کو تیرے دل و دماغ میں اُتار سکے کہ محبوبِ حقیقی سے ملاقات کا آسان ترین طریقہ شہادت ہے۔ لہٰذا وہ تجھ کو شہادت کا اس قدر تمنائی بنادے کہ تجھے جینا دوبھر ہو جائے۔[۱]

(۴) اور تجھے اس حقیقت سے آگاہ کر سکے کہ اس غلامی سے تیرا کس قدر نقصان ہو رہا ہے، یعنی تو سراسر گھاٹے میں ہے۔ کیونکہ غلامی میں تو اپنی خودی کی تربیت نہیں کر سکتا۔ اور اس طرح وہ تیرے اندر غیر اسلامی نظام کا تختہ اُلٹ دینے کا جذبہ پیدا کر دے، اور تیرے اندر شانِ فقر پیدا کر سکے، تاکہ تو تلوار کی طرح باطل کو کاٹ کر رکھ دے اور ہر طاغوت کا مقابلہ کر سکے۔

(۵) یہ تو ہوئیں حقیقی اور سچے امام کی صفات، یعنی مسلمانوں کا امام وہ ہے۔ جو ان میں جہاد کی روح پیدا کر سکے اور ان کے دل میں اس صداقت کو اُتار دے کہ اسلام، ملوکیت کا شدید دشمن ہے۔ اسلامی نظام میں سلاطین اور آمرین (DICTATORS) کی مطلق گنجائش نہیں ہے۔ اور جو شخص مسلمانوں کو اللہ اور رسولؐ کے نافذ کردہ قانون کے بجائے، اپنے

---

[۱] اس شعر کا اُسلوبِ بیان اور طرزِ ادا ایسی دلکش ہے کہ صرف صاحبِ ذوقِ سلیم آج اس کی داد دے سکتا ہے۔ ۱۲

قانون کی اطاعت پر مجبور کرے، وہ اسلام کا دشمن ہے، مسلمانوں کا دشمن ہے، اور اس کے خلاف جہاد کرنا لازم ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص مسلمانوں کی امامت کا مدعی ہو اور اُس کا طرزِ عمل یا تعلیم ایسی ہو کہ وہ مسلمانوں کو سلاطین کا پرستار بنانا چاہتا ہو، اور یہ کہتا ہو کہ انگریزوں کے خلاف جہاد بالسیف جائز نہیں ہے، تو وہ شخص مسلمانوں کا امام نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کی امامت، ملتِ اسلامیہ کے حق میں ایک فتنہ ہے
نوٹ:۔ اللہ مسلمانوں کو ایسے ائمہ سے محفوظ رکھے۔ اور پاکستان کو اُن کے وجود سے پاک کر دے۔

فقر و راہبی

اس نظم میں اقبال نے فقر اور رہبانیت کا فرق واضح کیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ فقر ایک اسلامی اُصول ہے۔
اور رہبانیت ایک غیر اسلامی اُصول ہے۔

(۱) فرماتے ہیں کہ اے مخاطب! اگر تو فقر اور راہبی کو ایک ہی بات سمجھتا ہے تو پھر تو مسلمان نہیں ہے، بلکہ کسی اور مذہب کا پیرو ہے۔ کیونکہ اسلامی تعلیمات کی رو سے فقر اور رہبانیت ایک دوسرے کی ضد ہیں۔
چنانچہ حضور انورؐ ارشاد فرماتے ہیں۔ لَا رُھْبَانِیَّۃَ فِی الْاِسْلَامِ اب دونوں میں فرق دکھاتے ہیں۔

(۲) فقیر وہ ہے، جو راہبوں کی عُزلت گزینی اور گوشہ نشینی سے سخت بیزار

ہو، فقیر کی زندگی تو سراپا ہنگامہ اور سراسر انقلاب ہوتی ہے[۱] اس کی کشتی ہمیشہ طوفان کا مقابلہ کرتی ہے۔

(۳) فقیر (راہبوں کے اُصولِ حیات کے خلاف) تو ہمیشہ اپنی روح اور اپنے بدن کی میدانِ جنگ میں نمائش کرتا رہتا ہے۔ یعنی وہ راہبوں کی طرح جنگلوں میں خلوت کی زندگی بسر نہیں کرتا۔ فقیر روح و بدن کی نمود پر مجبور ہے۔ اس لیے کہ:۔

ہے نہایتِ مومن، خودی کی عریانی

یعنی مومن کی معراج یہ ہے کہ اس کی خودی اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ عُریاں ہو جائے۔
نوٹ:۔ تہذیبِ مغرب کا طغرائے امتیاز یہ ہے کہ وہ انسان کے جسم کو عُریانی پر مائل کرتی ہے۔ اور تہذیبِ اسلام یعنی فقر کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسان کی روح کو عریانی کی طرف راغب کرتی ہے۔
عریانی کا مفہوم یہ ہے کہ فقر، خودی کے محاسن کی نمائش کرتا ہے، جس طرح کفر، جسم کے محاسن کی نمائش کرتا ہے[۲]
الغرض مومن کے روحانی کمالات کی انتہا یہ ہے کہ اُس کی خودی اپنی پوری قوت کے ساتھ، منظرِ عام پر آجائے، اور وہ منظرِ عام عموماً میدانِ جہاد ہی ہوتا ہے۔

---

۱ چنانچہ سلطان ٹیپو شہیدؒ جب تک زندہ رہا، کافروں سے مسلسل لڑتا رہا۔ یعنی اپنی اسلامی خودی کا جلوہ، دنیا کو دکھاتا رہا۔۱۲

۲ یورپ میں جو عورتیں عُریانی کی طرف مائل ہیں اُس کی وجہ یہی تو ہے کہ وہ اپنے جسم کی خوبصورتی کی نمائش چاہتی ہیں، اسی طرح فقیر، اپنی خودی کے کمالات کی نمائش چاہتا ہے۔

(۴) فقیر کی شخصیت، کائنات کی ہر شئے کو پرکھنے کی کسوٹی ہوتی ہے۔ اس کے دو معنیٰ ہیں۔ پہلا معنیٰ یہ ہے کہ فقیر کی شخصیت، معیارِ خیر و شر بن جاتی ہے[1] نیک کام یا نیکی وہ ہے، جسے فقیر یا مومن نیکی قرار دے (نہ وہ جسے انگریز یا دوسرے کفّار نیکی قرار دیں) دوسرا معنیٰ یہ ہے کہ صرف فقیر یا مومن ہی اس حقیقت سے آگاہ ہوتا ہے۔ کہ اس عالمِ رنگ و بو میں کون سی چیز باقی یعنی لائقِ اختیار ہے، اور کونسی چیز فانی اور اس لیے قابلِ ترک ہے۔ دُنیا میں لوگ جس غلطی میں مُبتلا ہیں وہ یہ ہے کہ باقی اور فانی میں امتیاز نہیں کر سکتے اسی لیے اکثر مسلمان اپنی جہالت کی بناء پر، باقی کو چھوڑ کر فانی اشیاء کے حصول میں اپنی زندگیاں برباد کر دیتے ہیں، لیکن فقیر یا مومن جانتا ہے کہ سرکاری عہدے، دولت، ثروت، عورت، باغات اور محلات یہ سب فانی ہیں، اس لیے اس لائق نہیں کہ ان کو مقصودِ حیات بنایا جائے۔

(۵) صرف فقیر ہی مجھ کو بتا سکتا ہے کہ یہ جو کچھ مجھے نظر آتا ہے، یہ جہان (بمعنی پائدار ہستی) ہے، یا فقط رنگ و بو کی طغیانی ہے۔ یعنی حُسن و جمالِ نسواں دولت، محلات، باغات، خطابات اور جاگیریں یہ سب محض فانی اور عارضی چیزیں ہیں، بلکہ فریب نظر ہیں۔ ان میں سے کسی کو ثبات نہیں ہے۔

(۶) مسلمان نے جب سے یہ فقر کھو دیا، وہ دنیا میں بالکل ذلیل و خوار ہو گیا نہ اُس کے پاس دولتِ سلمانی رہی، نہ دولتِ سلیمانی۔

دولتِ سلمانی سے مراد ہے حضرت سلمان فارسیؓ کی پاکیزہ اسلامی سیرت

[1] لوگ کہتے ہیں :- "بجا کہے جسے عالم اُسے بجا سمجھو"
اقبال کہتے ہیں :- "بجا کہے جسے مومن اُسے بجا سمجھو"

یعنی تقویٰ، اور دولتِ سلیمانی سے مراد ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السّلام کی سی سلطنت اور حکومت۔

غزل

یہ دلکش غزل حقائق و معارف سے لبریز ہے۔

(۱) فرماتے ہیں کہ تو (مغرب زدہ مسلمان) فلسفہ اور سائنس کی لذّت اور سرور کو اپنی متاعِ حیات سمجھتا ہے۔ لیکن میں (سچا مسلمان) اپنے دل کو جس میں سرکار دو عالمؐ کی محبت ہے، اپنی زندگی کی پونجی یقین کرتا ہوں۔

(۲) اہلِ فکر (جو عقل کو رہنما سمجھتے ہیں)، جو معجزہ دنیا کو دکھا سکتے ہیں۔ وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ ایسا پیچیدہ فلسفہ دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں جو نہ تو پیچیدہ مسائل کی گرہ کشائی کرتا ہے، نہ مشکلاتِ زندگی میں رہنمائی کرتا ہے۔ لیکن اہلِ ذکر (جو عشق کو رہنما سمجھتے ہیں)، جو معجزہ دُنیا کو دکھا سکتے ہیں، وہ یہ ہے کہ ایک اللہ کے بندہ نے فرعون جیسے صاحب سطوت بادشاہ کو شکست دے دی تھی اور کوہ طور پر اللہ سے ہمکلامی کا شرف حاصل کیا تھا۔

(۳) اے کالج کے نوجوان! میں نے تجھے مصلحتاً مسلمان کہہ دیا، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ تو مسلمان نہیں ہے، کیونکہ مسلمان کی شناخت یہ ہے کہ اُس کے نفس میں تو قیامت کی گرمی ہوتی ہے، اور تیرا دل تو برف کی قاش ہے۔

نوٹ :- گرمی سے مراد، دین کے لیے غیرت اور حمیت ہے ۱۲

(۴) اے مسلمان! میں تو مدتوں سے ملّتِ اسلامیہ کی تباہی پر نوحہ کر رہا ہوں۔ اور غم کے مارے دیوانہ ہو گیا ہوں، لیکن تو بدستور عیش و عشرت کر رہا ہے تو اس میں میرے جنوں کا کیا قصور ہے؟ یعنی اسلام کا کیا قصور؟ اسلام تو

غیرتِ ملی کا درس دیتا ہے۔ لیکن اگر تو اُس درس سے کوئی فیض حاصل نہ کرے تو یہ اسلامی تعلیمات کا قصور تو نہیں ہو سکتا۔

(۵) اے مسلمان! اگر تو بزرگوں سے کچھ فیض حاصل کرنا چاہتا ہے تو اُن کی خدمت میں ادب کے ساتھ حاضر ہو، اور ادب کے ساتھ گفتگو کر۔ (کالج کی تعلیم نے تجھ کو آداب بزرگانِ دین سے بیگانہ کر دیا ہے) کیونکہ بزرگوں کے سامنے مہمل اور غیر مربوط یا مادہ پرستانہ اور دنیاوی گفتگو کرنی بالکل نازیبا ہے۔

(۶) آخر میں اقبال ایک مژدہ جانفزا سناتے ہیں کہ وہ قوم، دنیا میں کبھی خوار نہیں ہو سکتی، جس کے عشق میں بہادری، اور فقر میں غیرت کا رنگ ہو عشق سے مراد عشقِ رسول ہے۔ اور فقر سے مراد ہی ذکر و فکر کا اختلاط ہے، جس کا بیان اس سے پہلے مفصل ہو چکا ہے۔

تسلیم و رضا

اس نظم میں اقبالؔ نے تسلیم و رضا کی حقیقت واضح کی ہے کہ اس کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ انسان عمل سے غافل ہو جائے یا کوشش سے باز آجائے۔ حقیقت یہ ہے کہ عام طور سے مسلمانوں میں تسلیم و رضا کا یہ مفہوم جاگزین ہو گیا ہے کہ بس اللہ کی مرضی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دو۔ اور خود کوئی کوشش نہ کرو۔ اقبال کہتے ہیں کہ تسلیم و رضا کا مفہوم یہ ہے کہ انسان ہر معاملہ میں اپنے مقدور کے مطابق کوشش کرے اور جب حتی الامکان کامیابی کے تمام ذرائع جمع کرے تو حصولِ مقصد کے لیے جدوجہد کرے۔ اس کے بعد نتیجہ اللہ کے ہاتھ میں چھوڑ دے

اگر ناکامی ہو تو سچے مسلمان کی طرح مایوس یا رنجیدہ نہ ہو، بلکہ اللہ کی مشیت کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے۔ یعنی اُس کی مرضی نہ تھی کہ کامیابی ہو۔

(۱) پودوں کے نشو و نما پر غور کرنے سے یہ نکتہ پیچیدہ واضح ہو سکتا ہے۔ کہ نباتات کو بھی یہ احساس ہے کہ فضا بہت وسیع ہے، اس لیے ہمیں نشو و نما کے لیے یعنی اپنے پھیلنے اور شاخوں کو بڑھانے کا موقع حاصل ہے۔

(۲) چنانچہ کوئی دانہ زمین کے اندر پڑے رہنے پر قناعت نہیں کرتا۔ بلکہ ہر دانہ میں زمین سے باہر نکلنے اور پھلنے پھولنے کا جذبہ کار فرما ہے، اور وہ برابر عمل میں مصروف رہتا ہے۔ یعنی کوئی دانہ یہ نہیں کہتا کہ مجھے عمل کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر خدا کی مرضی ہو گی تو مجھے نشو و نما حاصل ہو جائے گا۔

(۳) پس اے انسان! تو نباتات سے سبق سیکھ۔ تیری فطرت کا تقاضہ یہ ہے کہ تو سرگرم عمل رہے۔ اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے کوشش کرتا رہے۔ تسلیم و رضا کا مقصود یہ نہیں کہ تو ہاتھ پاؤں توڑ کر حجرہ میں بیٹھ جائے۔ بلکہ اس بلند روحانی اصول کا فلسفہ یہ ہے کہ تو ہر معاملہ میں پہلے اپنی سی کوشش کر، پھر نتیجہ خدا کے ہاتھ میں چھوڑ دے۔ یعنی سرِ تسلیم خم کر مگر عمل کرنے کے بعد۔

(۴) یاد رکھ کہ اگر تیرے اندر ترقی کرنے کا جذبہ موجزن ہے، تو عمل کے لیے میدان کافی وسیع ہے۔ اے اللہ کے بندے! یقین رکھ کہ اللہ کی زمین بہت وسیع ہے۔

نکتۂ توحید

اس نظم میں اقبالؒ نے توحید کے فضائل، اور اس پر عامل ہونے کے نتائج، گو بڑے دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔ اس نظم میں حقائق نگاری اور شاعری دونوں کا ایک خوشگوار امتزاج نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس نظم کا مفہوم تو اپنے لفظوں میں بیان کر سکتا ہوں، لیکن نثر میں اِس کی دلکشی اور طرزِ ادا کو ظاہر نہیں کر سکتا۔

(۱) فرماتے ہیں کہ نکتۂ توحید کوئی ایسا پیچیدہ منطقی مسئلہ نہیں ہے کہ میں بیان نہیں کر سکتا، یا تو سمجھ نہیں سکتا۔ اس کا بیان بھی آسان ہے اور اس کا سمجھنا بھی آسان ہے۔ مثلاً اس بات کو سمجھنے کے لیے نہ منطق درکار ہے نہ فلسفہ، نہ کلام کہ اللہ کے سوا اس کائنات میں نہ کوئی اور معبود ہے نہ فرمانروا، نہ حاکم، نہ آمر، نہ خالق، نہ مالک، نہ رازق، نہ دستگیر، نہ مُشکل کشا، نہ حاجت روا، اُس کے سوا نہ کوئی شخص مجھے نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان۔ اُسی کے حکم سے تو پیدا ہوا ہے، اور اُسی کے حکم سے تو وفات پائے گا۔ اُس کا کوئی شریک نہیں، نہ ذات میں نہ صفات میں، نہ اختیار اور حکمرانی میں، نہ عبادت میں۔ سب کو اُس کی احتیاج ہے، لیکن اُسے کسی کی احتیاج نہیں۔ بلکہ وہ ہر قسم کی احتیاج سے پاک ہے، اور کوئی اُس کا مدِ مقابل نہیں ہے۔ یہ اسلامی عقیدۂ توحید کا خلاصہ ہے۔ اور اِس کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہو سکتی۔ اس کے سمجھنے کے لیے کسی ڈگری یا علمی فضیلت یا فلسفہ دانی کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ حضور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جن لوگوں کے سامنے اس عقیدہ کو پیش کیا تھا وہ

نہ کسی مدرسہ کے فارغ تھے، اور نہ کسی یونیورسٹی کے گریجویٹ تھے۔ نہ منطق جانتے تھے نہ فلسفہ سے آگاہ تھے۔ اِس کے باوجود وہ لوگ بآسانی اس نکتہ کو سمجھ گئے۔ اور اُنھوں نے اِس کی بدولت دُنیا میں انقلاب برپا کر دیا۔ لیکن اے موجودہ زمانہ کے مسلمان! تیرے دماغ میں تو ایک دو نہیں سینکڑوں بُت جاگزیں ہیں، بالفاظِ دگر تیرا دماغ مجسّم بت خانہ بنا ہوا ہے۔ مثلاً حُبِّ جاہ کا بُت، حصُولِ زر کا بُت، حصولِ مناصب کا بُت وغیرہ وغیرہ۔ الغرض جب تیرے دماغ کی یہ کیفیت ہے تو نہ میں سمجھا سکتا ہوں، نہ تو سمجھ سکتا ہے۔

(۲) کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ میں "رمزِ شوق" پوشیدہ ہے یعنی جب مسلمان اس کلمۂ طیّبہ کے مفہوم پر غور کرتا ہے تو اُس پر یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ چونکہ کائنات میں اللہ کے سوا کوئی ہستی اس لائق نہیں کہ اس کو اپنا معبود یا مسجود بنایا جائے۔ نیز یہ کہ اللہ ہی وہ ذات ہے، جو ہر نوع کے عیب نقصان، نقص، کمزوری، ضعف، بُرائی، اور احتیاج سے پاک اور منزّہ ہے۔ اور ہر قسم کے کمالات، محاسن اور خوبیوں اور نیکیوں کا منبع ہے اس لیے اللہ کے سوا کوئی ہستی اس قابل نہیں کہ اُسے اپنا مقصود اور مطلوب اور محبوب بنایا جائے۔ اور جب یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے، تو بندہؔ کے دل میں اُس سے محبت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اِسی جذبہ کو اقبالؒ نے "رمزِ شوق" سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص توحید کے اِس دلکش پہلو کو نظر انداز کر کے، ظاہر پرست فقہاء کی طرح صرف منطقی طور پر خدا کو ایک مان لے اور اس سے محبّت کا جذبہ اپنے دل میں پیدا نہ کرے تو وہ اِس "رمزِ شوق" کو کیا سمجھ سکتا ہے؟

(۳) جب ایک مومن جذبۂ عشق الٰہی سے سرشار ہوکر، میدانِ جنگ میں اللہ کے نام کو بلند کرنے کے لیے، اور کفر کو مٹانے کے لیے جہاد کرتا ہے تو اُس کو اس فعل میں ایسی لذت حاصل ہوتی ہے کہ تمام دنیا کی لذتیں اس کے سامنے ہیچ ہیں۔ لیکن اگر کسی شخص میں جہاد فی سبیل اللہ کا حوصلہ ہی نہ ہو، یعنی اللہ اور اُس کے رسول ؐ سے محبت ہی نہ ہو تو وہ اِس لذت کا احساس کیسے کرسکتا ہے۔ اور وہ اس سرور کی کیا قدر کرسکتا ہے؟

(۴) جو شخص اللہ کی محبت میں فنا ہوکر حقیقی حریت کے مقام پر سرفراز ہوجاتا ہے، وہ اس کائنات کی بڑی سے بڑی طاقت کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اور دُنیا کے بڑے سے بڑے سلاطین کو اپنے سامنے ہیچ سمجھتا ہے۔ بلکہ وہ یہ مشاہدہ کرتا ہے کہ اللہ کے سوا مجھ پر کوئی حکمرانی کے لائق ہی نہیں۔ یہ ساری کائنات میری خادم ہے۔ لیکن جو شخص اپنے ہی جیسے انسانوں کا غلام ہو، اور اُن کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتا ہو، وہ بندۂ حُر کے مشاہدات سے کیسے بہرہ اندوز ہوسکتا ہے؟

(۵) مقامِ فقر (جس کی تشریح قبل ازیں ہوچکی ہے) بادشاہی سے بدرجہا زیادہ بلند ہے، کیونکہ وارثِ فقر، دراصل خلیفۃ اللہ علی الارض ہوتا ہے۔ اور دنیاوی بادشاہ اس کے سامنے لرزہ براندام رہتے ہیں۔ لیکن اگر کسی شخص کی طرزِ حیات گدایانہ ہو، یعنی اگر وہ دوسرے انسانوں کے سامنے دستِ سوال دراز کرتا ہو، اور ان کو اپنا حاجت روا سمجھتا ہو، تو وہ مقامِ فقر کی بلندی اور عظمت کا کیا اندازہ کرسکتا ہے؟

الہام اور آزادی

اس دلفریب نظم میں اقبالؔ نے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ صرف بندۂ حُر (مومن) کا الہام، انسانوں کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ جو شخص غیر اللہ کا غلام ہو، اگر وہ صاحبِ الہام ہونے کا مدّعی ہو تو اس کا الہام انسانوں کو نفع کے بجائے نقصان پہنچاتا ہے۔ بلکہ وہ ایک رہزن ہے جو مسلمانوں کی متاعِ ایمان کو لوٹنا چاہتا ہے۔

(۱) اگر مردِ مومن صاحبِ الہام ہو، یعنی مجدّد یا مصلح ہونے کا مدعی ہو تو اُس کی صداقت کا معیار یہ ہے کہ اس کی نگاہ، مسلمانوں کی قوتِ فکر اور قوّتِ عمل کے لیے مہمیز کا کام دیتی ہے۔ یعنی وہ مسلمانوں میں صحیح عقائد اور جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ پیدا کردیتا ہے۔

(۲) اور اس کی صحبت میں بیٹھنے سے دل میں دین کے لیے غیرت اور اللہ اور اُس کے رسول ؐ پر مرمٹنے کا جذبہ پیدا ہوجاتا ہے۔

(۳) وہ کمزور (بلبل صفت) انسانوں میں قتال (شاہین) کی اُمنگ پیدا کردیتا ہے۔ یعنی مسلمانوں کی ذہنیت میں انقلاب برپا کردیتا ہے۔ اس کی تلقین سے غیر اللہ کا خوف دلوں سے نکل جاتا ہے۔ یعنی وہ مسلمانوں کو مجاہد فی سبیل اللہ بنا دیتا ہے۔

(۴) مختصر یہ کہ اُس مردِ خدا آگاہ اور خدا مست کی صحبت، مسلمانوں کو دُنیا اور دین دونوں میں سروری عطا کردیتی ہے۔ گداؤں کو جمشید اور پرویز کا مرتبہ حاصل ہوجاتا ہے۔

(۵) لیکن محکوم کے الہام سے اللہ ہر مسلمان کو محفوظ رکھے۔ کیونکہ وہ چنگیز اور

ہلاکو کی طرح قوموں کے ایمان پر ڈاکہ ڈالتا ہے اور اُس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص خود کافروں کی غلامی سے نہیں نکل سکتا بلکہ اُن کی تعریف کرتا ہے، وہ دوسروں کو اُن کی غلامی سے کب اور کیونکر رہائی دلا سکتا ہے

ع او خویشتن گم است، کرا رہبری کند

جان اور تن

(پہلی)

یہ ایک مشکل فلسفیانہ نظم ہے۔ اور انہی نظموں کی بنا پر میں نے مقدمہ میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ضربِ کلیم میں شاعری کم ہے، فلسفہ زیادہ ہے۔ چنانچہ اس نظم کو دیکھنے سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ اور اسی لیے ہم اقبال کو فلسفی شاعر نہیں، بلکہ شاعر فلسفی کہتے ہیں۔ یعنی ایسا فلسفی جس نے شعر کو اپنے فلسفہ کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہو۔ اور فلسفی شاعر وہ ہے جس کا اپنا کوئی فلسفہ نہ ہو، لیکن وہ فلسفیانہ خیالات نظم کرتا ہو۔ جیسے فارسی میں بیدؔل، عربی میں ابو العلا معری، اور انگریزی میں کالرج (COLRIDGE) اور براؤننگ (BROWNING) اور سنسکرت میں راجہ بھرتری ہری۔

یہ نظم بہت تفصیل طلب ہے۔ لیکن میں نے یہ شرح کالج کے طلبہ کی ضروریات کو مدنظر رکھ کر لکھی ہے۔ اگر پوری وضاحت کی جائے تو پھر اس کے لیے ایک حاشیہ کی ضرورت ہوگی۔ لہٰذا مختصر طور پر یوں سمجھ لیجئے کہ جب سے فلسفہ کا آغاز ہوا، اُس وقت سے انسان برابر اس مسئلہ پر غور کر رہا ہے کہ (۱) روح کس جوہر سے ہے؟ (۲) خاک تیرہ کس جوہر سے

ہے؟ (۳) اور اِن دونوں میں جو ارتباط و اختلاط پایا جاتا ہے۔ اُس کی نوعیت کیا ہے؟ جیسا کہ میں اس شرح میں کئی جگہ اشارہ کر چکا ہوں، یہ اور اسی قسم کے دوسرے مسائل، عقل کی دسترس سے بالاتر ہیں۔ عقل صرف محسوسات میں چل سکتی ہے اور روح بالاتفاق حواس کی گرفت سے باہر ہے اور جدید تحقیقات کی رو سے مادہ بھی مادی نہیں ہے۔ بلکہ تموجات برقی کا نتیجہ ہے اور برق کی ماہیت مجہول الکنہ ہے: یعنی عقل میں نہیں آ سکتی۔ اللہ بس باقی ہوس۔

دیگر فلاسفہ کی طرح اقبالؔ نے بھی اس مسئلہ پر طبع آزمائی کی ہے۔ جس کی تفصیل تو اُن کی مایۂ ناز مگر بدقسمت تصنیف "اسلام میں مذہبی فکر کی تشکیل جدید" میں مل سکتی ہے۔ یہاں صرف اتنا ہی لکھنا کافی ہے کہ اقبال کی رائے میں روح اور مادہ میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہے۔ مادہ، جدید طبیعات کی رو سے اب کسی جامد یا ٹھوس چیز کا نام نہیں ہے، بلکہ اس کی اصل وہ برقی لہریں ہیں جن کو ہم توانائی (ENERGY) کا منبع قرار دے سکتے ہیں۔ اور "توانائی" مادی یعنی ٹھوس چیز نہیں ہے، یعنی مادہ کی اصل غیر مادی ہے۔

چنانچہ جے ٹامسن نے سب سے پہلے سالماتی نظریہ کو باطل کیا۔ اور ثابت کیا کہ سالمہ ATOM جسے حکمائے قدیم ناقابلِ تقسیم کہتے تھے، دقیق ذرات CORPUSCLES سے مرکب ہے۔ اور یہ ذرات، برقی نقاط سے مرکب ہیں۔ جن کو طبیعات کی اصطلاح میں ELECTRICAL UNITS کہا جاتا ہے۔ اور بجلی کے یہ نہایت لطیف اور دقیق نقطے، جو بغیر خوردبین کے نظر نہیں آ سکتے۔ کوئی ٹھوس یا جامد چیز نہیں ہیں۔ بس اتنا کہہ سکتے ہیں کہ وہ توانائی کا مظہر ہیں۔

اِن نقطوں کی یہ کیفیت ہے کہ غیر محسوس اور غیر مرئی نقطے بھی بسیط نہیں ہیں، بلکہ مرکب ہیں۔ یہ الیکٹران اور پروٹان سے مرکب ہیں۔ اور ان کی باہمی نسبت کی یہ کیفیت ہے کہ الیکٹران ELECTRON ہر وقت نہایت سرعت کے ساتھ، جس کا اندازہ عقل نہیں کرسکتی، پروٹان PROTAN کے گرد گردش کرتے رہتے ہیں، اور ان الیکٹرانس میں اس بلا کی طاقت اور توانائی ہے کہ عقل اس کا تصور ہی نہیں کرسکتی۔ مثلاً جسے ہم لوگ سُرخ رنگ کہتے ہیں۔ یہ رنگ جن برق پاروں کی گردش سے پیدا ہوتا ہے۔ اُن کی سُرعت کا یہ عالم ہے کہ وہ ایک سکنڈ میں اپنے مرکز کے گرد چار سو کھرب مرتبہ گردش کرتے ہیں۔ اب ناظرین خود فیصلہ کریں کہ کیا وہ ایک سکنڈ کے ۱/۴ کھرب کا تصور کرسکتے ہیں۔

اس بات کا جاننا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ یہ برقی نقطے مختلف سائز کے ہوتے ہیں۔ سب سے چھوٹا سالمہ، ہائیڈروجن سالمہ HYDROGEN (ATOM) ہے۔ اس کی ترکیب صرف ایک پروٹان (نقطہ ماسکہ) اور ایک الیکٹران (برق پارہ) سے ہوتی ہے۔ اور یہ اکیلا برق پارہ اُس اکیلے پروٹان کے گرد رقص پیہم کرتا رہتا ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اِس میں یہ گردش پیہم کہاں سے آئی؟ اور سب سے بڑا سالمہ، یورینیم سالمہ URANIUM ATOM ہے جس کا نقطۂ ماسکہ ۲۳۸ پروٹانوں سے مرکب ہے۔ اور ٹھیک اُتنے ہی الیکٹران (برق پارے) اُس نقطہ کے گرد گھومتے رہتے ہیں۔ اور یہ سالمہ بھی آنکھ سے نظر نہیں آسکتا۔

پروفیسر روورفرڈ RUTHER FORD بھی یہی لکھتا ہے کہ "سالمہ ایک مثبت POSITIVE مرکز یا نقطہ ماسکہ ہے۔ جس کے گرد ایک یا زیادہ منفی

برق پارے گردش کرتے رہتے ہیں۔ اور مادہ کوئی جامد، ٹھوس، متحد الاجزا چیز نہیں ہے۔ بلکہ ایسی ترکیب یافتہ شئے ہے جس میں خلا ہے اور برق پارے منتشر نظر آتے تھے۔"

الغرض جدید سائنس کے انہی انکشافات کو دیکھ کر اقبال نے یہ نظریہ قائم کیا کہ مادہ مادّی نہیں، بلکہ اس کی اصل غیر مادّی ہے یعنی روح۔ چنانچہ اپنی مذکورہ بالا کتاب "تشکیل جدید" میں وہ لکھتے ہیں کہ "جسے تم مادہ سمجھتے ہو، وہ بھی روح ہی کی ایک شکل ہے جو زمان و مکان کی قید میں رہ کر، اپنے مقصد کے حصول میں مصروف ہے۔"

اب سوال یہ ہے کہ روح اور بدن میں رشتہ کیا ہے؟ اس کا جواب اقبال نے یہ دیا ہے کہ بدن کی اصل مادّہ ہے، اور مادّہ کی اصل روح ہے (اوپر ثابت ہوچکا ہے کہ مادہ، مادّی چیز نہیں ہے۔ اور اقبال کی رائے میں مادہ بھی روح ہے، یا روح کی ایک شکل ہے) اِن دونوں میں اصل کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں، فرق اگر ہے تو شکل یا صورت کا ہے۔ اس کو اقبال نے انگر کی مثال سے بخوبی واضح کیا ہے۔

آپ ایک دہکتا ہوا "انگارا" لے لیجئے۔ اور اپنے سامنے رکھئے تھوڑی دیر کے بعد آپ دیکھیں گے کہ وہ راکھ میں پوشیدہ ہوگیا ہے۔ یہ راکھ کہیں باہر سے، یا کسی اور جگہ سے لاکر آپ نے اس انگارے پر نہیں ڈالی۔ بلکہ وہ خاکستر، اس انگارے ہی سے پیدا ہوئی ہے، یا اِس کی شکل ہے۔ یعنی وہ انگارا ہی راکھ میں تبدیل ہوگیا ہے اور جب آپ راکھ ہٹائیں گے، تو اندر سے انگارہ نکل آئے گا۔ راکھ کی اصل وہی آگ یا انگارہ ہے۔ جس طرح انگر، قبا پوش اپنی خاکستر سے ہے۔ اسی طرح، روح قبا پوش اپنی خاکستر سے ہے۔ یعنی جسم بھی اصل کے لحاظ سے روحانی

ہی ہے :

"MATTER IS ALSO SPIRIT REALTSING ITSELF IN SPACE AND TIME

اب نظم کو پڑھ لیجئے :-

عقل انسانی، مدت سے اس اُلجھن میں گرفتار ہے کہ روح کی اصل کیا ہے؟ اور مادہ کی اصل کیا ہے؟ میں جس مسئلہ پر غور کر رہا ہوں، وہ یہ ہے کہ "مستی و شور و سرور و درد و داغ" ان روحانی کیفیات کی اصل کیا ہے؟ اِن میں سے کوئی چیز ٹھوس نہیں، محسوس نہیں، پھر بھی عقل انسانی اِن کے وجود سے انکار نہیں کر سکتی۔

اور آج کل کے مغرب زدہ لوگ اِس اُلجھن میں گرفتار ہیں کہ "مے سے ہے ساغر، کہ ساغر مے سے ہے؟ یعنی جسم (مادہ) کی اصل روحانی ہے، یا روح کی اصل مادی ہے؟

میرے نزدیک جان و تن میں وہی ارتباط ہے، جو حرف و معنی میں نظر آتا ہے۔ یعنی تن، روح کی خارجی شکل ہے۔ جس طرح لفظِ محبت، جذبۂ محبت کی، جو نہ خارج میں موجود ہے، نہ موجود ہو سکتا ہے، خارجی شکل، یعنی اظہار کا ذریعہ ہے۔ جذبۂ محبت کا جو مفہوم ذہن میں ہے اُس مفہوم کو ہم لفظ "محبت" سے ادا کرتے ہیں۔ یہ لفظ اُس غیر مادی مفہوم کی خارجی شکل ہے۔

محبت غیر محسوس ہے۔ لفظ محبت محسوس ہے۔ اور محبت کا مظہر ہے۔
اسی طرح روح غیر محسوس ہے، تن، محسوس ہے۔ اور روح کا مظہر ہے۔
جس طرح لفظ محبت، غیر محسوس جذبۂ محبت کے اظہار کا ذریعہ

ہے، اسی طرح تن یا جسم، غیر محسوس روح کے اظہار کا ذریعہ ہے، معنیٰ نہ ہو تو لفظ بیکار ہے۔ روح نہ ہو تو جسم بیکار ہے۔
خاکستر، اخگر ہی کی ایک شکل ہے۔ اسی طرح جسم، روح ہی کی ایک شکل ہے۔

نوٹ:- اقبال نے اِس نظریہ کو بڑی وضاحت کے ساتھ اپنی غیر فانی فلسفیانہ نظم "گلشن رازِ جدید" میں بھی پیش کیا ہے، لکھتے ہیں ؎

تن و جان را دو تا گفتن کلام است
تن و جان را دو تا دیدن حرام است

یعنی عرفِ عام میں یہ تو کہہ سکتے ہو کہ جسم اور روح دو چیزیں ہیں۔ لیکن ان کو دو مختلف الاصل چیزیں نہیں یقین کر سکتے۔ دو کہہ سکتے ہو، دو سمجھ نہیں سکتے۔ ان کو دو کہنا تو جائز ہے۔ لیکن دو سمجھنا ناجائز ہے۔ اسی لیے اقبال، انسان کو ایک وحدت تسلیم کرتے ہیں اس میں روح اور مادہ کا امتیاز تسلیم نہیں کرتے۔ اسلام دینِ وحدت ہے۔ اس لیے اللہ بھی ایک کائنات بھی ایک، انسان بھی ایک، نہ اللہ میں دوئی کی گنجائش ہے، نہ انسان میں۔

اقبال کہتے ہیں کہ اسلام، دینِ فطرت ہے۔ اُس نے ابتدا سے وحدت کی تعلیم دی۔ یہ دوئی کی تعلیم تو ایران میں پیدا ہوئی جس کی ابتدا مجوسیت (زرتشتیت) سے ہوئی۔ اور ایک عرصہ کے بعد مانی نے اس تعلیم کو دوبارہ زندہ کر کے ثنویت DUALISM کے رنگ میں پیش کیا۔ جسے فلسفہ میں ثنویت مانوی MANICHEAN DUALISM کہتے ہیں۔ جان و تن، یعنی روح اور مادہ کا امتیاز اسی مسلک کی بدولت

پیدا ہوا۔ اسلام نے جس طرح دیگر غلط عقائد کا ابطال کیا ہے، اس ثنویت پر بھی ضرب کاری لگائی ہے۔

مانی کے فلسفہ کو چوتھی صدی میں مسیحیت نے قبول کر لیا۔ اور مسیحیت کے واسطہ سے یہ عقیدہ یورپ میں پہنچ گیا۔ اور سارا یورپ اس کا قائل ہوگیا۔ چنانچہ اِسی ثنویت کی تعلیم کے زیرِ مسیحی یورپ میں زندگی کے ہر شعبہ میں دوئی کا رنگ پیدا ہوگیا۔ مثلاً دین اور دُنیا۔ مذہب اور سیاست۔ روح اور مادّہ۔ دنیاوی زندگی اور دینی زندگی۔ دینی طبقہ اور دنیاوی طبقہ۔ یعنی پادریوں کا طبقہ اور عوام کا طبقہ۔ اس امتیاز سے پاک اور ناپاک کا امتیاز بھی پیدا ہوگیا۔ یعنی روح پاک ہے۔ مادّہ ناپاک ہے۔ تجرد کی زندگی پاک ہے، تاہل کی زندگی ناپاک ہے۔ دین پاک ہے دنیا ناپاک ہے۔ مذہب پاک ہے، سیاست ناپاک ہے (اسی لیے مذہب کو سیاست سے جُدا کر دیا) عقبیٰ پاک ہے، دُنیا ناپاک ہے۔ دیندار طبقہ پاک ہے، دنیا دار طبقہ ناپاک ہے (کلیسا نے انسانوں کو دو گروہوں میں منقسم کر دیا، پادری اور غیر پادری)

اسلام نے ثنویت اور مسیحیت کے اِن تمام امتیازات کو مٹا دیا اور کہا کہ دنیا اور دولتِ دنیا، بہت اچھی ہے اگر اللہ کے نام کو بلند کرنے کے لیے حاصل کی جائے۔ الغرض ثنویت نے جس قدر غلط امتیازات پیدا کر دئے تھے۔ جن کا ابھی ذکر ہوا۔ اسلام نے ان سب کو مٹا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں مذہب اور سیاست دو مختلف چیزیں نہیں ہیں بلکہ اسلام مذہب اور سیاست دونوں کا جامع ہے۔

اب اِس جگہ مجبوراً قلم کو روکتا ہوں، اور اِس طولِ کلام کی معافی

چاہتا ہوں، ع لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم۔

لاہور اور کراچی

(دوسری)

چونکہ بظاہر عنوان کو نظم سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا، اس لیے مجھے اس کی صراحت کرنی لازمی ہے۔ قصہ یہ ہے کہ ۱۹۲۷ء میں ہندوستان کے دشمنِ انسانیت آریہ سماجیوں نے جو بظاہر کانگریسی تھے، لیکن بباطن شدید قسم کے مہاسبھائی تھے (اور اب بھی ہیں)، آقائے کائنات فخرِ موجودات دانائے سُبُل ختم الرسل مولائے کل (جس نے غبارِ راہ کو فروغ وادیٔ سینا عطا فرمایا، صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان میں گستاخیوں کا سلسلہ شروع کیا۔ گویا اپنی خباثتِ باطنی اور عنادِ قلبی کا علانیہ اظہار کرنے لگے۔

چنانچہ ۱۹۲۷ء میں چمو پتی نامی ایک آریہ سماجی نے جو آریہ سماج لاہور کا ایک کارکن (اُپدیشک) تھا، ایک رسوائے عالم کتاب لکھی جسے دوسرے آریہ سماجی راجپال نے لاہور سے شائع کیا۔ اِس پر سارے ہندوستان میں ایک ہنگامہ برپا ہوگیا، اور اس سرے سے اُس سرے تک مسلمانوں میں ایک آگ سی لگ گئی۔ یاد رہے کہ یہ وہ زمانہ تھا، جب حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، اور دوسرے کانگریسی مسلمان تو مسلمانوں کو یہ تلقین کر رہے تھے کہ "ہندو تمہارے بھائی ہیں۔ اس لیے تم اُن سے دوستی کرو۔ اور اُن کو اپنا بھائی سمجھو، اور ان سے

اتحاد کرو؟" اور اُسی دہلی میں رئیس المعاندین شردھانند جو لاجپت رائے کے ساتھ مدتوں کانگریس کا سرگرم کارکن رہ چکا تھا، مسلمانوں کو دینِ اسلام سے مرتد کرنے والی جماعت کی قیادت کر رہا تھا۔ اور رات دن اسلام کے خلاف زہر چکانی میں مصروف تھا۔ بلکہ اسلام کو مٹانے کے منصوبے باندھ رہا تھا۔ چنانچہ ان دشمنانِ اسلام کی جسارت اس حد تک بڑھ گئی کہ پلول ضلع گڑگانوں کے شفاخانہ حیوانات کے ایک آریہ سماجی ڈاکٹر نے شفاخانہ کے سرکاری گدھے کا وہ نام رکھا، جس پر چالیس کروڑ مسلمانانِ عالم اپنی جانیں قربان کرنے کو سب سے بڑی سعادت یقین کرتے ہیں یعنی الف، ح، میم ... ؎[1]

قصہ مختصر، لاہور ہائی کورٹ نے اس قانونی نکتہ کی بنا پر راجپال اور چموپتی کو بری کر دیا کہ مروجہ ضابطہ تعزیراتِ ہند میں جو قانون دفعہ ۲۹۵ کے تحت مرتب کیا گیا ہے، وہ ناقص ہے، اس لیے ملزم پر اس کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ جنت آشیانی محمد علی مرحوم نے، وائسرائے کی مجلس وضع آئین کو مجبور کر کے دفعہ مذکورہ میں ایک شق جو دفعہ ۱۵ الف کے نام سے مشہور ہے، اضافہ کرا دیا۔ لیکن راجپال بہرحال سزا سے

[1] میں نے اسی زمانہ میں ایک مضمون لکھا تھا، جس میں آریہ سماجیوں سے پوچھا تھا کہ اگر میں اپنے کُتّے کا نام کرشن یا دیانند رکھ لوں تو تم لوگوں کو تکلیف ہوگی یا نہیں، نیز میں نے اُسی وقت یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ہندوؤں سے کسی قسم کا اتحاد ممکن نہیں۔ کیونکہ وہ ہم سے اتحاد کے خواہاں ہی نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوؤں نے حکیم اجمل خان اور انصاری وغیرہ کی اپیلوں کو کبھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ ۱۲

بچ گیا تھا۔ اس لیے ۲۸ء میں لاہور کے ایک ان پڑھ ۱۹ سالہ نوجوان علم الدین نامی کی رگوں میں غیرت دینی نے جوش مارا اور اس عاشقِ رسول نے اس دشمنِ اسلام کو قتل کر دیا۔

چونکہ راجپال کے بری ہو جانے سے کفارِ ہنود کے حوصلے بڑھ گئے تھے اس لیے ایک آریہ سماجی نے کراچی میں، دوسرے نے کلکتہ میں راجپال کی تقلید کی۔ اسی لیے کراچی میں عبدالقیوم خاں نے اُس ہندو ناشر کتاب کو، اور عبداللہ خاں نے کلکتہ میں دوسرے ناشر کتاب کو قتل کیا۔ یعنی اپنی زندگی کا ثبوت دیا۔

کلکتہ کا واقعہ چنداں مشہور نہیں ہوا۔ لیکن لاہور اور کراچی کا واقعہ بہت مشہور ہوا۔ اور مدتوں تک مسلمانوں کی زبانوں پر علم الدین اور عبدالقیوم کا نام رہا۔ اقبال نے انہی واقعات سے متاثر ہو کر یہ نظم لکھی تھی۔ اور اس میں اُنہوں نے اپنی طبیعت کے اقتضا کے مطابق مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ ان شہیدوں کی دیت، اہلِ کلیسا سے مت مانگو،

نوٹ:۔ علامہ اقبال مرحوم جب کبھی دورانِ گفتگو میں علم الدین شہید کا ذکر کرتے تھے تو ہمیشہ لیٹے سے اٹھ کر بیٹھ جاتے تھے، اور جب اُس کا نام لیتے تھے تو آنکھوں سے موتیوں کی لڑیاں رخساروں پر بہنے لگتی تھیں اور ایک ناقابلِ بیان کیفیت کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ "ہم لکھے پڑھوں سے تو وہ ان پڑھ ترکھان (بڑھئی)، کا لڑکا کہیں زیادہ عقل مند نکلا۔ ہم بحثوں ہی میں اُلجھے رہے اور وہ کامیاب ہو گیا۔" ۱۲

نوٹ:۔ جب نومبر ۱۹۲۹ء میں شہید مذکور کی نعش چھ ماہ کے بعد میانوالی جیل کے قبرستان سے لاہور آئی تھی، تو میں نے بچشم خود اُس کی زیارت کی تھی، یہ معلوم ہوتا تھا کہ کل وفات ہوئی ہے ۱۲

کیونکہ اہلِ کلیسا اِن کے خون کی قیمت کیا ادا کر سکتے ہیں۔ جبکہ اِن کا خون قدر و قیمت کے لحاظ سے "حرم" سے بھی بڑھ کر ہے۔

(۱) غیور مسلمان، صرف اللہ پر نظر رکھتا ہے، یعنی اللہ کے سوا کسی سے کچھ طلب نہیں کرتا۔ اور نہ توقع رکھتا ہے۔ نیز موت سے بالکل نہیں ڈرتا، کیونکہ موت، انقطاعِ حیات کا نام نہیں بلکہ حقیقی اور اصلی گھر کی طرف واپس جانے کا نام ہے (قرآن شریف فرماتا ہے کہ حقیقی اور اصلی زندگی صرف دارِ آخرت ہی کی ہے۔ اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَۃَ لَہِیَ الْحَیَوَان۔

(۲) بھلا نصاریٰ اِن شہیدوں کا خون بہا کیا دے سکتے ہیں جبکہ ان کا خون بلحاظ قیمت، حرم سے بھی بڑھ کر ہے۔

(۳) افسوس اے مسلمان تو قرآن مجید کی اس تعلیم سے بیگانہ ہو گیا کہ "اللہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو مت پکارو۔" پس تو اللہ سے توفیق طلب کر کہ تو خود دشمنانِ دین سے انتقام لے سکے۔

نبوّت

اس نظم میں اقبال نے بھولے بھالے مسلمان کو نبوت کی پہچان بتائی ہے۔ اقبال کو اس بات کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ انگریزوں نے مسلمانانِ ہند کے دل و دماغ سے جہاد کا جذبہ فنا کرنے کی غرض سے ایک شخص کو ایسے مواقع بہم پہنچا دیئے کہ وہ نبوت کا دعویٰ کر سکے اور کوئی مسلمان اُس سے باز پرس نہ کر سکے۔ لہ

(لہ حاشیہ صد ۱۶۵ پر ملاحظہ فرمائیں)

چنانچہ اُس شخص نے اپنے آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے ساری عمر جہاد کے خلاف اپنے قلم اور اپنی زبان سے کام لیا۔ اور مسلمانوں کو جہاد کا خیال ترک کر دیتے، اور انگریزوں کی غلامی پر قناعت کرنے کے سلسلہ میں اس قدر کتابیں لکھیں اور شائع کیں کہ بقول نبیٔ مذکور "اگر اُن کو جمع کیا جائے تو پچاس الماریاں بھر جائیں گی۔" اِس "خود کاشتہ پودے" نے مسلمانوں سے یہ کہا کہ انگریز اولوالامر ہیں اِن کی اطاعت بروئے قرآن واجب ہے۔ یہ حکومت ہم پر بڑی مہربان ہے، ہم اس عادل گورنمنٹ کے زیر سایہ بہت خوش ہیں۔ ہمیں جو آسائش اس حکومت میں نصیب ہے۔ وہ دنیا میں کہیں نصیب نہیں ہو سکتی۔ غرضکہ یہ نبی ساری عمر دشمنانِ اسلام انگریزوں کی مدح سرائی کرتا رہا۔ اور اللہ کے بندوں کو غلامی کا درس دیتا رہا۔ اس لیے اقبال نے مجبور ہو کر اس طلسم کو توڑا۔

(۱) کہتے ہیں کہ میں نہ عارف ہوں، نہ مجدّد ہوں، نہ محدّث ہوں۔، نہ فقیہہ ہوں، اور نہ مقامات و کمالاتِ نبوت سے واقف ہوں۔

(۲) ہاں، مگر عالمِ اسلام کی ملّی تاریخ سے آگاہ ہوں، اور ضمیرِ فلک (آسمانی کتابوں کی تعلیمات) سے بھی کچھ شناسائی رکھتا ہوں۔

(۳) میں نے موجودہ زمانہ کی تاریک رات میں یہ حقیقت دیکھی ہے۔ اور یہ حقیقت چاند کی طرح روشن ہے کہ

(۴) جس نبوت میں قوت و شوکت کا پیام نہیں، وہ نبوت مسلمان قوم

(حاشیہ صد ۱۶۴) اسی لیے عارف اللہ آبادی نے یہ شعر سپرد قلم کیے تھے۔

گورنمنٹ کی خیر یارو مناؤ ✵ گلے میں، جو آئیں وہ تانیں اُڑاؤ
کہاں ایسی آزادیاں تھیں میسّر ✵ انا الحق کہو، اور پھانسی نہ پاؤ

کے حق میں بھنگ کے پتوں سے زیادہ وقیع نہیں ہو سکتی۔ یعنی میں نے دُنیا کے گذشتہ انبیاء اور رسولوں کی زندگیوں کا مطالعہ کیا ہے۔ اور مجھے یہ حقیقت چاند کی طرح چمکتی نظر آتی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر نبی اور ہر رسول نے مسلمانوں کو حکومت اور سروری کا پیام دیا ہے۔ تاریخ عالم میں کوئی نبی ایسا نہیں گذرا، جس نے مسلمانوں کو کافروں کی غلامی میں زندگی بسر کرنے کی تلقین کی ہو یا غلامانہ زندگی سے مطمئن رہنے کا سبق پڑھایا ہو۔ یہ سعادت صرف ہندی نبی کے حصّہ میں آئی ہے۔

نوٹ :۔ برگِ حشیش میں حسن صباح کے طریقِ کار کی طرف بھی اشارہ ہے یہ مکّار اور عیّار دشمنِ دین وملّت، اپنے پیروؤں کو بھنگ کا شربت پلاکر اُس جنّت میں بھیجا کرتا تھا، جس میں اُس نے جارجیا اور سرکاشیا، آرمینیہ اور کردستان کی حسین ترین عورتیں اِن نوجوانوں کو پھانسنے کے لیے جمع کی تھیں۔ یہ جنت قلعہ الموط میں تھی۔ اور یہ شخص فرقۂ اسمٰعیلیہ کا داعی گذرا ہے۔

آدم

(پہلی)

یہ بھی بہت مشکل فلسفیانہ نظم ہے۔ اس میں پہلی مطلب بات یہ ہے کہ اقبالؔ نے آدم کو "طلسم بود وعدم" سے تعبیر کیا ہے اس کی مختصر تشریح یہ ہے کہ آدم کا وجود حقیقی یا بقول حجۃ الاسلام، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب

نانوتویؒ (بانیؒ دارالعلوم دیوبند) خانہ زاد نہیں ہے۔ یعنی آدم اپنے موجود ہونے میں دوسرے کا محتاج ہے اور جو دوسرے کا محتاج ہوتا ہے اس کی ماہیت عدم ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے آدم عدم کا مصداق ہے۔ لیکن وہ کسی کے موجود کردینے سے موجود ہوگیا۔ اس لیے وہ بود کا مصداق ہے یعنی اُس میں عدَم اور بوَد دونوں شانیں موجود ہیں۔ اس لیے اقبالؔ نے اس کو "طلسم بود وعدم" سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی ایسی ہستی کہ ماہیت کے لحاظ سے تو اُس پر عدم کا اطلاق ہوتا ہے۔ لیکن موجود ہے۔ اس لیے وجود (بود) کا اطلاق بھی ہو سکتا ہے۔ اب چونکہ وجود (بود) اور عدم ایک دوسرے کی ضد ہیں، اس لیے وجودِ آدم بلا مبالغہ ایک "طلسم" ہے کہ ہے بھی، اور نہیں بھی۔

اب اس کو دوسری طرح سمجھاتا ہوں۔

(۱) یہ مسلّم ہے کہ کائنات موجود ہے۔ اس لیے "وجود" ثابت ہوگیا۔

لہ واضح ہو کہ مولانائے مرحوم کی ذات جامع کمالات صوری ومعنوی ہی نہ تھی، بلکہ قدرتِ الٰہی کا زندہ نشان تھی۔ اُنھوں نے ایک طرف ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف جہاد کیا۔ دوسری طرف نصاریٰ، آریہ سماج، اور سرسید کے عقائد باطلہ کا ابطال کیا۔ تیسری طرف دیوبند میں مدرسہ قائم کرکے ہندوستان میں اسلام کی بقا کا انتظام کیا۔ ۱۸۷۸ء میں دیانند بانیٔ آریہ سماج کو شاہ جہاں پور کے مناظرہ میں ایسا لاجواب کردیا کہ پھر اُسے مقابلہ میں آنے کی جرأت ہی نہ ہوئی۔ اس ایک مردِ مومن نے یکہ وتنہا تمام دشمنان اسلام کا مقابلہ کیا اور سب کو شکست دی۔ تقریر، خطابت مناظرہ، تحریر، تصنیف، درس وتدریس، وعظ وارشاد، اور حقائق بیانی کے لحاظ سے انیسویں صدی میں بلا مبالغہ حجۃ الاسلام تھے۔ جس طرح علوم ظاہری میں فرید الدہر تھے، اُسی طرح علوم باطنی میں بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ (باقی بر ص۱۶۸)

(۲) اب وجود کی عقلاً تین قسمیں ہو سکتی ہیں۔

(ا) واجب الوجود، یعنی ایسا وجود جس کا نہ ہونا محال ہو، اُس کو ضروری الوجود بھی کہتے ہیں۔ (انگریزی میں NESSARY BEING کہتے ہیں) فلسفہ اسلام میں اس کا مصداق ایک سے زیادہ نہیں ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ ہے۔ پس وہی اکیلا واجب الوجود ہے۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے موجود ہونے میں کسی کا محتاج نہیں ہے۔ یعنی وجود اُس کا خانہ زاد ہے۔ فلسفۂ اسلام میں واجب کو قدیم کہتے ہیں۔ اور مسلمان حکما یہ کہتے ہیں کہ اللہ کے علاوہ باقی ساری کائنات حادث ہے۔

(ب) ممکن الوجود، یعنی ایسا وجود جس کا ہونا اور نہ ہونا، دونوں ممکن ہوں انگریزی میں اسے CONTENGENT BEING کہتے ہیں۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ ممکن الوجود، اپنے وجود میں دوسرے کا محتاج ہوتا ہے۔ جس طرح واجب کی حقیقت یا ماہیت وجود ہے، ممکن کی ماہیت عدم ہے۔ ممکن جب موجود ہوگا تو کسی کے موجود کرنے سے موجود ہوگا، وہ خود موجود نہیں ہو سکتا۔ یعنی وجود اُس کا خانہ زاد نہیں ہے۔ بلکہ کسی غیر کا عطا کردہ ہے۔

(ج) ممتنع الوجود، یعنی ایسا وجود جس کا ہونا محال ہو انگریزی میں اُسے

(بقیہ ص ۱۶۷) مرشدی حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکہ معظمہ کے خلفاء میں سے تھے۔ میرے اندر منطق اور فلسفہ کا ذوق حضرت ہی کی کتابوں کے مطالعہ سے پیدا ہوا۔ اور میں نے ان کی تصانیف سے اس قدر استفادہ کیا ہے کہ مدۃ العمر بار احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ حکومتِ پاکستان کو اس مردِ مومن کے نقوشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، تاکہ حکومت مذکور، سلطنت خداداد میں دارالعلوم دیوبند کا جواب قائم کر سکے۔ آمین ؛

IMPOSSIBLE BEING کہتے ہیں جیسے شریک باری تعالیٰ یعنی دوسرا خدا۔

اب مجھے یقین ہے کہ بات بالکل صاف ہو گئی ہو گی۔ آدم چونکہ ممکن الوجود ہے۔ اس لیے وہ "طلسم بود و عدم" کا مصداق ہے۔ ماہیت کے لحاظ سے عدم ہے، لیکن اس کے باوجود موجود ہے۔ کیونکہ خدا نے اِسے معدوم سے موجود کر دیا۔

(۱) اقبالؔ کہتے ہیں کہ آدم کا وجود، یا اُس کا موجود ہونا، یہ بلاشبہ خدا تعالےٰ کا راز ہے۔ جس کو کوئی انسان نہیں کھول سکتا۔ یعنی کوئی شخص یہ نہیں بتا سکتا کہ آدم کیسے موجود ہو گیا۔

(۲) اگرچہ زمانہ، ابتداء سے محوِ سفر ہے۔ لیکن آدم اس کی تگ ودَو سے پُرانا نہیں ہو سکا۔ یعنی پیدائش بنی آدم کا سلسلہ اسی طرح جاری ہے اگر ایک آدم معدوم ہو جاتا ہے، تو دوسرا آدمؔ موجود ہو جاتا ہے۔

(۳) مجھے ڈر ہے کہ اگر میں سچی بات کہہ دوں تو شاید تو پریشان ہو جائے یا کسی اُلجھن میں گرفتار ہو جائے، لیکن اگر تو حقیقت کا جویا ہے، تو پھر میں تجھے صاف لفظوں میں بتا دوں کہ

وجود حضرتِ انسان نہ روح ہے نہ بدن

یعنی بظاہر تو انسان، روح اور بدن کے مجموعہ کا نام ہے لیکن انسان کا وجود، یعنی اُس کی ماہیت نہ روح ہے نہ بدن۔ بلکہ عدمؔ ہے۔ اور اس کا وجود، محض اللہ کی صفتِ خالقیت کا پرتو ہے جس کی حقیقت اور ماہیت تو عدمؔ محض ہے۔ لیکن جب عدم پر اس کی صفت خالقیت کی تجلی ہوئی تو عدمات کو خلعتِ وجود حاصل ہو گیا۔ یعنی اللہ کی صفتِ

خالقیت نے، محض اپنی نوازش سے بلا استحقاق عدمات محضہ کو، خلعتِ وجود عنایت کر دیا۔ اسی لیے اسلامی فلسفہ یہ ہے کہ اگر ذات باری، اپنی صفتِ قیومیت کی تجلی کو ایک سکنڈ کے لاکھویں حصہ کے لیے بھی روک لے تو ساری کائنات فنا ہو جائے۔ یعنی اپنی اصل حقیقت یا ماہیت کی طرف لَوٹ جائے یعنی معدوم ہو جائے۔

پھر پڑھو، اس مصرع کو،

"وجود حضرتِ انساں، نہ روح ہے نہ بدن"

یعنی انسان کا وجود، نہ روح یا نفس ناطقہ ہے، نہ بدن ہے۔ نہ ان کا مجموعہ ہے۔ بلکہ انسان کا وجود، محض ظلّی یا طفیلی ہے، محض اللہ کے رحم و کرم کا ظہور ہے۔ اُس نے اپنی قدرتِ کاملہ اور مشیتِ قاہرہ کی بدولت ہمیں عدم محض سے، خلعتِ وجود عنایت کر دیا۔ ہماری حقیقت صرف اتنی ہے کہ اُس نے ہمیں معدوم سے موجود کر دیا ہے۔ اور جب چاہے گا، اُس کائنات کو پھر معدوم کر دے گا۔ اور جب چاہے گا پھر موجود کر دے گا۔ "وجودِ حضرت انسان، نہ روح ہے نہ بدن" بلکہ اس کی صفتِ خالقیت کا کرشمہ ہے۔ جب وہ کسی چیز کے موجود کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ صرف یہ کہہ دیتا ہے کہ "موجود ہو جا" پس وہ موجود ہو جاتی ہے۔ (کُنْ فَیَکُوْنَ ہ کا یہی مطلب ہے) یعنی اس کی مشیت میں یہ طاقت ہے کہ جو کام انسان وسائل اور آلاتِ سے کرتا ہے، اللہ محض اپنی مشیت سے کر سکتا ہے۔

مکّہ اور جنیوا

(دوسری)

اس مختصر نظم میں اقبال نے حکمتِ افرنگ، اور حکمتِ قرآن کے مقصد کا موازنہ کیا ہے۔ اور اسلام کے نقطۂ نگاہ کو دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔

"فرماتے ہیں کہ اگرچہ موجودہ دور میں افراد در کنار اقوام، آپس میں ملنے لگیں، لیکن اُس کے باوجود وحدتِ نوعِ انسانی، ظہور میں نہ آ سکی۔"

یاد رکھو! حکمتِ افرنگ کا مقصد یہ ہے کہ قوموں میں تفریق پیدا کی جائے، اور اس کو برقرار رکھا جائے۔ یعنی مغربی سیاست کا نصب العین یہ ہے کہ قوموں میں اعلیٰ اور ادنیٰ کے امتیازات کئے جائیں۔ اس کے برعکس اسلامی سیاست کا نصب العین یہ ہے کہ تمام امتیازات کو مٹا کر وحدتِ نسل انسانی قائم کی جائے۔ یعنی سب انسان ایک باپ کی اولاد ہیں۔ اور اس لیے سب برابر ہیں۔

اسلام دنیا میں اُصول وحدت کا تنہا علمبردار ہے۔ اس کی بنیادی تعلیمات یہ ہیں کہ خالق کائنات ایک ہے، ساری کائنات ایک ہے۔ اس ساری کائنات کے لیے رسول یا رہنما ایک ہے۔ ضابطہ حیات ایک ہے۔ (یعنی قرآن حکیم) سارے انسان ایک ہیں یعنی سب برابر ہیں۔ گورے کو کالے پر، سید کو شیخ پر، عربی کو عجمی پر، بادشاہ کو گدا پر، بحیثیت انسان کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ فضیلت کا صرف ایک معیار ہے۔ اور وہ ہے تقویٰ۔

اسی لیے مکہ معظمہ یعنی اسلام نے، خاکِ جنیوا، یعنی اقوامِ مغرب کو یہ پیغام دیا کہ جمعیتِ اقوام سے جمعیتِ آدم بدرجہا بہتر ہے۔ پس اگر تم واقعی نبی آدم کی بہتری چاہتے ہو تو جمعیتِ اقوام LEAGUE-OF NATIONS کے بجائے جمعیتِ آدم قائم کرو۔ یعنی یہ کوشش کرو کہ دُنیا سے، انسانوں کے بنائے ہوئے تمام امتیازات مٹ جائیں۔ اور رنگِ مساوات قائم ہو جائے۔ جو امن وامان، اور فلاح وبہبود کا ضامن ہے۔

واضح ہو کہ اقوامِ یورپ نے پہلی جنگِ عظیم کے بعد جنیوا (GENEVA) میں ایک مجلس بنام "مجلس اقوامِ عالم"، قائم کی تھی۔ جس کا ظاہری مقصد تو بہت اچھا تھا۔ یعنی دنیا میں امن قائم کرنا۔ لیکن دراصل اس کا مقصد اس کے برعکس تھا۔ یعنی کمزور قوموں کو نہایت چابک دستی کے ساتھ اپنا غلام بنانا۔ اقبالؔ نے ۱۹۳۲ء میں اس مجلس پر نہایت عمدہ تبصرہ کیا تھا۔

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزداں چند
بہرِ تقسیمِ قبور انجمنے ساختہ اند[1]

یعنی یہ مجلسِ اقوام دراصل چند کفن چوروں کی مجلس ہے۔ جو اُنہوں نے قبور (کمزور اقوام) کی تقسیم باہمی کے لیے بنائی ہے۔ چنانچہ جو اقبالؔ نے کہا تھا وہی ہوا کہ یہ انجمن دُنیا میں امن قائم نہ کر سکی۔ اور اِس کی ناکامی کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اس انجمن کے ارکان نے مساواتِ نسلِ انسانی کا اُصول تو تسلیم ہی نہیں کیا۔ جس پر امنِ عالم کا انحصار ہے۔

[1] میں اس انجمن کے متعلق اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا کہ یورپ کے کفن چوروں نے مل کر ایک انجمن بنائی ہے، تاکہ وہ قبروں (ایشیا کی مردہ قوموں) کو آپس میں تقسیم کر سکیں۔ ۱۲

اب دوسری جنگِ عظیم کے بعد اِن کفن چوروں نے یو این او بنائی ہے۔ یعنی تنظیم اقوامِ عالم۔ لیکن یہ انجمن بھی ناکام رہے گی۔ بلکہ تیسری جنگِ عظیم کا پیش خیمہ بن جائے گی۔ اور جب تک دنیا اسلام کے اُصول سہ گانہ حریت، اخوت، اور مساوات، کو تسلیم نہیں کرے گی، اس عذاب سے نجات نہیں پا سکتی۔

اے پیرِ حرم

اس نظم میں اقبالؔ نے علماء اور صوفیائے اسلام سے خطاب کیا ہے اور ان کو، ان کا مذہبی فرض یاد دلایا ہے۔ فرماتے ہیں۔

(۱) اے پیرِ حرم اب خانقاہی طریقے چھوڑ دے۔ اور میرے پیغام کے مفہوم کو سمجھ۔ "طریقِ خانقاہی" اقبال کی خاص اصطلاح ہے چنانچہ بالِ جبریل میں لکھتے ہیں ؎

یہ معاملے ہیں نازک جو تری رضا ہو تو کر
کہ مجھے تو خوش نہ آیا، یہ طریقِ خانقاہی

اس سے مراد ہے وہی تن آسانی اور بے عملی، جس نے مسلمانوں کو غلام بنا دیا۔ وہی موت کا ڈر، اور جہاد کے تصور سے لرزہ بر اندام ہو جانا، جس نے ہمیں ذلیل کر دیا۔

(۲) اے حضرات علماء اور صوفیاء! آپ حجروں سے باہر نکلئے اور اپنی قوم کے نوجوانوں کو خود شکنی اور خود نگری کا درس دیجئے۔ یعنی اُن کو اسلام کے حقائق سے آگاہ کیجئے تاکہ وہ اپنے عیوب کی اصلاح

کرسکیں اور اپنی خودی کی حفاظت کرسکیں۔ اِن دو باتوں کے بغیر وہ ترقی نہیں کرسکتے۔

(۳) تعلیم و تہذیبِ مغرب نے انہیں فیشن کا دلدادہ اور آرام طلب بنا دیا ہے۔ بلکہ اُن کا سارا وقت، عورتوں کی طرح بناؤ سنگار میں صرف ہو جاتا ہے۔ لٰہذا آپ صاحبان اُنہیں سمجھائیں کہ وہ اپنے اندر مردوں کے صفات پیدا کریں۔ نیز اُنہیں محنت، مشقت اور جہاد کی طرف مائل کیجیے۔

(۴) چونکہ وہ دو سو سال سے انگریزوں کی غلامی میں مبتلا ہیں، اِس لیے وہ آزردہ اور دل شکستہ ہو چکے ہیں۔ آپ حضرات قرآن اور حدیث سے اُن کے اس مرض کا مداوا کریں۔ اُنہیں اللہ اور اُس کے رسولؐ کا پیغام سُنائیں اور یہ بتائیں کہ اگر وہ اللہ کے دین کی مدد کریں گے، تو اللہ اُن کی مدد کرے گا۔

(۵) میں نے قوم کی محبت کے جذبہ سے متاثر ہو کر، آپ صاحبان کے مرتبہ اور مقام کو واضح کر دیا ہے۔ پس آپ مجھے اِس جذبہ کا یہ صلہ دیں کہ حجروں سے نکل کر میدانِ عمل میں آجایئے۔

مہدی

یہ نظم بہت غور سے پڑھنے کے قابل ہے۔ اقبالؔ مسلمانوں کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ تم مہدی کے ظہور کے تو منتظر ہو، لیکن مہدی کے تخیّل سے بیزار ہو، یہ بہت عجیب بات ہے۔ تم یہ کہتے ہو، کہ امام مہدی آئیں گے تو

مسلمانوں کو سروری حاصل ہو گی اور وہ اسلام کا نام دنیا میں بلند کریں گے بہت خوب! مجھے اس سے انکار نہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ تم اُن کے آنے کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے ہوئے کیوں بیٹھے ہو؟ یعنی ظہورِ مہدی کے یہ معنی کب ہیں کہ مسلمان عمل سے بیگانہ ہو جائیں؟ وہ جب آئیں گے، ہم اُن کا صدقِ دل سے خیر مقدم کریں گے، لیکن جب تک وہ ظاہر ہوں ہمیں برابر جد و جہد اور جہاد میں مصروف رہنا چاہیئے۔

اقبال مسلمانوں سے یہ کہتے ہیں کہ ظہورِ مہدی کے انتظار کے ساتھ ساتھ مہدی کے تخیّل کو بھی مدِّ نظر رکھو۔ یعنی مہدی کے مفہوم پر غور کرو کہ مہدی وہ بندۂ حق اور امام برحق ہو گا جو اسلام کے نام کو دُنیا میں سربلند کرے گا۔ پس لازم ہے کہ ہر مسلمان اس رتبہ کو حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ کیوں نہ ہر مسلمان اپنے اندر وہ خوبیاں اور نیکیاں اور صفاتِ عالیہ پیدا کرے کہ اُن کی بناء پر اللہ اُن میں سے کسی کو مہدی کے مرتبہ پر فائز کر دے؟ آخر مہدی آسمان سے تو آئے گا نہیں، اللہ ملّتِ اسلامیہ ہی میں سے کسی فرد کو اس منصبِ رفیع پر سرفراز فرمائے گا، تو کیوں نہ ہر مسلمان اس عزت کے حصول کے لیے کوشش کرے؟

(۱) فرماتے ہیں کہ، قوموں کی زندگی یعنی ترقی اور عظمت، افراد یا مال کی کثرت پر موقوف نہیں بلکہ اُن کے "تخیل" پر منحصر ہے۔ اگر کوئی قوم کوئی بلند تخیّل یا نصب العین اپنے سامنے رکھے گی تو یقیناً سربلندی حاصل کرے گی، اور جس قوم کے تخیّلات پست اور ادنیٰ قسم کے ہوں گے وہ قوم بھی پست رہے گی۔ الغرض یہ ایک قانونِ فطرت ہے کہ جیسا تخیّل

ولیسی قوم۔ نیز یہ ذوق (نصب العین) قوم کے افراد کو ادب یعنی ترقی کے راستے سکھاتا ہے۔ اور جدوجہد کی طرف مائل کرتا ہے۔

(۲) چنانچہ جرمنی کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے کہ "نیٹشے" NIETZSCHE نے اپنی قوم کے سامنے مغربی انداز میں، مہدی کا تخیل پیش کیا۔ یعنی اس جرمن فلسفی نے مہدی کے تخیل کو فوق البشر SUPER MAN کے نام سے اپنی قوم کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ بہت جلد تمہارے اندر ایک فوق البشر (غیر معمولی طاقتوں والا انسان) ظاہر ہونے والا ہے۔ اس تخیل کی بدولت جرمن قوم کا ہر فرد۔ فوق البشر بننے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔ اور ایک صدی کے اندر اندر جرمن قوم دنیا کی اقوام کی پہلی صف میں آ گئی۔

(۳) اے مسلمان! تو مہدی کا تو منتظر ہے، لیکن اس کے تخیل سے بیزار ہے یعنی اس کے مفہوم پر غور نہیں کرتا۔ تو ختن کو آہوئے مشکیں سے نومید مت کر، یعنی تو قوم کو مہدی کے وجود سے محروم مت کر۔ اگر کوئی زندہ شخص، جو حرکت اور جدوجہد کر سکتا ہے۔ کفن پوش ہو کر چارپائی پر لیٹ جائے، جیسے مردہ پڑا ہوتا ہے، تو کیا عقلمند آدمی اُسے فی الحقیقت مردہ قرار دے گا یا اُس مردک نادان کے کفن کو چاک کر کے پھینک دے گا؟ اسی طرح اللہ نے ملّت اسلامیہ کے ہر فرد کو ترقی کا موقع دیا ہے۔ ہر مسلمان خلیفۃ اللہ بن سکتا ہے۔ ہر مسلمان بشرطیکہ وہ کوشش اور امامت کی شرائط پوری کرے، مسلمانوں کا امام بن سکتا ہے۔ پس مسلمان کا مہدی کے انتظار میں، عمل صالح اور جدوجہد سے بیگانہ ہو جانا ایسا ہی افسوسناک ہے، جیسا کہ

کوئی زندہ آدمی کفن پہن کر مُردہ بن کر لیٹ جائے۔

مردِ مسلمان

اس نظم میں اقبال نے مردِ مومن کی نمایاں صفات بیان کی ہیں۔

(۱) مومن ہر وقت تقویٰ اور پاکیزگی میں ترقی کرتا رہتا ہے۔ وہ اپنی حالت پر قانع نہیں رہتا۔ اُسے ہر لحظہ ترقی کی خواہش رہتی ہے۔ اور وہ اپنے اقوال اور اعمال سے اللہ اور کلام اللہ کی حقانیت کے دلائل پیش کرتا رہتا ہے۔ یعنی اُس کے اقوال اور اعمال کو دیکھ کر دُنیا اللہ کی ہستی پر ایمان لاتی ہے۔

اس کی مثال ہندوستان کے صوفیائے کرامؒ کی زندگیوں کے مطالعہ سے بخوبی مل سکتی ہے۔ چنانچہ ان کی صحبت کے اثر سے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں غیر مسلم، اللہ پر ایمان لے آئے۔

(۲) حقیقی معنی میں مسلمان بننے کے لیے چار باتیں ضروری ہیں۔ یعنی انسان اُس وقت مسلمان بنتا ہے جب اُس کی زندگی سے چار باتیں ظاہر ہوں، وہ اللہ کے دشمنوں کو مرعوب کر سکے، وہ خطا کاروں کو معاف کر سکے وہ پاکیزہ زندگی بسر کرے اور صاحب حکومت ہو، کسی کا غلام نہ ہو۔

(۳) مومن اگرچہ انسان ہوتا ہے، لیکن اس میں فرشتوں کی سی پاکیزگی پائی جاتی ہے۔ اور وہ وطن دوست تو ہوتا ہے، لیکن وطن پرست نہیں ہوتا، وہ اپنے دین کے لیے اپنا وطن ترک کر سکتا ہے، لیکن اپنے وطن کے لیے، اپنے دین کو ترک نہیں کرسکتا۔

(۴) مومن بظاہر تو قرآن مجید کی تلاوت کرتا ہے، لیکن درحقیقت وہ خود قرآن ہوتا ہے، یعنی اُس کی پوری زندگی قرآن کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہوتی ہے۔

(۵) اِس کے ارادے اور خیالات، قدرت کے مقاصد کی کسوٹی ہوتے ہیں یعنی قدرت کیا چاہتی ہے، اس کا جواب اس کے ارادوں سے مل سکتا ہے۔ بالفاظ دگر وہ، وہی کرتا ہے جو قدرت چاہتی ہے وہ دنیا میں بھی حق و باطل کی میزان ہے، اور قیامت میں بھی۔ یعنی حق وہ ہے جسے مومن حق سمجھے، اور حق قرار دے۔ اِسی نکتہ کو اقبال نے بالِ جبریل میں یوں بیان کیا ہے :- ؎

غلامی کیا ہے؟ ذوقِ حسن و زیبائی سے محرومی
جسے زیبا کہیں آزاد بندے، ہے وہی زیبا

(۶) مومن، زخمیوں، مسکینوں، اور غمزدوں کے حق میں مونس اور ہمدرد ہوتا ہے، اور ظالموں اور زیردستوں کے حق میں طوفان اور بلائے بے درماں ہوتا ہے۔

دراصل یہ نظم وہ آئینہ ہے جس میں ہم اپنی صورت دیکھ کر یہ معلوم کرسکتے ہیں کہ ہم پاکستانی مسلمان کس حد تک مسلمان ہیں؟

(۷) مومن کی زندگی فطرت کے نغموں کی طرح دلکش ہوتی ہے، اور اِس میں فطرت کے قوانین کے ساتھ ایسی ہم آہنگی پائی جاتی ہے جیسی سورۃ رحمٰن کی آیتوں میں نظر آتی ہے۔ یہ اشارہ ہے اِس آیت کی طرف جو اس سورت میں مختلف آیتوں کے ساتھ آتی ہے یعنی فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ ط

(۸) میں اپنی شاعری میں قرآن کے حقائق و معارف بیان کرتا ہوں، اے مخاطب! تو ذرا غور تو کر، اور دیکھ تو سہی، ان میں سے کونسا نکتۂ معرفت تیرے دل کو بھاتا ہے، جو تجھے پسند آئے اُسی کو اختیار کرلے یقیناً تیرا مقدر سنور جائے گا۔

نوٹ :- یہ شعر تلازمۂ تصورات اور شاعرانہ رعایت لفظی کی نہایت عمدہ مثال ہے۔ جس سے اقبال کی قادر الکلامی ثابت ہوتی ہے۔ چونکہ پہلے مصرع میں اُنہوں نے اپنے اشعار کو "انجم" قرار دیا ہے (یہاں انجم، استعارہ ہے جس سے شعر مراد ہے اس لیے دوسرے مصرع میں "مقدر کا ستارہ" لائے ہیں، جس سے لطفِ کلام دوبالا ہو گیا ہے۔ "مقدر کا ستارہ" علم نجوم کی اصطلاح ہے RULING STAR یعنی وہ ستارہ جو انسان کے مقدر پر حکمراں ہوتا ہے۔ دوسرا اور شاعر کا اصلی مطلب یہ ہے کہ تو اِن اشعار میں سے جس شعر کو اپنے لیے منتخب کرے گا، وہی تیرے مقدر کا ستارہ بن جائے گا۔ یعنی اس پر عمل کرنے سے تیرا نصیبا جاگ اُٹھے گا۔

پنجابی مسلمان

اس نظم میں اقبال نے پنجاب کے مسلمانوں کی ذہنیت پر تبصرہ کیا ہے میں ان اشعار کا مطلب تو لکھے دیتا ہوں، لیکن اس بات کا فیصلہ کہ یہ تبصرہ کس حد تک صحیح اور برمحل ہے، خود ناظرین پر چھوڑے دیتا ہوں۔

(۱) فرماتے ہیں کہ پنجابی مسلمان مذہب کے باب میں بہت جدت پسند

واقع ہوا ہے۔ اگر وہ کسی عقیدہ کو آج قبول کرتا ہے تو چند روز کے بعد اُسے ترک کر دیتا ہے۔

(۲) اس کی طبیعت میں تحقیق کا مادّہ بہت کم ہے۔ یعنی مذہبی مسائل کی تحقیق سے اُسے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ ہاں اگر کوئی شخص پیر و مرشد ہونے کا دعویٰ کرے تو بلا تامل اُس کے ہاتھ پر بیعت کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ اور چونکہ اس میں تحقیق کا مادّہ بہت کم ہے اس لیے وہ یہ نہیں دیکھتا کہ یہ شخص اس لائق بھی ہے یا نہیں۔

(۳) اگر کوئی شخص قرآن وحدیث میں تاویلات رکیکہ کے ذریعہ سے اپنا دعویٰ ثابت کردے، تو چونکہ وہ مادّہ تحقیق سے عاری ہوتا ہے اس لیے بہت جلد اُس شخص کی خود ساختہ تاویلات پر ایمان لے آتا ہے اور آنکھ بند کر کے "جماعتِ صالحین" میں داخل ہو جاتا ہے۔

آزادی

اس نظم میں اقبالؔ نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ انگریزوں نے مسلمانوں کو کس قسم کی آزادی عطا فرمائی ہے۔ اس نظم میں طنز کا رنگ بہت نمایاں ہے۔

(۱) کہتے ہیں کہ انگریزوں نے مسلمانوں کو اس قدر آزاد کر دیا ہے کہ کسی شخص میں یہ جرأت نہیں کہ کسی مسلمان کو ٹوک سکے مثلاً کوئی شخص کسی مسلمان سے یہ دریافت نہیں کر سکتا کہ تم نماز کیوں نہیں پڑھتے روزے کیوں نہیں رکھتے؟ زکوٰۃ کیوں نہیں دیتے؟ شراب کیوں

پیتے ہو؟ جُوا کیوں کھیلتے ہو؟ الغرض ہر مسلمان حُرّیتِ افکار کی نعمت سے مالا مال ہے۔

(۲) مثلاً اُسے پوری آزادی ہے کہ اگر اس کا دل چاہے تو مسجد کو آتشکدہ بنا دے، یا اُسے گرجا میں تبدیل کر دے یا اُس میں کسی انگریز کا بُت نصب کر دے۔

(۳) چونکہ اُسے فکر (خیالات) کی پوری آزادی حاصل ہے اس لیے وہ اگر چاہے تو آیاتِ قرآنی کی من مانی تاویلات کر سکتا ہے۔ یعنی اُن کا وہ مطلب بیان کر سکتا ہے جو اُس کی ذاتی رائے کے مطابق ہو۔ انگریزوں نے اُسے اس حد تک آزاد کر دیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو نبوت کا دعویٰ بھی کر سکتا ہے۔ اور نئی شریعت ایجاد کر سکتا ہے۔

(۴) الغرض مملکتِ ہند میں مجھ کو عجب تماشا نظر آ رہا ہے، وہ یہ کہ اسلام تو محبوس ہے لیکن مسلمان آزاد ہے۔

نوٹ:۔ یہ نظم چونکہ ۱۹۳۵ء میں لکھی گئی تھی، اس لیے اِس میں "مملکت ہند" کا لفظ لکھا ہوا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اُس نے محض اپنے فضل و کرم سے "مملکت ہند" کو ختم کر دیا۔ اور ہمیں پاکستان عطا کر دیا، تاکہ ہم اس مملکتِ خداداد میں اسلام کو آزاد اور مسلمان کو پابند اسلام بنا سکیں۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ ہم پہلے خود مسلمان بنیں، پھر دوسروں کو مسلمان بننے کی تلقین کریں۔

اس سلسلہ میں اکبر الہ آبادی کا ایک شعر ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔

مُغوی تو ملیں گے تمہیں شیطان سے بہتر
ہادی نہ ملے گا کوئی قرآن سے بہتر

اشاعت اسلام فرنگستان میں

(پہلی)

اقبالؔ نے اس نظم میں فرنگیوں کی ذہنیت آشکارا کی ہے کہ انگریزوں کی پوری زندگی کا نظام، دین سے خالی ہے، اور اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اُن کی نگاہ میں "اُخوت" کی بنیاد مذہب نہیں ہے، بلکہ نسب یا نسل ہے، مثلاً منگولی نسل کا آدمی، آریائی نسل کے آدمی کا بھائی نہیں بن سکتا، یا مثلاً اگر کوئی برہمن، مسیحی مذہب قبول کرے تو انگریز کی نگاہ میں اس کا مرتبہ وہی رہے گا جو تبدیلِ مذہب سے پہلے تھا۔ اسی طرح اگر انگریز اسلام قبول کرے تو وہ مسلمان ہو جانے کے بعد بھی پاکستان کے مسلمان کو اپنا بھائی نہیں سمجھ سکتا۔

لَا و اِلّا

(دوسری)

اس نظم میں اقبالؔ نے کلمۂ توحید لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ کی ایک نئے انداز سے تفسیر کی ہے۔ اس کلمۂ طیبہ کے دو حصے ہیں لَا اِلٰہ اور اِلَّا اللہ اور اقبال اختصاراً ان کو لَا اور اِلّا سے تعبیر کرتے ہیں۔

جس طرح دانہ اگر شبستان خاکی (بطن زمین) سے سفر کر کے اُوپر نہ آتا تو فضائے نور میں شاخ پتے اور پھل نمودار نہ ہوتے، اسی طرح اگر انسان "لا" کی تاریکی (شبستان خاکی) سے نکل کر "اِلَّا اللہ" کی روشنی

(فضائے نور) میں نہ آئے تو ترقی نہیں کر سکتا۔ بلکہ اگر لَا، اِلَّا سے بیگانہ ہو جائے، یعنی اگر ایک شخص صرف لَا اِلٰہ پر اکتفا کرے تو یقیناً یہ قیام اس کے لیے پیام موت ثابت ہوگا۔

(۳) اسی طرح اگر کوئی قوم، مرتبۂ لَا اِلٰہ سے آگے نہ بڑھے یعنی انکارِ معبودانِ باطلہ کے بعد اقرار معبود برحق نہ کرے تو یقین کر لو کہ اس ملّت کا پیمانہ حیات لبریز ہو چکا ہے۔ یعنی وہ قوم دنیا میں ترقی نہیں کر سکتی کیونکہ زندگی کا تقاضہ یہ ہے کہ انسان ظلمت لا کے بعد وادی اِلَّا اللہ میں بھی قدم رکھے۔ باطل خداؤں کے انکار کے بعد سچے خدا کی ہستی کا بھی اقرار کرے۔

اُمرائے عرب سے

اس نظم میں اقبالؔ نے اُن اُمرائے عرب سے خطاب کیا جو سحرِ ساحرانِ فرنگ سے مسحور ہو کر حقائقِ اسلام سے بیگانہ ہو چکے ہیں۔ انگریزوں نے ترکوں کا اقتدار ختم کرنے کے لیے عربوں کو ورغلایا کہ ہم تمہیں "ترکان جفاپیشہ" سے آزادی دلا سکتے ہیں۔ اور دنیائے عرب پر تمہیں حکمراں بنا سکتے ہیں۔ اس لیے تم ترکوں کے خلاف بغاوت کرو۔ اور ہمارے علم کے نیچے اُن سے لڑو۔ عربوں کی المناک داستان سے قطع نظر کر کے اس حقیقت پر غور کیجیے جو اقبال نے بیان کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ افسوس! عربوں نے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ عالم عربی ARAB WORLD صرف عرب فلسطین، شام، اور عراق کا نام نہیں ہے، بلکہ وہ تمام ملک جو

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کلمہ پڑھتے ہیں، عالم عربی میں داخل ہیں۔

اب نظم کا مطلب بیان کرتا ہوں :-

(۱) اگر اُمرائے عرب مجھ سے ناراض نہ ہوں تو میں ایک بات اُن سے کہوں۔

(۲) افسوس! آپ لوگ اس حقیقت کو فراموش کر چکے ہیں کہ دنیا میں سب سے پہلے مسلمانوں ہی کو یہ نکتہ سکھایا گیا تھا کہ اب دُنیا میں صرف دو قومیں ہوں گی۔ مسلم اور غیر مسلم، اور دو عالم ہوں گے، عالم اسلام یا دنیائے مصطفویؐ۔ اور عالم کفر یا دنیائے بولہبی' اس تعلیم کی بنیاد یہ ہے کہ وصال یعنی اتحاد اور اخوت، یہ تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا ثمرہ ہے اور افتراق یعنی اقوام عالم کا مختلف طبقات میں منقسم ہو جانا، یہ کفر کی تعلیم کا نتیجہ ہے۔ بالفاظ دگر اُمت میں اتحاد پیدا کرنا، اسلامی تعلیم ہے' اور اُمت میں افتراق پیدا کرنا یہ سراسر بولہبی، یا کافرانہ تعلیم ہے۔

پس عالم عربی کا وجود، جغرافیائی حدود، یا مخصوص طبقات ارضی پر موقوف نہیں، بلکہ "محمدؐ عربی سے ہے عالم عربی"

عالمِ عرب (ARAB WORLD) وہ نہیں جہاں عرب آباد ہیں۔ بلکہ وہ تمام ممالک جہاں مسلمان رہتے ہیں، عالم عربی میں داخل ہیں۔ اس لیے ترکی، افغانستان، ایران، پاکستان اور بلوچستان بھی عالم عربی میں داخل ہیں۔ پس تم نے ترکوں کے خلاف بغاوت نہیں کی، بلکہ ملتِ اسلامیہ میں افتراق پیدا کر کے اور کافروں کا آلۂ کار بن کر، ابولہب کا طریقہ اختیار کر لیا۔

نوٹ :- ترکوں اور ملتِ اسلامیہ سے غداری کا نتیجہ سب عرب ممالک (مثلاً حجاز، شام، فلسطین، شرق اردن اور عراق) اچھی طرح بھگت رہے ہیں۔

احکامِ الٰہی

اس نظم میں اقبالؔ نے ایک عجیب و غریب نکتہ بیان کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مومن، تقدیر کا پابند نہیں، بلکہ احکام الٰہی کا پابند ہے۔

(۱) یہ مسئلہ کہ مومن، تقدیرِ الٰہی کا پابند ہے، یا احکامِ الٰہی کا۔؟ چنداں مشکل نہیں ہے۔ میں دو لفظوں میں سمجھا سکتا ہوں، سنو!

(۲) تقدیر تو ایک آن یا ایک دن میں سو مرتبہ بدل سکتی ہے۔ تقدیر کا پابند' ابھی ناخوش ہے، تھوڑی دیر میں خوش ہو جاتا ہے۔

(۳) بات کیا ہے؟ بات دراصل یہ ہے کہ تقدیر کے پابند تو فقط جمادات اور نبادات ہیں۔ اور مومن تو فقط احکام (الٰہی) کا پابند ہے۔ یعنی جمادات اور نباتات کی زندگی کی جو تقدیر اللہ نے معین فرما دی ہے (تقدیر بمعنی اندازہ یا طریق) اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، مثلاً :-

(ا) پہاڑ کی تقدیر یہ ہے کہ وہ ایک جگہ قائم رہے۔
(ب) ہوا اور پانی کی تقدیر یہ ہے کہ حرکت کرتے رہیں۔
(ج) شبنم کی تقدیر یہ ہے کہ اُوپر سے نیچے گرتی رہے۔
(د) تیتر کی تقدیر یہ ہے کہ شاہین کی خوراک بنتا رہے۔

(۵) آگ کی تقدیر یہ ہے کہ نیچے سے اُوپر کو جاتی رہے۔

لیکن مومن کا حال، جمادات و نباتات، اور عناصر کائنات سے بالکل مختلف ہے، وہ کسی خاص تقدیر کا پابند نہیں بنایا گیا۔ وہ تو احکام الٰہی کا پابند بنایا گیا ہے۔ اگر وہ احکام الٰہی یعنی شریعتِ محمدیہ کی کامل اطاعت پر کمربستہ ہو جائے، اور پھر اپنے طرزِ حیات سے کامل اطاعت کا ثبوت دے دے۔ (مطیع کامل بن جائے) تو اللہ اُس کی تقدیر بدل سکتا ہے، بلکہ تاریخ گواہ ہے کہ اللہ نے بارہا اِس کی تقدیر بدل دی۔

بدر کے میدان میں بظاہر تو یہ نظر آرہا تھا کہ کہاں ۳۱۳ آدمی جن کے پاس ہتھیار بھی پورے نہیں تھے، اور کہاں ایک ہزار آدمی جو ہر قسم کے اسلحہ سے آراستہ تھے بظاہر تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ کفارِ مکہ مٹھی بھر مسلمانوں پر غالب آجائیں گے۔ لیکن جب رسول اللہ نے سجدہ میں یہ عرض کی کہ "اے اللہ! یہ کمزور بندے تیرے نام کو بلند کرنے کے لیے یہاں آئے ہیں، انہیں فتح عنایت کر، تو اللہ نے ان لوگوں کی تقدیر بدل دی۔

الغرض اقبال اس حقیقت کو ذہن نشین کرنا چاہتے ہیں کہ جمادات اور نباتات اگر کوشش کریں، تو بھی اپنی تقدیر نہیں بدل سکتے، کیونکہ وہ تقدیر کے پابند ہیں۔ لیکن مسلمان اگر کوشش کرے، یعنی احکام الٰہی کی پابندی کرے تو اللہ اُس سے خوش ہو کر اُس کی تقدیر بدل سکتا ہے۔

نوٹ:۔ مسلمانانِ پاکستان کی ٹریجڈی یہ ہے کہ وہ احکامِ الٰہی کی پابندی تو کرتے نہیں، اور دُعا یہ مانگتے ہیں کہ اے اللہ ہماری تقدیر

بدل دے۔ حالانکہ یہ بات سنتہ اللہ کے خلاف ہے۔ تقدیر صرف احکامِ الٰہی کی پابندی سے بدل سکتی ہے۔ کاش مسلمان یہ سوچیں کہ جب ہم نہ تو نباتات کی طرح تقدیر کی پابندی کرتے ہیں، اور نہ انسان کی طرح احکام کی پابندی کرتے ہیں، تو اللہ اپنا فضل و کرم ہم پر کیسے نازل فرما سکتا ہے۔

اقبال کی تعلیم یہ ہے کہ اگر مسلمان، اطاعت احکام الٰہی میں کمال حاصل کرلیں تو اپنی تقدیر خود بنا سکتے ہیں۔ یعنی اللہ اُن کی دُعاؤں کو قبول فرمایا کرے گا۔

موت

اس نظم میں اقبال نے یہ بتایا ہے کہ موت، جس سے لوگ اس قدر خوفزدہ ہیں، دراصل زندگی کی اعلیٰ منازل میں سے ایک منزل کا نام ہے چنانچہ ایک مرتبہ اُنہوں نے دورانِ گفتگو میں مجھ سے یہ فرمایا تھا کہ "موت بھی زندگی ہی کی ایک شان ہے۔" موت کا مطلب یہ ہے کہ نفس کا تعلق جسم سے منقطع ہو جاتا ہے، نہ یہ کہ نفس پر فنائے کلی طاری ہو جائے، یا وہ نیست و نابود ہو جائے۔ فرماتے ہیں کہ

(۱) اگر کسی شخص نے دنیاوی زندگی میں اپنے دل کو زندہ کرلیا ہو، یعنی اپنی خودی کو، اطاعتِ احکامِ الٰہی کی بدولت، مرتبۂ کمال تک پہنچا دیا ہو، تو اُس کا دل لحد میں بھی زندہ رہتا ہے، بلکہ مزید روحانی ترقی کے لیے بیتاب رہتا ہے۔

(۲) چاند، ستارے، اجرامِ فلکی، نباتات، حیوانات، ان کی زندگی، بیشک مختصر ہوتی ہے۔ لیکن انسانی خودی اگر پختہ یعنی مستحکم ہوجائے تو پھر ابدی ہوجاتی ہے۔ اور خودی کو یہ استحکام، عشقِ الٰہی سے نصیب ہوسکتا ہے۔

(۳) موت کا فرشتہ تیرے جسم کو ضرور چھُوتا ہے، یعنی نفس کو جسم سے جُدا کردیتا ہے۔ اور یہی مفہوم ہے اس آیت کا "کُلُّ نَفۡسٍ ذَآئِقَةُ الۡمَوۡتِ"۔ ہر نفس موت کا ذائقہ ضرور چکھے گا۔ لیکن تیرے وجود کے مرکز یعنی خودی پر موت یعنی فنا طاری نہیں کرتا۔ پس اگر مومن اس حقیقت سے آگاہ ہوجائے تو وہ موت سے خوفزدہ ہونے کے بجائے، تبسم کے ساتھ اس کا استقبال کرے گا، کیونکہ اسے یقین ہے کہ موت میری خودی کو فنا نہیں کرسکتی۔ اسی مطلب کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے: ؎

نشانِ مردِ حق دیگر چہ گویم
چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

قم باذن اللہ

اس عنوان کا ترجمہ یہ ہے کہ اللہ کے حکم سے کھڑا ہوجا۔ یعنی زندہ ہوجا اس نظم میں اقبال نے بڑی عمدگی کے ساتھ مسلمان کو سرگرمِ عمل ہونے کی تلقین کی ہے۔

(۱) اے مسلمان! یہ سچ ہے کہ جہاں دگرگوں ہے، یعنی حالات سازگار

نہیں ہیں، اور تو مشکلات میں گھرا ہوا ہے۔ لیکن پر دامت کر، ہمت سے کام لے اور سرگرم عمل ہوجا۔ دُنیا کے حالات بیشک تیرے موافق نہیں ہیں لیکن اس حقیقت کو پیش نظر رکھ کر حالات بدل گئے ہیں، تو کیا ہوا، زمین و آسمان تو وہی ہیں، یعنی قوانینِ فطرت تو نہیں بدلے۔ اللہ کا قانون یہ ہے کہ جو شخص خدا کی راہ میں کوشش کرتا ہے، خدا ضرور اس کی مدد کرتا ہے۔ پس تو ہمت سے کام لے اور سرگرم عمل ہوجا۔

اللہ کا قانون مذکورہ بالا، اس آیت سے مستنبط ہے:۔

وَالَّذِيۡنَ جَاهَدُوۡا فِيۡنَا لَنَهۡدِيَنَّهُمۡ سُبُلَنَا	اور جو لوگ ہماری رضاجوئی کے لیے یعنی ہماری پسندیدہ راہوں پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں ہم یقیناً اُن کو اپنی راہیں دکھادیتے ہیں۔

---

(۲) جس خون نے نوائے اناالحق کو آتشیں کردیا تھا، تیری رگوں میں بھی وہی خون گردش کر رہا ہے۔ پھر تو کیوں نااُمید اور مایوس ہے! پس اللہ کا نام لے کر سرگرم عمل ہوجا۔

اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ حسین ابن منصور حلاج، روحانیت کے جس بلند مقام پر پہنچ گیا تھا، اے مسلمان! تو بھی اُس مقام پر پہنچ سکتا ہے۔

اناالحق کی تشریح یہ کلمہ ہماری ادبیات میں بہت مشہور ہے، تاہم اِس کی تشریح ضروری خیال کرتا ہوں۔ واضح ہو کہ حسین ابن منصور حلاج نے جو صرف منصور کے نام سے مشہور ہیں۔ ایک خاص جذبہ سے مغلوب

ہو کر انا الحق کہہ دیا تھا۔ علماء نے اس کلمہ سے وہی معنی مراد لیے جو لفظوں سے ظاہر ہوتے ہیں۔ یعنی میں حق (خدا) ہوں، اور اُن پر یہ الزام عائد کیا گیا کہ اُنہوں نے خدائی کا دعویٰ کیا ہے۔ چنانچہ اس الزام کی پاداش میں اُنہیں قتل کرا دیا۔

بعدازاں، بعض بزرگوں نے منصور کے اس قول کی تاویل کی اور اُن کو اہل اللہ میں شمار کیا۔ مثلاً شیخ اکبر ابن عربیؒ اور مولانا رومؒ نے اور ہندوستان کے دو مشہور بزرگوں، حضرت خواجہ باقی باللہ دہلویؒ اور حضرت مجدد الف ثانی سرہندیؒ نے اس قول کی تاویل کی ہے۔

مولانا روم نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ "انا الحق کا مطلب یہ ہے کہ میں کچھ نہیں ہوں، عدم محض ہوں، حقیقی وجود صرف خدا ہی کا ہے۔"

اِسی طرح حضرت خواجہ باقی باللہؒ نے لکھا ہے کہ انا الحق کے معنیٰ یہ نہیں ہیں کہ میں خدا ہوں، بلکہ یہ کہ میں نیست ہوں، اور صرف انا، یعنی وجودِ حق، حق ہے۔

ہمارے زمانہ میں اقبال نے بھی اپنے مذاق کے مطابق اِس قول کی تاویل کی ہے۔ چنانچہ گلشن راز جدید میں لکھتے ہیں کہ

بخود گم بہر تحقیقِ خودی شو
انا الحق گو، و صدیقِ خودی شو

یعنی خودی کی معرفت حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ میں گم ہو جا۔ "انا الحق" کہہ دے، اور اس طرح خودی کی حقانیت کا اثبات کر دے جیسا کہ اقبال نے خود مجھ سے کہا تھا، انا الحق، کا مطلب یہ ہے کہ اَنَا حق ہے۔

باطل نہیں ہے۔

میں نے یہ تصریح اس لیے کی ہے کہ ناظرین کو یہ معلوم ہو جائے کہ اقبال کو اس قول کی تاویل کی جرأت اس لیے ہو سکی کہ اُن سے پہلے بعض بزرگوں نے اس کی تاویل کی ہے۔

(۳) اے مسلمان! اگر تیرے مذہبی عقائد یا شعور میں پراگندگی، اور بے ربطی پیدا ہو گئی ہے تو رنجیدہ مت ہو، یہ سب فرنگی تعلیم کا قصور ہے، پس تو اللہ اور رسول اللہؐ کی زندگی بخش تعلیمات سے اس بے ربطی کو دُور کر دے، اور کلمۂ توحید سے اس "افسوں" کو باطل کر دے، اور اللہ کا نام لے کر سرگرمِ عمل ہو جا۔



تعلیم و تربیت

دوم

مقصود

اِس نظم میں اقبالؔ نے اپنے پیش کردہ "مقصود" کا موازنہ دُنیا کے دو مشہور حکیموں کے پیش کردہ مقصود سے کیا ہے۔ پہلے اسپنوزا کی تعلیم پیش کی ہے۔ پھر افلاطون کی، اور آخر میں اپنا نظریہ پیش کیا ہے۔

اِس نظم میں تین شعر ہیں، اور ہر شعر میں ایک فلسفی کے خیالات کا نچوڑ پیش کیا ہے۔ جب تک ان تینوں حکیموں کے فلسفہ سے پورے طور پر آگاہی نہ ہو، نہ شعروں کا مطلب پورے طور پر سمجھ میں آسکتا ہے، نہ اقبال کی ژرف نگاہی کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ لیکن یہ شرح اس تفصیل کی متحمل نہیں ہو سکتی اس لیے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس کتاب میں تو صرف اشعار کی شرح پر اکتفا کروں، اور ان حکمار کے فلسفہ کی تفصیل ایک جداگانہ کتاب میں لکھوں، جس میں صرف یہی تین شعر ہوں، ناظرین کی آگاہی کے لیے اسپنوزا اور افلاطون کے مختصر سوانح حیات درج کیے دیتا ہوں۔

حکیم اسپنوزاؔ، یہودی الاصل تھا۔ سنہ ۱۶۳۲ء میں ہالینڈ HOLLAND

نوٹ :۔ میں نے اسپنوزا کی زندگی اور اُس کے فلسفہ پر ایک مفصل مضمون لکھا تھا۔ جو رسالہ "معارف" سنہ ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اور افلاطون کے فلسفہ پر میرا ایک مضمون "ہمایوں" سنہ ۱۹۲۵ء میں اور دوسرا مضمون "شاہکار" سنہ ۱۹۳۰ء میں شائع ہُوا تھا۔ ۱۲

میں پیدا ہوا۔ ابتدا میں مذہبی تعلیم حاصل کی، لیکن فلسفہ کے مطالعہ کے بعد یہودی مذہب سے برگشتہ ہوگیا۔ چنانچہ سنہ ۱۶۵۶ء میں علمائے یہود نے اس کو جماعت سے خارج کر دیا۔ انجام کار اُس نے ہیگ (THE HAGUE) میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اور بقیہ عمر اسی شہر میں بسر کر دی۔ وہ عینکوں کے شیشے پالش کر کے اپنی روزی کماتا تھا، اور خلوت میں فلسفیانہ تصانیف میں مشغول رہتا تھا۔ اس کی تصانیف میں علم الاخلاق (ETHIES) سب سے زیادہ مشہور ہوئی۔ اسی کتاب میں اُس نے اپنا فلسفہ مدون کیا تھا۔ جو وحدۃ الوجود پر مبنی ہے۔ سنہ ۱۶۷۷ء میں وفات پائی۔

افلاطون، ملک یونان میں، سنہ ۴۲۷ء ق م میں پیدا ہوا تھا۔ پہلے مختلف اُستادوں سے فنون لطیفہ (شاعری مصوری اور موسیقی) اور فلسفہ حاصل کیا پھر سنہ ۴۰۷ء ق م میں سقراط کی شاگردی اختیار کی۔ سنہ ۳۹۹ء ق م میں سقراط کی وفات کے بعد مصر اور دیگر ممالک کا سفر کیا۔ اگرچہ وہ بہت بڑا فلسفی اور منطقی تھا، لیکن شاعری اور تصوف کا بھی ذوق رکھتا تھا۔ سنہ ۳۴۷ء ق م میں وفات پائی۔

اس کی تمام تصانیف ہم تک پہنچی ہیں۔ ان میں سے مکالمات، (THE DIALOGUES) اور جمہوریت (THE REPUBLIC) بہت مشہور ہیں۔

اس کے فلسفہ کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ دنیا جو آنکھوں سے نظر آتی ہے غیر حقیقی (UNREAL) ہے، اسی لیے فانی بھی ہے اور ناقص بھی۔ اصلی یا حقیقی دُنیا نگاہوں سے مخفی ہے۔ اور یہ دُنیا اُسی کا ظل یا عکس ہے۔

(۱) پہلے شعر میں اقبال نے یہ بتایا ہے کہ اسپنوزا کی رائے میں انسان کا مقصود یا نصب العین (IDEAL) حیات ہے۔ اور حیات کی اعلیٰ ترین صورت یہ ہے کہ ذی حیات، یعنی انسان کو خدا کی ہستی کا احساس ہو جائے۔ اور اس احساس سے اُسے روحانی لذّت یعنی سرور حاصل ہو۔ (یہ سرور ایک مستقل چیز ہے۔ اور انسان اسی حالتِ سرور میں ابد تک رہے گا۔

(۲) افلاطون کہتا ہے کہ حیات، شب تاریک میں شرر کی نمود سے زیادہ نہیں ہے۔ بس اس کی حقیقت اتنی ہی ہے جیسے اندھیری رات میں کوئی چنگاری ایک لمحہ کے لیے چمک کر فنا ہو جائے۔ یعنی حیات کوئی مستقل چیز نہیں ہے۔ اس لیے "حیات" انسان کا مقصود نہیں ہو سکتی، بلکہ دانشمند وہ ہے جو موت کو مقصود بنائے۔ کیونکہ موت کے بعد انسان اس غیر حقیقی دنیا سے رہائی پا کر حقیقی دنیا میں داخل ہو جائے گا۔

(۳) اقبال کہتے ہیں کہ انسان کا مقصود نہ زندگی ہے نہ موت ہے۔ بلکہ خودی ہے۔ یعنی اللہ نے انسان کو اس غرض سے پیدا کیا ہے کہ وہ اطاعتِ احکام الٰہی یا اتباع شریعت کی بدولت اپنی خودی کی مخفی قوتوں کو بروئے کار لا کر خلافت الٰہیہ کا مستحق بن سکے۔ جو شخص ان مخفی قوتوں کو بروئے کار نہیں لاتا وہ اپنی تخلیق کے منشار سے بیگانگی کا ثبوت دیتا ہے۔ بس اس کی زندگی اور موت یا اس کا وجود اور عدم دونوں یکساں ہیں۔ اللہ نے انسان کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ اپنے نفس کا تزکیہ کرے، تاکہ فلاح پائے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا[۱] اس پر دال ہے۔ پس اصلی مقصود "فلاح" ہے اور یہ منحصر ہے تزکیۂ نفس پر، جسے اقبال اپنی اصطلاح میں استحکام خودی سے تعبیر کرتے ہیں۔

زمانۂ حاضر کا انسان

اس نظم میں اقبال نے موجودہ زمانہ کے تعلیم یافتہ انسان کی حالت کا نقشہ کھینچا ہے کہ عقلی اعتبار سے تو اُس نے بہت ترقی کر لی ہے، لیکن روحانی اعتبار سے کوئی ترقی نہیں کی۔ کہتے ہیں کہ

(۱) موجودہ زمانہ کے تعلیم یافتہ انسان میں عشق کا جذبہ بالکل ناپید ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کی عقل اس کے حق میں موجبِ عذاب بن گئی ہے پس اُسے لازم ہے کہ وہ اپنی عقل کو دل کے تابع بنا کر اُسے اپنے حق میں مفید بنائے۔ اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں۔

اقبال کا فلسفہ یہ ہے کہ صرف وہ عقل انسان کے لیے مفید ہو سکتی ہے جو اُس کے دل کے تابع ہو۔ چنانچہ پیام مشرق میں لکھتے ہیں ؎

نقشے کہ بستۂ ہمہ اوہام باطل است
عقلے بہم رساں کہ ادب خوردۂ دل است

یعنی محض عقل کی بدولت تو نے جو کچھ سمجھا ہے وہ سب غلط ہے۔ اگر تو حقیقت سے آگاہ ہونا چاہتا ہے تو اپنی عقل کو عشق کے تابع کر دے۔

واضح ہو کہ مشہور جرمن فلسفی کانٹ (KANT) بھی یہی کہتا ہے کہ محض

---

[۱] جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کر لیا، وہ فلاح پا جائے گا۔ ۱۲

عقل، حقائق اشیا کا ادراک نہیں کرسکتی، وہ صرف مظاہر کو جان سکتی ہے۔

(۲) چنانچہ موجودہ زمانہ کا انسان، ستاروں کی گذرگاہیں تو معلوم کر رہا ہے لیکن خود اپنے افکار کی حقیقت سے واقف نہیں ہے، یعنی کائنات کا علم تو حاصل کر رہا ہے، لیکن اپنی حقیقت سے بے خبر ہے۔

(۳) اور فلسفیانہ مسائل میں اس قدر اُلجھا ہوا ہے کہ آج تک یہ نہ معلوم کرسکا کہ وہ طریقِ زندگی کونسا ہے، جس پر چلنے سے اُسے اطمینانِ قلب حاصل ہو سکتا ہے۔

(۴) اس نے سورج کی شعاعوں کو تو اپنے قابو میں کر لیا ہے لیکن اس کی زندگی بدستور سابق، تاریک ہے، یعنی سائنس میں بہت کچھ ترقی کر لی ہے۔ لیکن اپنے نفس کی اصلاح کی طرف سے بالکل غافل ہے۔

اقوامِ مشرق

(پہلی)

اس نظم میں اقبال نے ایشیا کی قوموں کی کوتاہ بینی پر ماتم کیا ہے جو مغربی تہذیب کو اپنے مرض کی دوا سمجھ کر، بے سوچے سمجھے اس کی تقلید کر رہی ہیں۔ کہتے ہیں کہ

(۱) جن لوگوں کی آنکھیں غلامی اور تقلید کی وجہ سے اندھی ہو گئی ہیں۔ ان کو واضح حقائق بھی نظر نہیں آسکتے۔

(۲) وہ اتنا بھی نہیں سمجھ سکتے کہ بھلا وہ مغربی تہذیب جو خود دم توڑ رہی ہے، دوسروں کو کس طرح زندہ کر سکتی ہے۔ یعنی جو تہذیب، مغربی

اقوام کو تباہی سے نہیں بچا سکی۔ وہ ہمیں کس طرح فائدہ پہنچا سکتی ہے؟

آج کل ترکی، مصر، شام، ایران، عرب اور پاکستان سب ممالک مغربی تہذیب کے اصول اختیار کر رہے ہیں۔ اور اتنا غور نہیں کرتے کہ اس تہذیب کی بنیاد تو لادینی پر ہے۔ لہٰذا یہ تہذیب مسلمانوں کو کیا فائدہ پہنچا سکتی ہے؟

آگاہی

(دوسری)

اس نظم میں اقبال نے صحیح شعور کی حقیقت واضح کی ہے کہتے ہیں کہ

(۱) جو شخص حصولِ سائنس کو مقصدِ حیات سمجھتا ہے، وہ اپنی خودی کے مقام سے واقف نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے وہ اس بات سے واقف ہو جائے کہ سب سے بڑا سیارہ کون سا ہے، اور وہ زمین سے کس قدر دُور ہے۔ لیکن علم ہیئت، اس کو، خودی کی معرفت عطا نہیں کر سکتا۔

(۲) دُنیا کی حقیقت سے وہی شخص آگاہ ہو سکتا ہے جو پہلے اپنی خودی اور اس کی حقیقت اور رفعت وعظمت سے آگاہ ہو جائے۔

(۳) نیز وہی شخص اس حقیقت سے واقف ہو سکتا ہے کہ انسان کے لیے کونسی چیز مفید اور جائز ہے اور کونسی چیز مضر، اور ناجائز ہے اور جب تک ایک شخص کو ان باتوں سے آگاہی حاصل نہ ہو، وہ

حقیقی معنیٰ میں انسان نہیں بن سکتا۔

مصلحینِ مشرق

(پہلی)

اس نظم میں اقبالؔ نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ مشرقی ممالک خصوصاً اسلامی ممالک اور غیر منقسم ہندوستان میں جو مصلحین پیدا ہوئے اُن سے مجھے یہ توقع نہیں کہ مشرقی قوموں اور مسلمانوں کی کوئی قرار واقعی اصلاح کر سکیں گے۔ جس طرح وہ ساقی جو بزم میں خالی بوتلیں لے کر آئے، اہلِ بزم کو شراب نہیں پلا سکتا، اسی طرح یہ مصلحین بھی نرے جادوگر ہیں ان کے پاس اصلاح قوم کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ اور اُن کی حقیقت یہ ہے کہ نئے خیالات تو اُن کے پاس کیا ہوتے، پُرانے خیالات بھی نہیں ہیں۔ یہ تو محض مغربی اقوام کے مقلد ہیں۔ اور قوم کو نفع کے بجائے نقصان پہنچاتے ہیں۔ جس طرح سامریؔ نے ایک بچھڑا بنا کر اپنی قوم کو گمراہ کر دیا تھا، اسی طرح یہ لوگ مصلحین کے لباس میں ظاہر ہوتے ہیں، اور غیر اسلامی اصول قوم کے سامنے پیش کرکے اُسے گمراہ کرتے ہیں۔ اور چونکہ قوم جاہل ہے اس لیے اُن کی باتوں میں آجاتی ہے۔

مغربی تہذیب

(دوسری)

اس نظم میں اقبالؔ نے مغربی تہذیب پر تنقید کی ہے، کہتے ہیں کہ:-

(۱) اس تہذیب کی روح پاکیزہ نہیں ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تہذیب سراسر لادینی پر مبنی ہے۔ اور چونکہ ایسا ہے اس لیے یہ تہذیب انسانوں کو روحانیت اور اخلاقِ حسنہ سے بیگانہ بنا دیتی ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جب انسان کی روح ناپاک ہو تو اس میں نہ پاک ضمیر پیدا ہو سکتا ہے نہ بلند خیال پیدا ہو سکتا ہے، اور نہ ذوقِ لطیف پیدا ہو سکتا ہے۔

(۲) جو قومیں اس تہذیب کی حامل ہیں، ان میں یہ تمام خوبیاں ناپید ہیں۔ اور آج کل دُنیا جس مُصیبت میں مبتلا ہے۔ اور جس تباہی کی طرف جا رہی ہے، وہ لازمی نتیجہ ہے اس تہذیب کا۔

اسرارِ پیدا

اس نظم میں اقبالؔ نے بعض حقائق و معارف بیان کئے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ

(۱) جس قوم کے نوجوان اپنی خودی کو فولاد کی طرح مضبوط بنا لیں، اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی۔ یہ ایک دلپذیر اسلوب بیان ہے، اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیے کہ شمشیر اُسی قوم کے حق میں مفید ہو سکتی ہے

جس کے نوجوان پہلے اپنی خودی کو مستحکم کر لیں، یعنی کسی نصب العین کے حصول کا جذبہ اپنے اندر پیدا کر لیں۔ اور اگر ان کے اندر، یہ جوہر پیدا نہ ہو سکے۔ تو پھر شمشیر، یعنی آلاتِ حرب بالکل بیکار ثابت ہوں گے کامیابی دراصل مذکورہ بالا جذبہ کی بنا پر حاصل ہوتی ہے، نہ کہ محض سامانِ جنگ کی بدولت۔

(۲) اے مخاطب! یہ دنیا اور اُس کے عناصرِ ترکیبی، سب تیرے سامنے ہیچ ہیں، کیونکہ یہ سب، اجرامِ فلکی، زمین و آسمان، چاند سورج، جمادات اور نباتات مجبور ہیں۔ ان کو اپنی مرضی سے زندگی بسر کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ مثلاً آگ کو یہ اختیار نہیں کہ جلانا چھوڑ دے، لیکن تو خلیفۃ اللہ ہے۔ تجھ کو اللہ نے وہ نعمت عطا کی ہے جو کائنات میں کسی کو عطا نہیں کی، اور وہ نعمت، آزادی یا اختیار ہے۔ تجھ کو یہ اختیار ہے کہ اگر تو چاہے تو اپنی خودی کو بلند کر سکتا ہے اس قدر بلند کہ خلافتِ الٰہیہ کے مقام پر فائز ہو سکتا ہے۔ پس تو اِس نعمت کی قدر کر، اور اس مقام کو حاصل کرنے کی کوشش کر۔

(۳) اس کائنات میں اللہ نے ہر جگہ اور ہر چیز میں کوئی نہ کوئی نعمت یا دولت پوشیدہ رکھی ہے۔ اور اس سے مقصد یہ ہے کہ انسان اس کے حصول کی کوشش کرے۔ مثلاً اللہ نے اپنی حکمت سے صدف کے اندر موتی پنہاں کر دیا ہے۔ اب یہ انسان کا کام ہے کہ وہ موجوں کی طرح اپنے اندر ذوقِ طلب پیدا کرے اور یہ نعمت یا دولت حاصل کرے۔ پس انسان کو موجوں سے جد و جہد کا سبق سیکھنا چاہیئے۔

(۴) اب اگر تجھے یہ اندیشہ لاحق ہو کہ مسلسل کوشش سے شاید میں تھک جاؤں گا تو شاہین کی زندگی سے سبق سیکھ! آج تک کسی نے کسی شاہین کو مسلسل پرواز کی بنا پر، تھک کر گرتے ہوئے نہیں دیکھا، کیوں؟ اس لیے کہ وہ طاقتِ پرواز آتے ہی اُڑنا شروع کر دیتا ہے اور کثرت و شدتِ پرواز سے اپنے اندر اس قدر طاقت پیدا کر لیتا ہے کہ تھکن اُس کے پاس نہیں آ سکتی۔ اسی طرح تو رات دن کوشش کیے جا، اسی کوشش سے تیرے اندر سعیٔ پیہم کی طاقت پیدا ہو جائے گی۔

سلطان ٹیپو کی وصیّت

اس دلپذیر نظم میں علامہ نے سلطان شہید کی سیرت بیان کی ہے، اور اُن اصولوں کی وضاحت کی ہے، جن پر یہ "مردِ مومن" ساری عمر کاربند رہا۔ واضح ہو کہ اقبالؔ کو، سلطان شہید سے بہت عقیدت تھی، چنانچہ اُنہوں نے اپنے شاہکار (اور اسی لیے غیر معروف) جاویدؔ نامہ میں چند سطریں نہیں، بلکہ آٹھ صفحے اس مردِ مجاہد کے ذکرِ جمیل کی نذر کیے ہیں۔

مسلمان اس نامور فرزندِ اسلام کی سیرت سے اس لیے بے خبر ہیں، کہ وہ انگریزوں کا جانی دشمن تھا۔ اور اُس کی شہادت کے بعد یہ دشمنِ اسلام گروہ، ہندوستان پر قابض ہو گیا۔ اس لیے اُسے ہندوستان کی تاریخ میں اِس مردِ مومن کا تذکرہ ایسے نفرت انگیز پیرایہ میں کیا، کہ پڑھنے والوں کو اِس سچے مسلمان سے عقیدت درکنار، نفرت ہو

گئی۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ اس مردِ حُر کا وجود کُفر کے سیلاب کے مقابلہ میں ایک بند تھا، افسوس کہ ۱۷۹۹ء میں یہ بند ٹوٹ گیا، اور کفّار فرنگ کا سیلاب ملک پر محیط ہوگیا۔

میں اپنے دعوے کے اثبات میں حسب ذیل حقائق پیش کرتا ہوں۔

۱۔ شہادتِ سلطان ۱۷۹۹ء
۲۔ پورے دکن پر اقتدار ۱۸۰۰ء
۳۔ کرناٹک پر قبضہ، ۱۸۰۱ء
۴۔ روہیلکھنڈ اور مشرقی یوپی پر قبضہ، ۱۸۰۱ء
۵۔ دلّی پر قبضہ، ۱۸۰۳ء
۶۔ ہلکر کی شکست اور وسط ہند پر اقتدار، ۱۸۰۵ء
۷۔ کاٹھیاواڑ اور گجرات پر اقتدار، ۱۸۰۷ء
۸۔ راجپوتانہ پر اقتدار، ۱۸۱۷ء
۹۔ مرہٹوں کا خاتمہ، ۱۸۱۸ء

یعنی بیس سال کی قلیل مدت میں پنجاب کے علاوہ سارا ہندوستان یونین جیک کے سایۂ بوم پایہ کے نیچے آگیا۔

سلطان کا اصلی نام فتح علی خاں تھا۔ ۱۷۵۱ء میں پیدا ہوا۔ شجاعت اور مردانگی دلیری، اور جانبازی، یہ خوبیاں اُس کی سرشت میں داخل تھیں۔ چنانچہ باپ نے ۱۷۶۶ء میں اپنی فوج میں ایک رجمنٹ کا افسر بنا دیا۔ اور اس بطلِ جلیل نے ۱۷۶۷ء میں جبکہ اس کی عمر صرف ۱۶ سولہ سال کی تھی، مرہٹوں کے مقابلہ میں پہلی کامیابی حاصل کی، ۱۷۹۹ء

میں ۴۔ مئی کو میر صادق اور دوسرے غدّارانِ مملکت کی بدولت، میدان جنگ میں شہادت حاصل کی۔ گویا ہندوستان میں مسلمانوں کی سطوت کا خاتمہ ہوگیا۔

اُسی دن رات کے نو بجے انگریزوں نے سلطان شہیدؒ کی نعش بہت تلاش کے بعد کشتوں کے انبار میں سے نکالی تو دیکھا کہ شمشیر آبدار اُسی طرح اُس مردِ مجاہد کے ہاتھ میں ہے۔ چونکہ اُس کا قبضہ خون آلود تھا، اس لیے بصد مشکل، معشوق کو عاشق سے جُدا کیا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ کارکنانِ قضاء و قدر نے اُس رات سلطان ٹیپو کے ہاتھ سے تلوار نہیں لی، بلکہ مشرق میں مسلمانوں کے ہاتھ سے تلوار لے لی اور یہ میرے ہی جذبات نہیں ہیں، اُس زمانہ کے مسلمانوں نے بھی سلطان کی شہادت کو مسلمانوں کی حکومت کے خاتمہ سے تعبیر کیا تھا چنانچہ ایک شاعر نے سلطان کی تاریخ شہادت جس مصرع سے نکالی وہ میرے دعویٰ پر شاہد ہے۔ ع

خرد گفت تاریخ "شمشیر گم شد"
سنہ ۱۲۱۴ ھ

"شمشیر گم شد" کے اعداد سے تاریخ شہادت نکلتی ہے۔ اور تاریخ مشرق گواہ ہے۔ کہ مسلمانوں کی تلوار واقعی گم ہوگئی۔ اور اس سے بھی زیادہ افسوس یہ ہے کہ وہ گم شدہ تلوار ابھی تک نہیں ملی۔ غور سے دیکھا جائے تو اقبال کا پیغام اس کے علاوہ اور کیا ہے کہ مسلمان اس شمشیر جگر دار کو پھر کہیں سے ڈھونڈھ نکالیں۔

(۱) اے مسلمان! تو اللہ کا عاشق ہے، اور تیرا مقصدِ حیات اُس

تک پہنچنا ہے، اس لیے "منزل" قبول نہیں کر سکتا، یعنی دُنیا سے دل نہیں لگا سکتا، اور اس دُنیا کی بڑی سے بڑی نعمت یا لذّت تجھ کو راہِ حق سے باز نہیں رکھ سکتی۔

(۲) تو ہر دم ترقی کی کوشش کر، اور باطل کا مقابلہ کر۔ اگر دُنیا تجھے عافیت اور سکون کی طرف بلائے۔ تو اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی مت دیکھ۔ مومن عیش کی زندگی کے لیے نہیں پیدا ہوا۔

(۳) تو دُنیا کی فانی دلچسپیوں میں منہمک ہو کر اپنے مقصدِ حیات سے غافل مت ہو۔ تو محفل گداز ہے، یعنی عیش و عشرت کا دشمن ہے، اس لیے ان چیزوں کی طرف توجہ مت کر، جو تجھے میدان جہاد سے باز رکھ سکتی ہیں۔ مثلاً دولت، عورت اور دنیاوی شوکت وغیرہ۔

(۴) اسلامی تعلیمات نے مجھ پر یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ اپنے دل کو عقل کے تابع نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ عقل تو یہی کہتی ہے کہ میدانِ جنگ میں جان کا خطرہ ہے۔ حالانکہ مسلمان کا فرض منصبی تو جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ اور جہاد نام ہی اپنی زندگی کو خطرہ میں ڈالنے کا ہے۔

(۵) باطل کی تعلیم یہ ہے کہ خدا کے ساتھ، طاقت ور انسان یا قوم کی اطاعت بھی کرو۔ اور حق کی تلقین یہ ہے کہ خدا کے علاوہ اور کسی کی اطاعت مت کرو، چونکہ تو حق پرست ہے، اس لیے حق کے ساتھ باطل کو شامل مت کر یعنی اللہ کے سوا اور کسی کی اطاعت مت کر۔

نوٹ:۔ سلطان شہید کی زندگی ان اشعار کی جیتی جاگتی تصویر تھی اُس نے انگریزوں کی غلامی پر موت کو ترجیح دی، کیونکہ مسلمان اللہ کے

علاوہ اور کسی کا غلام نہیں ہو سکتا۔ کاش یہ نکتہ نظام علی خاں، غلام حیدر آباد اور محمد علی، غلام کرناٹک کی سمجھ میں بھی آجاتا تو ہندوستان کی تاریخ آج بالکل مختلف ہوتی، واحسرتا!

غزل

اس غزل میں اقبالؔ نے بعض حقائق و معارف بیان کئے ہیں۔ کہتے ہیں۔ کہ

(۱) جب تک انسان، اپنی حقیقت سے آگاہ نہیں ہوتا، اُس کا زاویۂ نظر محدود ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اپنے آپ کو مختلف ملکوں سے منسوب کرتا ہے۔ لیکن جب وہ اس حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے کہ اللہ ساری کائنات کا خالق اور رب ہے، اور سب لوگ ایک آدم کی اولاد ہیں۔ تو اُس کا زاویۂ نگاہ آفاقی ہو جاتا ہے۔ پھر وہ عراقیؔ یا ہندیؔ یا حجازیؔ کے امتیازات سے بالاتر ہو جاتا ہے۔ اس کی نظر میں عجمی بھی اللہ کی مخلوق ہے، اور انسان ہے۔ اور ایرانی بھی۔ وہ پھر مختلف قوموں میں کوئی امتیاز نہیں کرتا، اور سب سے محبت کرتا ہے۔

(۲) اے مخاطب! تو زندگی کا مقصد یہ سمجھتا ہے کہ انسان جتنے زیادہ دنوں تک زندہ رہ سکے، اتنا ہی اچھا ہے۔ لیکن میں زندگی کا مقصد یہ سمجھتا ہوں کہ انسان، جہاد فی سبیل اللہ میں مشغول رہے۔ اور طول حیات کی تمنا نہ کرے۔ اس لیے میں تیری نظر میں کافر ہوں، اور تو میری نظر میں کافر ہے۔

(۳) اسلام تو انسان کو شاہباز بنانا چاہتا ہے۔ لیکن اس دَورِ غلامی میں دین اسلام کا مفہوم ہی بدل گیا ہے، اب شریعتِ اسلامی کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کمزور بلکہ اہنسا کا پجاری بن جائے۔ پس اچھا ہوا کہ تو بھی بدل گیا۔ کیونکہ باز کی زندگی، چکور کی زندگی سے بالکل مختلف ہوتی ہے تیتر، بھلا باز کی زندگی کیسے اختیار کر سکتا ہے؟

(۴) اے مسلمان! تیری زندگی میں مجھے عشق کا وہ جذبہ نظر نہیں آتا جو تیری عقل کی اصلاح کر سکے، اور جب تک عقل انسانی عشق کے تابع نہ ہو، وہ انسان کے حق میں مفید نہیں ہو سکتی۔

(۵) اگر شاعر، اپنے کلام میں، زندگی کے حقائق پیش نہیں کرتا تو اس کی شاعری قوم کے حق میں ہلاکت کا پیغام بن جاتی ہے۔ انیسویں اور موجودہ صدی کی اُردو شاعری پر نگاہ ڈالنے سے اس شعر کی صداقت واضح ہو سکتی ہے۔ اور افسوس یہ ہے کہ مسلمان قوم ابھی تک اسی مہلک قسم کی شاعری میں مبتلا ہے۔ بلکہ قیامِ پاکستان کے بعد تو یہ مرض روز افزوں ہے۔

بیداری

اس نظم میں اقبالؔ نے یہ بتایا ہے۔ کہ جب کسی انسان کی خودی بیدار ہو جاتی ہے، یعنی اُسے معرفت حاصل ہو جاتی ہے، تو اس بیداری یا شعور یا آگاہی یا وقوف سے کیا نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ اور اس شخص کی زندگی میں کیا انقلاب پیدا ہو جاتا ہے، کہتے ہیں کہ :۔

(۱) جو شخص اپنی حقیقت سے آگاہ ہو جاتا ہے، وہ کبھی باطل یا کفر سے نہیں ڈرتا، بلکہ اس میں باطل کو فنا کرنے کے لیے "تلوار کی سی تیزی" پیدا ہو جاتی ہے۔ مختصر یہ کہ اس کا وجود، باطل شکن اور کفر پاش بن جاتا ہے۔

(۲) وہ کائنات کی ہر شئے سے واقف ہو جاتا ہے، ہر ذرّہ میں، ایک قوّت پوشیدہ ہے۔ جو اُبھرنا اور طلوع ہونا چاہتی ہے۔ مردِ مومن اس پوشیدہ قوّت سے بھی واقف ہوتا ہے۔ القصّہ اسرار و رموز کائنات اُس پر منوّر ہو جاتے ہیں۔ اور بغیر کتابوں کا مطالعہ کئے وہ عالم بن جاتا ہے۔

(۳) سچ تو یہ ہے کہ ہمیں (تجھے اور مجھے) اُس مردِ خدا سے کوئی نسبت ہی نہیں، اور ہم اُس کے مقام کی بلندی کا تصوّر ہی نہیں کر سکتے جس طرح اندھا گلاب کے رنگ کا تصور نہیں کر سکتا۔ اور بہرا موسیقی کی دلکشی کا تصور نہیں کر سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم زمان و مکان کی قید میں ہیں اور وہ زمان و مکان پر حکمراں ہوتا ہے۔

واضح ہو کہ یہ اقبالؔ کا محبوب موضوع ہے۔ اور اُنہوں نے اس نکتہ کو ہر ممکن طریق سے ادا کیا ہے۔ افسوس کہ میں اُن کی کتابوں سے مثالیں دے کر اس شرح کو ضخیم اور دشوار بنانا مناسب نہیں سمجھتا۔ لیکن ناظرین کو یہ مشورہ دے سکتا ہوں کہ کلام اقبالؔ کو صرف ریڈیو پر سن لینا کافی نہیں ہے، اُسے سمجھنے کی بھی کوشش کرنی چاہیئے۔ اقبال کا پیغام یہ ہے کہ مسلمان اس حقیقت سے آگاہ ہو جائیں کہ دین اسلام، اُن کو زمان و مکان پر قدرت عطا کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ مسلمان اسلام کو دین (ضابطۂ حیات) سمجھ کر اُسے اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں حاکم تسلیم کر لیں۔ لیکن ہمارا حال تو

یہ ہے کہ جب مسجد میں گئے تو اللہ سے اقرار کر لیا کہ ہم تیرے سوا نہ کسی کی اطاعت کرتے ہیں، اور نہ کسی سے امداد طلب کرتے ہیں۔ (اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ) اور جب باہر نکلے تو فوراً اپنے طرزِ عمل سے اس قول کی تردید کر دی۔ اندریں حالات ہمیں حکومت اور طاقت حاصل ہو گی۔ یا ذلّت اور مسکنت ؟ غور سے دیکھو کیا یہ صریح منافقانہ روش نہیں ہے؟ بس اقبالؔ یہی چاہتے ہیں کہ تم اپنے قول اور فعل میں مطابقت پیدا کرو پھر دیکھو تمہارے اوپر اللہ اس قدر فضل کرے گا کہ تم دنیا تو کیا چیز ہے زمان و مکان پر حکومت کر سکو گے۔

افسوس کہ مسلمان اس طرف تو متوجہ ہوتے نہیں۔ غیر ضروری باتوں میں اپنا وقت ضائع کرتے رہتے ہیں۔

(۴) کہتے ہیں کہ تو بالکل مُردہ ہے، تجھ میں حقائقِ کائنات کا علم حاصل کرنے کی طلب بھی پیدا نہیں ہوئی اور مردِ مومن تقویٰ کی بنا پر اعماقِ حیات (زندگی کی گہرائیوں) تک سے واقف ہو جاتا ہے۔ یعنی وہ تو کامیاب ہو گیا، اور تجھ میں کامیابی کی آرزو بھی پیدا نہیں ہوئی۔

خودی کی تربّیت

(پہلی)

(۱) اگر انسان اپنی خودی کی تربّیت کرے، یعنی سچّے دل سے اتباعِ شریعت کرنے لگے تو اس میں اس قدر طاقت پیدا ہو سکتی ہے کہ انسان

جو مٹی سے بنا ہے، باطل کو پھونک سکتا ہے یعنی مٹی میں آگ کی صفت پیدا ہو سکتی ہے۔

(۲) یاد رکھو! اللہ کے انعامات کا مستحق بننے کا طریقہ ایک ہی ہے اور وہ شروع سے یکساں چلا آ رہا ہے۔

"ہوائے دشت و شعیبؑ و شبانیٔ شب و روز"

(ا) ہوائے دشت = لفظی معنیٰ، جنگل کی فضا، یا صحرا کا ماحول۔ مراد ہے پاکیزہ زندگی۔ (کیونکہ ہوائے دشت عموماً صاف ہوتی ہے)

(ب) شعیبؑ = نام۔ ایک نبی کا ہے۔ مراد ہے" مرشد یا خدا رسیدہ انسان۔

(ج) شبانی = بھیڑیں چرانا، مراد ہے مرشد کی خدمت کرنا، یا اطاعت کرنا۔

اب سوال یہ ہے کہ اس زمانہ میں کتنے مسلمان ہیں جو شہروں کے ناپاک اور غلیظ ماحول سے بچنا چاہتے ہیں، یا اس گندے ماحول سے بچ کر پاکیزہ ماحول یعنی علماء اور صلحاء کی صحبت میں رہنا چاہتے ہیں؟ پھر کتنے مسلمان ہیں جو کسی مرشد کامل کی صحبت میں رہنا چاہتے ہیں؟ صحبت تو بڑی چیز ہے، کتنے مسلمان ہیں جن کے دل میں مرشد کی تلاش کی آرزو پیدا ہوتی ہے! اور یہ مسلّم ہے کہ خودی کی پرورش اور تربیت، مرشد کے بغیر ناممکن ہے۔ صحابۂ کرامؓ اگر ۱۳ سال تک ایک مرشد کامل کی صحبت نہ اُٹھاتے اور صحبت کی بدولت، اپنی خودی کی تربیت نہ کرتے تو ۲ھ میں کفر کا مقابلہ کیسے کر سکتے تھے؟ بلکہ صحبت کا شرف حاصل نہ ہوتا تو اُنہیں مسلمانوں پر یہ فضیلت کیسے حاصل ہوتی۔ مثلاً اُن میں بہت سے اُمّی

محض تھے۔ پھر اُنہیں امام رازی پر کیسے تفوق حاصل ہو گیا؟

قصہ مختصر، جب تک مسلمانانِ پاکستان اس نکتہ کو حرزِ جاں نہیں بنائیں گے، اُن کی ترقی کی کوئی صورت نہیں ہے۔ کیا خوب فرمایا حکیم سعدیؒ نے۔ ؎

خلافِ پیمبر کسے رہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

آزادیٔ فکر

(دوسری)

اقبال کہتے ہیں کہ آج کل حُریتِ فکر کا بہت چرچا ہے، جسے دیکھو، "آزادیٔ فکر کا وکیل بنا ہوا ہے، اور پوری قوت کے ساتھ کہتا ہے کہ آزادیٔ فکر ہمارا پیدائشی حق ہے۔ مطلب اس سے یہ ہوتا ہے کہ اس دَور میں ہر شخص کو غور و فکر، سوچ وچار، اور اپنے خیالات کے اظہار کی آزادیٔ ہونی چاہیئے۔

اقبالؔ کہتے ہیں کہ بلاشبہ آزادیٔ فکر بہت اچھی بات ہے۔ لیکن جن لوگوں کو تفکرؔ یعنی فکر کرنے کا طریقہ نہیں آتا، جو تدبر یعنی غور و فکر کے مبادی سے بھی واقف نہیں ہیں، اگر وہ اپنے ناقص اور خام خیالات لوگوں کے سامنے پیش کر دینا شروع کر دیں گے تو خود بھی تباہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی تباہ کریں گے۔ کیونکہ اندھا اندھوں کو راستہ نہیں دکھا سکتا۔

فکر، اگر خام ہو، یعنی اگر کسی انسان نے، مرشد کامل کی صحبت میں بیٹھ کر اپنی فکر (عقل) کو پختہ نہیں کیا ہے، تو وہ قرآن مجید کا مطلب بھی غلط سمجھے گا، اور حدیث کا مفہوم بھی اُس پر واضح نہیں ہو گا۔ پس وہ لوگوں کو بھی غلط راستہ پر چلائے گا، اور خود بھی غلط راستہ پر چلے گا اقبالؔ کہتے ہیں کہ اگر آپ کسی انسان کو حیوان بنانا چاہتے ہیں، تو جس شخص کی فکر ابھی خام ہو اُسے آزادی افکار عطا کر دیجئے۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ موٹر چلانی اچھی بات ہے۔ لیکن جس شخص کو چلانے کا طریقہ نہیں آتا وہ اگر موٹر چلائے گا، تو موٹر بھی ٹوٹ جائے گی، اور خود اُس کی ہڈیاں بھی چور چور ہو جائیں گی۔ پس جس طرح موٹر چلانا ایک فن ہے، سوچنا بھی تو ایک فن ہے، اور بغیر اُستاد، نہ وہ آسکتا ہے، نہ یہ

خودی کی زندگی

اس نظم میں اقبال نے یہ بتایا ہے کہ اگر خودی زندہ ہو جائے تو کیا ثمرات مرتب ہوتے ہیں، اور انسان کی زندگی میں کیا انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ

(۱) اگر کسی شخص کی خودی، زندہ ہو جائے، یعنی اطاعت، یا اتباع شریعت کی بدولت، مرتبہ کمال کو پہنچ جائے تو اُسے فقیری میں بھی بادشاہی کا لطف حاصل ہو سکتا ہے۔ صاحب فقر کا مرتبہ سنجرؔ اور طغرلؔ[1] سے

---

[1] طغرل اور سنجر ترکوں کے سلجوقی خاندان میں دو نہایت زبردست اور مشہور بادشاہ گذرے ہیں۔ ۱۲

کسی طرح کم نہیں ہوتا۔

(۲) اگر خودی زندہ ہو جائے، تو انسان معجزے دکھا سکتا ہے۔ اس کے سامنے سمندر بھی پایاب ہو جاتا ہے (اشارہ ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف جن کے روحانی تصرف سے بحر قلزم پایاب ہو گیا تھا) اور پہاڑ جو نہایت سخت چیز ہے، ریشم کی طرح نرم ہو جاتا ہے، یعنی دشوار کام آسان ہو جاتے ہیں۔

(۳) مثال کے طور پر دیکھ لو، نہنگ اگر زندہ ہے تو سمندر میں بھی آزاد ہے، اور اُس کی موجوں کو چیر کر جدھر چاہے جا سکتا ہے، لیکن اگر وہ مر جائے تو سمندر کی موج در کنار، وہ سراب کی موج کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتا، یعنی ریت میں بھی حرکت نہیں کر سکتا۔ اسی طرح انسان کی زندگی دراصل اُس کی خودی کی بیداری سے عبارت ہے. اگر خودی مُردہ ہے تو وہ انسان بھی مُردہ ہے، گو بظاہر زندہ نظر آتا ہے۔

گرچہ کالج کا جواں زندہ نظر آتا ہے!
مردہ ہے مانگ کے لایا ہے فرنگی سے نَفَس

حکومت

اس نظم میں اقبال نے، استعارے اور مجاز کے رنگ میں اور اپنے مخصوص انداز میں حکومت کے حصول کا طریقہ بتایا ہے۔ (بادہ و مینا سے حکومت مراد ہے)

(۱) عام مسلمان تو میری باتوں کو غور سے سُن سکتے ہیں۔ لیکن صوفی اور مُلاّ

میری سچی باتوں کو پسند نہیں کرتے۔

یہاں صوفی سے مراد ہے وہ شخص جو مسلمانوں کو غیر اسلامی تصوف کی تعلیم دیتا ہے۔ اور غیر اسلامی تصوف سے میری مراد، ہر وہ تعلیم ہے جو مسلمان کو عمل سے بیگانہ بنا دے، یا اس کی قوّتِ عمل کو کمزور کر دے۔

اسی طرح مُلاّ سے مراد ہے وہ تنگ نظر، قدامت پرست اور مقلدِ کور مذہبی پیشوا جو اپنے ماحول اور حالات حاضرہ سے بے خبر، حجرہ میں بیٹھا ہوا، مسلمانوں کے اندر فروعی اختلافات کو تقویت دیتا رہتا ہے۔ دُنیا کہیں سے کہیں چلی گئی۔ لیکن وہ ابھی تک اسی بحث میں اُلجھا ہوا ہے۔ کہ "آمین" زور سے کہی جائے یا آہستہ سے؟

اقبال کی رائے میں مسلمانوں کی پستی اور خواری کے ذمہ دار تین گروہ ہیں۔ اول وہ امرار جو عیاشی اور بدکاری میں مصروف رہتے ہیں۔ اور قوم کے سامنے بُرا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ دوم وہ صوفی جو خانقاہوں میں مسلمانوں کو اللہ کی اطاعت کے بجائے اپنی اطاعت کا سبق دیتے ہیں۔ اور ان میں غیر اسلامی خیالات پیدا کرتے ہیں، جن کا لازمی نتیجہ کاہلی اور بے عملی اور جہاد سے گریز ہے۔ سوم وہ علمار جو مدرسوں میں مسلمانوں کو غیر ضروری یا فروعی مسائل میں اُلجھا کر ایک طرف مقاصدِ حیات سے غافل کرتے ہیں دوسری طرف ان میں اختلاف و افتراق پیدا کرتے ہیں۔

اقبال نے یہ کوئی نئی تشخیص نہیں کی ہے۔ اُن سے مدتوں بلکہ صدیوں پہلے ایک شاعر نے صرف ایک شعر میں مسلمانوں کے مرض کی یہی تشخیص واضح طور پر بیان کر دی ہے۔

وما افسد الدین الا الملوك　　　واحبار سوء ورهبانها

اور دین اسلام کی تخریب نہیں کی، مگر ان تین گروہوں نے :-
ملوک[1]، علمائے سوء[2] اور رہبان[3] یا صوفیاء۔ تاریخ شاہد ہے کہ ان تینوں طبقات نے مل کر دین اسلام کو بالکل مسخ کر دیا۔

(۲) اب اقبال یہ بتاتے ہیں کہ صوفی اور ملا کا قصور کیا ہے۔؟ یعنی وہ جوان دونوں سے ناراض ہیں، تو کیوں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جاہل صوفی اور تنگ نظر ملا، دونوں ایک ہزار سال سے مسلمانوں کو ذات وصفات باری تعالیٰ کے پیچیدہ اور لاینحل مسائل میں الجھائے ہوئے ہیں اور اس غلط بلکہ گمراہ کن روش کا نتیجہ یہ ہے کہ قوم، کردار یعنی عمل اور جہاد سے بیگانہ ہو گئی ہے۔

اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جو قوم بھی ذات وصفات کی بحث میں گرفتار ہو جائے گی، وہ عمل صالح اور جدوجہد سے بیگانہ ہو جائے گی، تاریخ عالم سے چند مثالیں پیش کرتا ہوں :-

(ا) جب اہلِ یونان، ذات وصفات کی بحثوں میں مبتلا ہوئے تو رومیوں کے غلام بن گئے۔ ۵۲۹ء

(ب) جب اہل ایران، ان مباحث میں گرفتار ہوئے تو عربوں کے غلام بن گئے۔ ۶۲۸ء

(ج) جب اہلِ ہند، ان بحثوں میں منہمک ہوئے، تو ترکوں کے غلام بن گئے ۱۲۰۶ء

(د) جب رومی عیسائی، ان مسائل میں اُلجھے، تو مسلمانوں کے غلام بن گئے۔ ۱۴۵۳ء

(ہ) جب مسلمان اِن مسائل میں گرفتار ہوئے، تو انگریزوں کے غلام

بن گئے۔ ۱۸۰۳ء

اگر ان تاریخی شواہد کی تفصیل بیان کروں تو یہ شرح اچھی خاصی تاریخ کی کتاب بن جائے گی۔ اس لیے تاریخ داں حضرات کے لیے صرف سنہ عیسوی درج کر دی ہے۔

اسی حقیقت، بلکہ قانون قدرت کو مدِنظر رکھ کر، آقائے کائنات معلّمِ موجودات، رانائے رموزِ حیات، سرکار دو جہاں، پیشوائے انس وجاں، تاجدار کون ومکان بابی واُمّی لہ الفداء (علیہ افضل الثناء الی یوم الجزاء) نے مسلمانوں کو وصیت فرمائی تھی کہ دیکھو! میں تمہیں تنبیہہ کئے دیتا ہوں، تم ہرگز اللہ کی ذات وصفات میں بحث نہ کرنا، تم سے پہلی قومیں اسی بحث میں منہمک ہو جانے کی بدولت ہلاک ہو گئیں (یعنی دوسروں کی غلام ہو گئیں) ذات وصفات باری کے فلسفہ میں انہماک یقیناً بربادی کا پیغام ہے۔ کیونکہ انسان ان مسائل کو عقل کے ذریعہ سے سلجھا ہی نہیں سکتا[1] پس تم اللہ کی ذات وصفات میں غور مت کرو۔ بلکہ اس کی مخلوقات اور مصنوعات یعنی کائنات میں غور کرو۔ اللہ، ذکر کے لیے ہے، اور کائنات فکر کے لیے ہے اللہ کا ذکر کرو[2] کائنات میں غور وفکر کرو۔ اور یہی طریقہ تمہیں کامیابی سے ہمکنار کر سکتا ہے۔

---

[1] اس نکتہ کو اکبر الہ آبادی نے یوں بیان کیا ہے :-

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے پر سرا ملتا نہیں

[2] ذکر کے تین معنیٰ ہیں (ا) زبان سے ذکر کرنا (ب) دل میں دھیان کرنا۔ (ج) اطاعت کرنا۔

مسلمانوں کی ملی تاریخ گواہ ہے کہ جس دن سے اُنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشادِ گرامی کو پس پشت ڈالا، اُن کا زوال شروع ہو گیا۔ واضح ہو کہ ذات وصفات کے فلسفہ میں اِن مسائل سے بحث کی جاتی ہے:

(۱) ذاتِ باری کی حقیقت کیا ہے؟

(۲) ذات، ماہیت، حقیقت، اور وجودِ باری میں کیا فرق ہے؟

(۳) ذاتِ باری کا صفات سے کیا علاقہ ہے؟ آیا وہ صفات وذات سے جُدا ہیں، یا عینِ ذات ہیں[1]؟

(۴) صفات کل کتنی ہیں؟ ان میں سے اصلی کونسی ہیں؟ اور فروعی کونسی ہیں

(۵) صفات اگر غیرِ ذات ہیں تو خدا مرکب ہو جائے گا، اور اگر عینِ ذات ہیں تو صفات کا وجود کالعدم ہو جائے گا۔

(۶) خدا نے کائنات کو ذات سے پیدا کیا، یا صفات کے وسیلہ سے؟ اگر بذریعۂ ذات پیدا کیا تو صفات بیکار ہوگئیں، اور اگر بواسطۂ صفات پیدا کیا تو یہ واسطہ کس قسم کا ہے؟ واسطہ فی الثبوت ہے، یا واسطۂ فی الاثبات؟

مسائل تو بہت سے ہیں، میں نے نمونتاً چھ مسئلے لکھ دئے ہیں۔ اور لکھنے

[1] یہ مسائل دراصل ابلیس کے ایجاد کردہ ہیں۔ چنانچہ ارمغان حجاز میں ابلیس اپنے مشیروں کو مشورہ دیتا ہے کہ تم مسلمانوں کو ہر وقت ان مسائل میں اُلجھائے رکھو۔

ابن مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے
ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جُدا یا عینِ ذات

سے مقصد یہ ہے کہ کوئی انسان، عقل کی مدد سے اِن کا جواب نہیں دے سکتا اور اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں غور کرنے سے منع فرمایا تھا۔ چنانچہ دیکھ لیجئے ہم مسلمان ہو کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے سرتابی کر رہے ہیں، اور اقوامِ مغرب کافر ہو کر، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر عمل کر رہی ہیں۔

آج یورپ اور امریکہ کے علماء اور حکماء اس مسئلہ میں بحث نہیں کر رہے ہیں کہ ذات وصفاتِ باری میں باہمی علاقہ کیا ہے! بلکہ فطرت کے رازہائے سربستہ کا انکشاف کر رہے ہیں، یعنی ایٹم بم کے بعد اب ہائیڈروجن بم بنا رہے ہیں[1]۔

سوال یہ ہے کہ ترکی، مصر، طرابلس، مراکو، حجاز، فلسطین، یمن، شام، لبنان، عراق، ایران، افغانستان اور ہندوستان کے مسلمانوں نے گذشتہ تین سو سال میں کوئی چیز کیوں نہیں، ایجاد کی! کوئی مشین کیوں نہیں بنائی؟ کوئی جزیرہ کیوں نہیں دریافت کیا؟ کوئی آلہ کیوں نہیں بنایا؟ کوئی عنصر کیوں نہیں دریافت کیا؟ کوئی علمی انکشاف کیوں نہیں کیا؟ کوئی سائنٹیفک تحقیق کیوں نہیں کی! الغرض مادی اعتبار سے تمدن کی ترقی میں کوئی حصہ کیوں نہیں لیا؟ ان سوالات کا جواب ناظرین پر چھوڑتا ہوں یقیناً وہ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔

(۴۳) اگرچہ شروع سے اِس دُنیا کا طریقہ یہ ہے کہ یہاں کسی حکمران، خاندان یا سلطنت، یا کسی فرد کی حکومت کو ثبات نہیں ہے۔ لیکن

[1] اقوامِ مغرب ذکر تو نہیں کرتیں، لیکن فکر ضرور کرتی ہیں۔ وائے بر حالِ ماکہ ہم مسلمان نہ ذکر کرتے ہیں، نہ فکر۔ ۱۲

یہ یقینی بات ہے کہ بادہ (حکومت) اسی قوم کا حق ہے، جس کے نوجوان جدّوجہد کرتے ہیں، بلکہ سر ہتھیلی پر رکھ کر میدانِ جنگ میں جا سکتے ہیں۔[1]

ہندی مکتب

اگرچہ اقبال نے یہ نظم ۱۹۳۵ء میں لکھی تھی، لیکن ہنوز "باسی" نہیں ہوئی بلکہ قیامِ پاکستان کے بعد تو "سہ آتشہ" ہو گئی ہے۔ فرماتے ہیں کہ

(۱) اے اقبال! ہندوستان کے کالجوں کے طلبہ کے سامنے، پاکستان کے طلبہ کا بھی یہی حال ہے، علم خودی کا نام مت لے، کیونکہ کالجوں کے طلبہ کے لیے یہ درس موزوں ہی نہیں ہے۔

(۲) ممولوں (غلاموں) کی نظر سے باز (آزاد قوم) کے احوال اور مقامات پوشیدہ ہی رہیں تو بہتر ہے۔ کیونکہ محکوم قوم کے افراد، حکمراں قوم کے جذبات اور تصورات کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔

(۳) مثال کے طور پر محکوم اور حاکم کے تصوّرِ زمان میں بھی فرق ہوتا ہے چونکہ محکوم، رات دن، حاکم کے ظلم و ستم سہتا رہتا ہے، اس لیے زندگی کے ماہ و سال اُسے بہت طویل معلوم ہوتے ہیں۔ (جس طرح عاشق کو فراق کی رات طویل معلوم ہوتی ہے، اور حاکم چونکہ ہر وقت خوش رہتا ہے، اس لیے خوشی کی گھڑیاں اسے بہت مختصر معلوم ہوتی ہیں اسی نکتہ کو کسی ہندی شاعر نے اس طرح بیان کیا ہے :-

[1] میکدہ = خاندان، ساقی = حکمراں + مینا = حکومت

ایّامِ مصیبت کے تو کاٹے نہیں کٹتے
دن عیش کے گھڑیوں میں گذر جاتے ہیں کیسے

(۴) آزاد حکمراں قوم کا ہر لحظہ یا ہر دن، اُس کے استحکام میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔ لیکن محکوم کا ہر لحظہ یا ہر روز اس کے لیے ایک نئی مُصیبت لاتا ہے اور اس پر اخلاقی موت طاری کرتا رہتا ہے۔

یعنی دن (زمان) تو ایک ہی ہے۔ لیکن وہی دن، آزاد کے حق میں پیامِ عبدیت اور وجہِ استقامت بن جاتا ہے، اور وہی دن محکوم کے حق میں مصائبِ ناگہانی کا موجب بن جاتا ہے۔

(۵) آزاد کے تصوّرات اور خیالات، حقیقت پسندی کی روشنی سے منوّر ہوتے ہیں یعنی وہ حقائق کی دُنیا میں رہتا ہے اور حقائقِ حیات کا مقابلہ کرتا ہے۔ لیکن محکوم کے خیالات اور افکار، محض خرافات اور توہّمات کا انبار ہوتے ہیں، جنہیں حقیقت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

مثلاً آزاد قوم کے افراد یہ سوچتے ہیں کہ ممکن ہے ہمسایہ ملک ہم پر چڑھائی کر دے، کیونکہ اس کا رویہ تین سال سے معاندانہ ہے اس لیے ہمیں رات دن دفاع کی تیاری میں مشغول رہنا چاہیئے۔ لیکن محکوم قوم کے افراد یہ سوچتے ہیں کہ مرتی جیتی دُنیا ہے، خُدا معلوم پار سال زندہ رہیں یا نہ رہیں لاؤ آج رات چار دوستوں کو گھر بُلا کر قوالی تو سُن لیں!

محکوم اور حاکم، یا غلام اور آزاد میں چوتھا اور سب سے نمایاں فرق یہ ہوتا ہے کہ غلام قوم کے افراد کو ہر وقت پیروں کی کرامات کی دُھن لگی رہتی ہے۔ اور اگر کسی زندہ پیر کی کرامات، مشاہدہ میں نہیں آتیں تو اولیائے

گذشتہ ہی کی کرامات کا تذکرہ کر کے اپنے دل کو خوش کر لیتے ہیں لیکن آزاد قوم کا ہر فرد بجائے خود ایک "زندہ کرامات" ہے۔

نوٹ:- میں نے اس نظم میں "آزاد" سے، آزاد اور حکمراں، قوم یا قوم کا فرد مراد لیا ہے، لیکن "آزاد" سے مومن بھی مراد ہو سکتا ہے۔ کیونکہ مسلمان اگر مومن ہو جائے تو وہ غلام نہیں رہ سکتا، چونکہ ایمان، اور غلامی ایک دوسرے کی ضد ہیں، اس لیے ایک شخص میں بیک وقت جمع نہیں ہو سکتیں میرے عقیدہ کی رُو سے مردِ مومن، کا غلام ہونا ایسا ہی ناممکن ہے، جیسے کسی دروازہ کا بیک وقت کُھلا بھی ہونا اور بند بھی ہونا۔ مومن یا آزاد ہو گا، یا آزادی کے لیے جدوجہد کرتا ہو گا۔ (خواہ غازی ہو یا شہید) تیسری کوئی صورت از روئے قرآن اس کے لیے ممکن نہیں ہے [1]

(۵) اس لیے محکوم کے حق میں درس خودی کے بجائے، وہی تعلیم اچھی، بلکہ موزوں ہے، جو آج کل کالجوں میں دی جا رہی ہے۔ یعنی موسیقی، مصوّری، اور سائنس وغیرہ۔

---

[1] اگر تیسری کوئی صورت جائز ہوتی تو سلطان ٹیپو شہید بھی اُس صورت سے استفادہ کر سکتا تھا، لیکن افسوس کہ قرآن میں تیسری صورت مذکور نہیں ہے اور اس آیتِ مبارکہ کی موجودگی میں ہو بھی کیسے سکتی ہے:- قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ط آپ فرما دیجیے کہ میری نماز، اور تمام عبادات اور میری زندگی، اور میری موت یعنی میرا جینا اور مرنا، سب اللہ ہی کے لیے ہے یعنی اگر میری زندگی میں کوئی ساعت ایسی آ جائے، جب میں غیر اللہ کے لیے زندگی بسر کروں، یعنی غیر اللہ کی اطاعت کروں، تو وہ زندگی کافرانہ زندگی ہو جائے گی۔ ۱۲۔

تربیّت

اس نظم میں اقبالؔ نے یہ بتایا ہے کہ تعلیم اور تربیت میں کیا فرق ہے۔ نیز یہ کہ دونوں میں کیا رشتہ ہے۔ خلاصہ اس نظم کا یہ ہے کہ تربیت کے بغیر محض کتابی علم ناقص ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ

(۱) زندگی یعنی تربیت اور علم دونوں میں بہت فرق ہے:- علم یہ ہے کہ دماغ روشن ہو جائے، اور انسان مختلف علوم سے آگاہ ہو جائے۔ تربیت یہ ہے کہ دل روشن ہو جائے، اور انسان اس طرح زندگی بسر کرے کہ خلافتِ الٰہیہ کے مقام پر فائز ہو سکے۔ تاریخ گواہ ہے کہ بہت سے لوگ ایسے گذرے ہیں جو علم کے اعتبار سے بہت بڑے تھے، لیکن اُن کی زندگی پاکیزہ نہیں تھی، اور اللہ کی محبت سے ان کا سینہ بالکل خالی تھا۔ (اقبال نے پاکیزہ زندگی کو "سوزِ جگر" سے تعبیر کیا ہے)

(۲) علم سے عالم کو دولت بھی حاصل ہوتی ہے، طاقت بھی اور ذہنی مسرّت بھی۔ لیکن محض کتابی علم یا ڈگریوں سے کوئی شخص اپنی حقیقت سے آگاہ نہیں ہو سکتا۔ یعنی محض علم سے انسان، بو علیؔ سینا تو بن سکتا ہے، لیکن سلطان ابوؔسعید ابوالخیر نہیں بن سکتا۔

(۳) چونکہ اس زمانہ میں اہل علم تو عام ہیں لیکن اہلِ معرفت کمیاب ہیں اس لیے کوئی تعجب نہیں، اگر قوم کے افراد تقویٰ اور پرہیزگاری اور پاکیزہ زندگی کی نعمت سے محروم ہیں۔

(۴) اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم سے مسلمان نوجوانوں کے دل میں اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبّت ہرگز پیدا

نہیں ہو سکتی، کیونکہ گندھک سے بلب روشن نہیں ہو سکتا، اُس کے لیے تو بجلی کا کرنٹ درکار ہے، اور یہ کرنٹ مرشد کامل کی صحبت سے حاصل ہو سکتا ہے۔

خُوب وزشت

(پہلی)

اس مختصر نظم میں اقبالؔ نے ہمیں حسن و قبح کا معیار بتایا ہے۔ یعنی دُنیا میں اچھائی اور بُرائی کی کسوٹی کیا ہے۔ علامہ نے ایک دفعہ مجھ سے دورانِ گفتگو میں کہا تھا کہ

PERSONALITY IS THE CRITERION OF VALUE"

یعنی انسانی شخصیت، حسن و قبح کا معیار ہے۔ کہتے ہیں کہ:-

(۱) جس طرح نیلگوں آسمان کے ستارے کبھی طلوع ہوتے ہیں، کبھی غروب ہوتے ہیں، اسی طرح انسانی تخیلات بھی طلوع و غروب کے تابع ہوتے ہیں۔ یعنی کبھی بعض خیالات دماغوں پر مسلط ہوتے ہیں۔ اور عوام اُن کا اتباع کرتے ہیں۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دُنیا اُن کو بالائے طاق رکھدیتی ہے۔ اور دوسرے تصورات کو سند قبول عطا کر دیتی ہے۔

(۲) اسی طرح خودی کی دُنیا میں نشیب و فراز پایا جاتا ہے۔ یعنی یہاں بھی اچھائی اور بُرائی میں ایک جنگ برپا رہتی ہے اور لوگ اپنے اپنے خیال کے مطابق اچھائی اور بُرائی کا معیار پیش کرتے رہتے ہیں۔ اور کبھی ایک خاص معیار، طلوع ہوتا ہے۔ یعنی لوگوں میں مقبول ہوتا ہے۔ اور

کبھی وہی معیار غروب ہو جاتا ہے۔ یعنی دُنیا اُسے ترک کر دیتی ہے۔

(۳) میرا نظریہ یہ ہے کہ جمیل (اچھائی) وہ ہے، جو خودی کی بلندی سے ظاہر ہو، یعنی حسن یا اچھائی وہ ہے، جو اُس شخص سے صادر ہو، جس کی خودی بلند مقام پر فائز ہے۔ بلکہ مرتبۂ کمال کو پہنچ چکی ہے۔ اور بُرائی وہ ہے جو اُس شخص سے ظاہر ہو، جس کی خودی ناقص ہے۔ بالفاظ دگر مردِ مومن کی زندگی، معیارِ حسن و قبح ہے، یعنی مومن جو کام کرے وہ اچھا ہے کافر جو کام کرے وہ بُرا ہے۔

مرگِ خودی

(دوسری)

اس نظم میں اقبالؔ نے ہم کو خودی کی موت کے نتائج سے آگاہ کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ

(۱) خودی کی موت یعنی اللہ کی نافرمانی کا نتیجہ مختلف قوموں میں، مختلف صورتوں میں برآمد ہوتا ہے۔ مثلاً یورپ (مغربی اقوام) نے مادیات میں تو کافی ترقی کر لی ہے، لیکن اُن کا اندرون بے نور ہے، یعنی اُن میں روحانیت کا فقدان ہے۔ اس کے برعکس، مشرقی اقوام میں روحانیت تو پائی جاتی ہے، لیکن وہ مادی اعتبار سے جذام میں مبتلا ہیں۔ یعنی غیروں کی محکوم ہیں۔

(۲) عربی اقوام میں ترقی اور سربلندی کا جذبہ مفقود ہے، عجمی اقوام، مثلاً ایران اور افغانستان وغیرہ، مفلوج انسانوں کی طرح زندگی بسر کر رہی

ہیں، ان میں دشمنوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے۔

(۳) اب رہے ہندی مسلمان، تو خودی کی موت سے وہ بھی بالکل بے دست وپا ہو گئے ہیں، جیسے کسی پرند کے تمام پر نوچ دیئے جائیں۔ اسی لیے وہ آزادی سے محروم ہیں۔ اور غلامی (قفس) کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

(۴) مسلمانوں کے اکثر مذہبی پیشوا، اسی خودی کی موت سے، قوم فروشی پر مجبور ہیں۔ الغرض دُنیا میں جو کچھ ابتری اور بدنظمی نظر آ رہی ہے، اور مختلف قومیں جن عوارض میں مبتلا ہیں، اُن کا اصلی سبب یہ ہے کہ بنی آدم اُس طریق سے برگشتہ ہو چکے ہیں، جس پر چل کر انسان اپنی خودی کو زندہ کر سکتا ہے۔ اور وہ راستہ اطاعتِ احکامِ الٰہی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

مہمانِ عزیز

یہ نظم یوں تو صرف دو شعر کی ہے۔ لیکن اقبالؔ نے بڑے پتہ کی بات کہی ہے۔ کہتے ہیں کہ مغربی تعلیم نے مسلمانوں کے دل ودماغ کو بیشمار علمی مسائل سے معمور کر دیا ہے۔ اور اُن کی نوعیت ایسی ہے کہ اب مسلمانوں کے اندر نیکی اور بدی میں امتیاز کرنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہی ہے۔

اس لیے میں اُنہیں یہ مشورہ دیتا ہوں کہ وہ شوق سے منطق فلسفہ اور دیگر علوم پڑھیں، لیکن اپنے دل کا ایک گوشہ ضرور خالی رکھیں۔ شاید کبھی اُن کو کسی مرشد کامل، یا مردِ مومن کی صحبت نصیب ہو جائے تو وہ کوئی اسلامی

نکتہ اُن کو بتا کر، اُن کی زندگی سنوار دے گا۔ لیکن اگر خانۂ دل میں کوئی کمرہ بھی خالی نہ ملا تو وہ مہمان عزیز، یعنی پاکیزہ خیال کہاں قیام کرے گا۔

دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے۔ کہ شوق سے یہ غیر اسلامی تعلیم حاصل کرو اس آزادی کے زمانہ میں تمہیں کون روک سکتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی اللہ سے بھی دُعا کر لیا کرو۔ شاید وہ اپنے فضل سے کوئی انقلاب تمہارے اندر پیدا کر دے۔ لیکن اگر تم نے بالکل ہی تعلق ختم کر دیا، تو فضلِ الٰہی یعنی مہمان عزیز کی پھر کوئی توقع نہیں ہے۔

عصرِ حاضر

اقبالؔ نے اس نظم میں موجودہ غیر اسلامی نظام ونصابِ تعلیم پر تنقید کی ہے۔ اور یہ اُن نظموں میں سے ہے، جن کو میں نے سیکڑوں مرتبہ پڑھا ہے، اور مہینوں اُن پر غور کیا ہے۔ اس لیے میں ناظرین سے درخواست کروں گا کہ وہ بھی اس نظم کو بہت غور سے پڑھیں۔

(۱) کہتے ہیں کہ یورپ نے جو نظام ونصاب تعلیم معین کیا ہے، اُس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ افکار میں پختگی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اس کی ایک ادنیٰ مثال یہ ہے کہ ہندوستان سے ہر سال بہت سے طلبہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے یورپ جاتے ہیں۔ اور علم کے کسی ایک شعبہ پر، کئی کئی سال صرف کرتے ہیں لیکن ان کا علم سطحی معلومات سے آگے نہیں بڑھتا۔ مثلاً وہ یہ تو بتا سکتے ہیں کہ ابن سینا کی اشارات کا قدیم ترین قلمی نسخہ کس کتب خانہ میں ہے اور کس سنہ میں لکھا گیا تھا۔ اور اُس کے اوراق کی تعداد کتنی ہے

لیکن یہ نہیں بتا سکتے کہ اس کتاب میں کیا لکھا ہے۔ بلکہ اکثر پی، ایچ ڈی تو اس کتاب کی عبارت بھی صحیح نہیں پڑھ سکتے۔

(۲) اگرچہ کالجوں کی تعلیم سے عقل انسانی، اوہام باطلہ کی قیود سے تو ضرور آزاد ہو جاتی ہے۔ مثلاً کالج کا تعلیم یافتہ یہ بات ہرگز تسلیم نہیں کریگا کہ یہ زمین گائے کے سینگوں پر قائم ہے یا اٹیلس (ATLAS) اسے اپنے کاندھے پر اُٹھائے ہوئے ہے۔ لیکن کالج کی تعلیم سے خیالات میں ربط اور ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکتی۔

چنانچہ آپ کسی کالج کے گریجوبٹ سے تبادلۂ خیالات کریں، تو معلوم ہو جائے گا کہ عموماً ان تعلیم یافتہ لوگوں کا یہ حال ہے کہ اوّل تو یہ لوگ زندگی کے مسائل میں کوئی ذاتی رائے رکھتے ہی نہیں، اور اگر کسی مسئلہ پر گفتگو بھی کریں گے، تو وہ نوّے فیصدی غیر مربوط ہو گی۔

مثلاً آپ نے تقسیم ہند سے پہلے "نیشنلسٹ مسلمان،" اور تقسیم کے بعد اسلامی سوشلزم کی ترکیب لوگوں کی زبان سے ضرور سُنی ہو گی، یا کم از کم اخباروں میں تو ضرور ہی پڑھی ہو گی۔

تقسیم سے پہلے دورانِ گفتگو میں مثلاً زید نے کہا کہ میں "نیشنلسٹ مسلمان ہوں اور اس پر فخر کرتا ہوں۔" اب آپ سوچیں کہ اگر قائل کے خیالات میں ربط ہوتا تو کیا وہ اس قسم کا کلمہ زبان سے ادا کر سکتا تھا؟ اس کی تفصیل یہ ہے کہ نیشنلزم، اپنے تضمنات (IMPLICATIONS) کے اعتبار سے، اسلام کی ضد ہے۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے:

اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ قومیت کی بنیاد مذہب پر ہے۔ نیشنلزم کی تعلیم یہ ہے کہ قومیت کی بنیاد وطن پر ہے۔

پس جو شخص نیشنلسٹ ہے، وہ مسلمان نہیں ہو سکتا۔ اِس کے باوجود میں نے بہت سے مسلمانوں کو اپنے کانوں سے یہ کہتے ہوئے سُنا ہے کہ میں نیشنلسٹ مسلمان ہوں۔

یہی حال اسلامی سوشلزم کا ہے۔ اسلام سوشلزم کی ضد ہے۔ اور دو ضدیں ایک جگہ ایک وقت میں ایک حیثیت سے جمع نہیں ہو سکتیں۔ لہٰذا اسلامی سوشلزم کی ترکیب بھی اجتماع ضدّین کی مصداق ہے۔ اور اس لیے محال ہے۔ اس کے باوجود یہ ترکیب لوگوں کی زبان پر آجاتی ہے۔

یہ باتیں، دلیل ہیں اس امر کی کہ کالجوں کی تعلیم سے عقل تو آزاد ہو جاتی ہے، لیکن خیالات میں ربط و نظم پیدا نہیں ہوتا۔ اگر کالج کی تعلیم سے "انسان در عالم،" ہو جاتا تو علی گڑھ کالج سے پچھتّر سال میں، ۵، نہ سہی، ۲۵ علماء تو ضرور پیدا ہوتے۔

(۴) انسان کی خودی اُس وقت مرتبۂ کمال کو پہنچتی ہے، جب وہ اپنی دونوں قوتوں کی (یعنی عشق اور عقل) پہلو بہ پہلو صحیح طریق پر تربیت کرے لیکن آج دنیا کی حالت یہ ہے کہ

(۱) مغربی اقوام کے افکار و خیالات لادینی اور مادّہ پرستی پر مبنی ہیں، اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُن کی قوتِ عشق، مردہ ہو گئی ہے، واضح ہو کہ عشق سے مراد اللہ کی محبت ہے۔ اور جب اللہ پر ایمان ہی نہیں تو اُس سے محبت کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ مغربی اقوام نے تو اللہ کی جگہ، وطن کو اپنا معبود بنا لیا ہے۔ چنانچہ اُن کی زندگیاں انسانوں کو تباہ اور برباد کرنے کے لیے وقف ہو چکی ہیں، اور وطن کو معبود بنانے کا نتیجہ اس کے علاوہ اور کچھ ہو بھی نہیں سکتا۔

(ب) مشرقی قومیں بے ربطیٔ افکار کے مرض میں مبتلا ہیں۔ یعنی انہوں نے صحیح طریق پر غور و فکر کرنا چھوڑ دیا ہے۔ جس کی بنا پر ان کے خیالات میں بے ربطی پیدا ہو گئی ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ذہنی غلامی میں مبتلا ہو گئی ہیں۔ ذہنی غلامی سے مراد یہ ہے کہ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں یورپ کی کورانہ تقلید کر رہی ہیں۔ مصر، شام، ترکی، عراق، ایران، اور دوسرے ملک سب اسی مرض میں مبتلا ہیں۔ یہ داستان بہت طویل اور دردناک ہے، اور اُس کی تفصیل کے لیے ایک دفتر درکار ہے۔ یوں کہنے کو تو ترکی ایک آزاد ملک ہے، لیکن غور سے دیکھو تو ترک ذہنی اعتبار سے مغرب کے غلام ہیں اسلامی قانون کے بجائے مغربی ضابطۂ قانون اختیار کر لیا۔ الف ب ت کے بجائے اے بی سی ڈی اختیار کر لی۔ غرضکہ تمدن، تہذیب اور معاشرت ہر لحاظ سے یورپ کی نقالی کی جا رہی ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مغرب میں لادینیٔ افکار کی وجہ سے، عشق، مردہ ہو گیا ہے۔ مشرق میں بے ربطیٔ افکار کے سبب سے عقل مردہ ہو گئی ہے اور خودی کی زندگی، ان دونوں کی زندگی پر موقوف ہے۔ اس لیے نہ مغربی اقوام کی خودی زندہ ہے، نہ مشرقی اقوام کی۔ بالفاظِ دیگر، آج ساری دُنیا انسانیت اور اخلاق کے لحاظ سے مُردہ ہو چکی ہے۔ اسی خیال کو اقبالؔ نے دوسری جگہ اس طرح پیش کیا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اس شعر کی اس سے بہتر شرح ہو بھی نہیں سکتی۔

یہاں مرض کا سبب ہے غلامی و تقلید
وہاں مرض کا سبب ہے نظامِ جمہوری

نہ مشرق اس سے بری ہے نہ مغرب اس سے بری
جہاں میں عام ہے قلب و نظر کی رنجوری

طالبِ علم

(دوسری)

اس مختصر نظم میں اقبالؔ نے مسلمان طالب علم کو ایسا نکتہ سمجھایا ہے، جس پر عمل کرنے سے قوم کی زندگی میں انقلاب رونما ہو سکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ

(۱) تیرے دل میں صحیح طریق پر، دنیا میں ترقی اور سربلندی حاصل کرنے کی کوئی اُمنگ پیدا نہیں ہوتی، اس لیے میں دُعا کرتا ہوں کہ خُدا، اپنی مہربانی سے تیرے دل میں تڑپ پیدا کر دے یعنی دُنیا میں اسلام کو سربلند کرنے کا جذبہ۔

واضح ہو کہ اقبال کی رائے میں مسلمان کی ترقی، اور سربلندی، اسلام کی ترقی اور سربلندی پر موقوف ہے۔ کیونکہ اس کی پیدائش کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ دُنیا میں اسلام کو سربلند کرے، اور جس مسلمان کے دل میں یہ تڑپ نہ ہو وہ اور سب کچھ ہو سکتا ہے، لیکن مسلمان نہیں ہو سکتا۔

(۱) تو ساری عمر یونہی کتابیں پڑھتا رہے گا، لیکن کتابوں سے تیری زندگی کا مقصد کبھی تجھ پر واضح نہیں ہو سکے گا۔ کیونکہ تو کتاب خواں تو ہے، لیکن "صاحب کتاب" نہیں ہے۔

اس شعر میں "صاحب کتاب" اس نظم کی جان ہے۔ صاحب کتاب اصطلاح میں اُس شخص کو کہتے ہیں، جس پر اللہ کی طرف سے کوئی کتاب

نازل ہو۔ یہاں اس کے مجازی معنیٰ مراد لیے گئے ہیں۔ یعنی ایسا شخص جس نے اپنے دل کو ایسا پاک و صاف کر لیا ہو کہ اللہ تعالیٰ اس پر فیضان سماوی نازل فرمائے، اور یہ نعمت اُس وقت حاصل ہو سکتی ہے، جب مسلمان اللہ سے رابطۂ قلبی پیدا کر لے۔

مطلب یہ ہے کہ اے مسلمان نوجوان! اگر تو حقیقی علم کا طالب ہے تو اپنے دل کو اللہ کی محبت سے منور کرے۔ اور یہ نعمت اہل اللہ کی صحبت سے حاصل ہو سکتی ہے۔

جن لوگوں نے کلام اقبال کا مطالعہ کیا ہے، وہ اس امر میں مجھ سے متفق ہوں گے کہ لوٹ پھیر کر اقبال نے ایک ہی بات مختلف طریقوں سے کہی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ دماغ کے ساتھ دل کو بھی منوّر کرو۔ محض علم، جب تک اس کے ساتھ عشق بھی کارفرما نہ ہو، مسلمان کو، مسلمان نہیں بنا سکتا۔

اسی خیال کو اقبالؔ نے بال جبریل میں یوں بیان کیا ہے:۔

دل مردہ، دل نہیں ہے، اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے، اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

امتحان

(پہلی)

اس نظم میں اقبالؔ نے یہ بتایا ہے کہ اگر کوئی شخص دنیا کو اپنے ذاتی کمالات کا معترف بنانا چاہتا ہے، یا اپنی خودی کی قوتوں کا اظہار کرنا چاہتا ہے تو اُسے "دیوار سے ٹکرانا" لازمی ہے۔ یعنی اُسے مشکلات اور آفات

کا مقابلہ کرنا پڑے گا اور اُس کے لیے مناسب تیاری شرط اولین ہے۔ دُنیا کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ "قوت" کے سامنے جھکتی ہے۔ خود اقبال ہی نے لکھا ہے۔

ع کہ سر بہ سجدہ ہیں قوت کے سامنے افلاک

اسی لیے اقبال مسلمانوں کو یہ تلقین کرتے ہیں کہ اپنے اندر قوّت پیدا کرو کیونکہ "دیوار"، سے وہی شخص ٹکرا سکتا ہے جس میں قوت ہو۔[1]

(۱) پہاڑ کی ندی نے، ایک دن سنگریزے سے کہا کہ مجھے تیری حالت پر افسوس آتا ہے۔ کیونکہ تیری زندگی کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ تو زمین پر پڑا رہے، اور اسی حالت میں فرسودہ ہو کر فنا ہو جائے۔

(۲) مجھے دیکھ! میں کہنے کو تو چھوٹی سی ندی ہوں، لیکن میری قوّت کا یہ عالم ہے کہ میں پہاڑوں سے ٹکراتی ہوں اور اپنی ضربوں سے چٹانوں کو توڑ دیتی ہوں اور آگے بڑھنے کے لیے اپنا راستہ بناتی ہوں، یہی تو وجہ ہے کہ دریا، بلکہ سمندر بھی میرے محتاج ہیں۔

(۳) مجھے تیری حالت پر افسوس اس لیے آتا ہے کہ اگرچہ تو اپنی ذات کے لحاظ سے سنگ خارہ ہے، لیکن تو اہنسا کا پجاری بن گیا ہے۔ یعنی کسی دیوار سے نہیں ٹکراتا، خاموش سر جھکائے زمین میں پڑا رہتا ہے۔ اس لیے دنیا تیری ذاتی خوبی سے نا واقف ہے، دہ ہو سکتی ہے، یا اگر دنیا تجھے کا پنج سمجھے تو اس میں اس کا کیا قصور ہے؟ کیا تو نے کبھی کسی دیوار سے متصادم ہو کر اپنی حقیقت کا اظہار کیا؟ اندریں صورت ع

---

[1] مسٹر گاندھی نے اس نکتہ کو بخوبی سمجھ لیا تھا اِسی لئے انہوں نے سرحد کے غافل افغان" کو نو "اہنسا" کا درس دیا، تاکہ سرحد کا پٹھان بکری بن جائے اور ہندوؤں کو شکتی پیدا کرنے کا اپدیش دیا، تاکہ یہ قوم دیوار سے ٹکرا سکے۔ ۱۲

کسے خبر کہ تو ہے سنگِ خارہ یا کہ زجاج

مدرسہ

(دوسری)

اس نظم میں اقبال نے، کالج کے نوجوانوں سے براہ راست خطاب کیا ہے اور جو کچھ اُن کے ضمیر کی گہرائیوں میں پوشیدہ تھا، سب بے کم و کاست ان کے سامنے رکھ دیا ہے۔ جب میں یہ نظم پڑھتا ہوں، تو بے اختیار داغ کا یہ شعر زبان پر آجاتا ہے:۔

قطرۂ خونِ جگر سے کی تواضع عشق کی!
سامنے مہمان کے جو تھا میسّر رکھ دیا

(۱) کہتے ہیں کہ اے نوجوان! فرنگیٔ بد فرجام نے جو نظام یہاں قائم کیا ہے بلکہ تجھ پر مسلّط کیا ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تو دن رات فکرِ معاش میں مبتلا رہے۔ اور تیرا ملک آئے دن قحط کی برکات سے بہرہ اندوز ہوتا رہے چنانچہ اُس نے اپنے ناپاک مقاصد کی تکمیل کے لیے ۴۲ء میں بنگال کے ۵ کروڑ انسانوں کو قحط کی مُصیبت میں مبتلا کر دیا تھا۔

الغرض اس فکر معاش کا نتیجہ یہ نکلا کہ تیری روح فنا ہو گئی۔ تو روٹی کی تلاش میں اس قدر سرگرداں ہے کہ کوئی بلند جذبہ تیرے اندر پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔

(۲) مفلسی نے تجھے بزدل بنا دیا ہے، تو ہر وقت ڈرتا رہتا ہے کہ اگر میں

نے ذرا اپنے طرزِ عمل سے اپنے مسلمان ہونے کا ثبوت دیا تو "افسرانِ بالا" ناخوش ہو جائیں گے۔ اور میری "سروس" خطرہ میں پڑ جائیگی۔ سچ یہ ہے کہ جب زندگی ذوقِ خراش کھو دیتی ہے، یعنی جب انسان تکالیف اور مصائب برداشت کرنے سے جی چرانے لگتا ہے تو زندگی موت میں تبدیل ہو جاتی ہے انسان غلطی سے اپنے آپ کو زندہ سمجھتا ہے، دراصل وہ مر چکتا ہے۔

(۳) اے مسلمان نوجوان! تجھے "جنون" کی صفت تو مسلمان گھر میں پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ ورثہ میں ملی تھی، اور وہ کیسا "جنون" تھا؛ وہ ایسا تھا کہ دین اسلام کی سربلندی کے لیے تیرے اسلاف کو ہر وقت سر بکف رکھتا تھا، وہ بات بات میں سر سے کفن باندھ لیتے تھے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت کے لیے ہر وقت سر کٹانے کو تیار رہتے تھے۔ اور یہ سب اسی "جنونِ ذوفنون" کا ثمرہ تھا۔ لیکن افسوس کہ فرنگیوں کے قائم کردہ کالجوں اور اِن میں مروجہ نصابِ تعلیم نے (جو سرتاپا لادینی اور شکم پرستی پر مبنی ہے) تجھے اُس جنون سے بیگانہ کر دیا۔[1]

(۴) اے مسلمان نوجوان! اللہ نے تجھے دیدۂ شاہین عطا فرمایا تھا، لیکن انگریزوں نے تجھے، اپنا غلام بنا کر، تیرے ساتھ یہ سلوک کیا کہ "دیدۂ شاہین" تو تجھ سے چھین لیا، اور اُس کی جگہ چمگادڑ کی آنکھیں تجھے دیدیں، تاکہ تو آفتاب کی روشنی کو دیکھ ہی نہ سکے۔

پس اے نوجوان! تو سب کام چھوڑ کر، انگریز سے مقابلہ کی قوت اپنے

[1] پس اب جبکہ پاکستان معرضِ وجود میں آگیا ہے۔ ہمیں اس نظام اور نصابِ تعلیم کو یکسر اپنی اجتماعی زندگی سے خارج کر دینا چاہیئے۔ ۱۲

اندر پیدا کر، تاکہ تو اپنی اصلی آنکھیں اس دشمنِ ملّت سے واپس لے سکے یاد رکھ جب تک تو اپنی اصلی آنکھیں واپس نہیں لے گا، تیری زندگی بالکل بیکار ہے۔ بلکہ اس پر زندگی کا اطلاق ہی نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھ مسلمان بننے کے لیے دیدۂ شاہین شرطِ اولین ہے۔ اس لیے اگر یہ نعمت تجھے حاصل ہوئی تو تیرا عدم اور وجود دونوں برابر ہیں۔ پس اپنے حقیقی دشمن کو پہچان اور مقابلہ کی تیاری کر

(۵) اگر تو میرے پیغامِ انقلاب پر عمل کرنے کے لیے آمادہ ہے، تو میں بڑی خوشی سے تجھے مطلع کرتا ہوں کہ کالج کی تعلیم نے جن حقائق و معارف کو تیری نگاہوں سے پوشیدہ کر دیا ہے۔ وہ اُن بزرگوں کی صحبت میں رہ کر حاصل ہو سکتے ہیں جو عالی شان محلات اور فلک بوس عمارات سے بہت دُور، اس ناپاک ماحول سے بہت دُور، جنگلوں میں اور بیابانوں میں معمولی جھونپڑیوں میں رہتے ہیں، اور بوریئے پر بیٹھ کر تخت نشینوں کی نیندیں حرام کر دیتے ہیں۔ پس اے مسلمان نوجوان تو ان اللہ والوں کی صحبت اختیار کر، تاکہ تجھ میں کفار کے مقابلہ کی طاقت پیدا ہو سکے۔

حکیم نطشہ

تمہید:۔ علامہ اقبالؔ نے اس مشہور جرمن فلسفی کے فلسفیانہ افکار پر اپنی تصانیف میں کئی جگہ مختلف پہلوؤں سے تبصرہ کیا ہے۔ اور اگرچہ اُنہوں نے اس کے بعض بنیادی تصورات پر سخت نکتہ چینی کی ہے۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں ہے کہ انہیں اس کے ساتھ ایک خاص قسم کی دلچسپی

ضرور تھی۔

نکتہ چینی تو اس لیے کی کہ اُن کے اور نطشہ (NIETZSCHE) کے بنیادی نقطۂ فکر میں بعد المشرقین ہے، یعنی اقبال اللہ کی ہستی کے معترف ہیں، اور نطشہ، اللہ تو بڑی چیز ہے، خدا کی ہستی کا بھی منکر ہے [1] اور دلچسپی اس لیے ہے کہ اس کے بعض اخلاقی تصورات، قرآنی تعلیمات سے مشابہت رکھتے ہیں، دلچسپی کی دوسری وجہ یہ ہے کہ نطشہ، انسان میں اعلیٰ قسم کی صفات دیکھنے کا آرزو مند ہے، اس لیے وہ "فرد" کو فوق البشر (SUPER MAN) بننے کی تلقین کرتا ہے اگرچہ اقبال کا فوق البشر، یعنی مردِ مومن، اپنی صفات کے لحاظ سے نطشہ کے فوق البشر سے مختلف ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ دونوں، فرد کی مخفی قوتوں کو اُبھارنا چاہتے ہیں۔

اسی لیے اقبال نے اپنی کتابوں میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اگر نطشہ کو کسی مردِ مومن یا مرشدِ کامل کی صحبت نصیب ہو جاتی تو وہ مسلمان ہو جاتا چنانچہ جاوید نامہ میں لکھتے ہیں:۔

کاش بودے در زمانِ احمدے
تا رسیدے بر سرورِ سرمدے

کاش نطشہ، حضرت مجدد الف ثانی، شیخ احمد سرہندیؒ کے زمانہ میں

---

[1] اگر ایک شخص یہ تسلیم کرے کہ بیشک اس دنیا کا بنانے والا کوئی ہے تو فلسفہ کی اصطلاح میں وہ خدا کی ہستی کا معترف ہو گیا۔ لیکن جب تک وہ اُس خدا کی ذات و صفات پر قرآن حکیم کی تعلیمات کے مطابق ایمان نہ لائے، از روئے شرع وہ اللہ کی ہستی کا معترف نہیں ہے۔

پیدا ہوا ہوتا تو اُن کے فیضِ صحبت سے دولتِ سرمدی حاصل کر لیتا یعنی مسلمان ہو جاتا۔

اسی طرح بالِ جبریل میں لکھتے ہیں :۔

اگر ہوتا وہ مجذوبِ فرنگی اس زمانہ میں
تو اقبال اُس کو سمجھاتا، مقامِ کبریا کیا ہے

پیامِ مشرق میں بھی چار شعروں کی نظم اس کے متعلق لکھی ہے جس میں یہ شعر قابلِ غور ہے :۔

آنکہ بر طرحِ حرم بتخانہ ساخت
قلبِ او مومن، دماغش کافر است

یعنی اگرچہ اُس نے بتخانہ تعمیر کیا، لیکن اُس کی تعمیر کا انداز، حرم کی تعمیر سے مشابہ ہے۔ یعنی اس کا فلسفہ اگرچہ ملحدانہ ہے لیکن اس میں کہیں کہیں اسلام کا رنگ بھی نظر آتا ہے۔ اس شعر کے آخری مصرع میں اقبال نے اس کے ساتھ اپنی دلچسپی کی وجہ بھی بیان کر دی ہے۔ یعنی اس کے اندر اسلامی حقائق کے قبول کرنے کی صلاحیت موجود تھی۔ لیکن جیسا کہ اقبال نے بالِ جبریل میں حاشیہ میں لکھا ہے کہ

"وہ اپنے قلبی واردات کا صحیح اندازہ نہ کر سکا اس لیے اس کے فلسفیانہ افکار نے اُسے غلط راستہ پر ڈال دیا" (بالِ جبریل ص۹۲)

اس مختصر تمہید کے بعد اب میں اشعار کا مطلب لکھتا ہوں :۔

(۱) کہتے ہیں کہ نطشہ، توحیدِ الٰہی کا اعتراف اس لیے نہ کر سکا کہ اس کے اسرار کو سمجھنے کے لیے جس اندازِ فکر کی ضرورت ہے، وہ اس میں پیدا نہ ہو سکا۔ اگر اُسے کوئی "اللہ والا" مل جاتا تو اُس کا قلبی رُجحان اُسے موحد

بنا سکتا تھا۔

(۲) ذہنی اعتبار سے اُس کا درجہ حکمائے مغرب میں بہت بلند ہے، چنانچہ اُس کے افکار نے مسیحی دنیا میں زلزلہ برپا کر دیا تھا۔

واضح ہو کہ میری رائے میں حکیم فرفریوس (PORPHERY) کے بعد (جس کی وفات ۳۰۴ء میں ہوئی) نطشہ دوسرا فلسفی ہے، جس نے انیسویں صدی میں مسیحیت پر اس قدر شدید نکتہ چینی کی۔ چنانچہ اُس نے اپنی تصنیف اینٹی کرائیسٹ (ANTi CHRiST) میں بدلائلِ عقلیہ یہ بات ثابت کی ہے کہ مسیحی فلسفۂ اخلاق سے بڑھ کر کوئی فلسفہ بنی آدم کے حق میں مضر نہیں ہے

(۳) لیکن اس رفعتِ تخیل کے باوجود، چونکہ اُسے توحید کی نعمت نصیب نہ ہو سکی اس لیے اس کے فلسفۂ اخلاق میں، وہ پاکیزگی یا وہ خوبی پیدا نہ ہو سکی، کہ وہ اس ضابطہ پر عمل پیرا ہو کر، گناہ کی طرف میلان یا نفسانی خواہشات پر غالب آ سکتا۔ یعنی اس کا فلسفۂ اخلاق پر اُس کی پاکیزگی طبع کے باوجود انسانوں کو متقی اور خدا ترس نہیں بنا سکتا۔

اساتذہ

(پہلی)

اس نظم میں اقبال نے ہندوستانی کالجوں کے اُستادوں کی ذہنیت پر تبصرہ کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ جو لوگ خود گم کردہ راہ ہوں، وہ دوسروں کی ہرگز رہنمائی نہیں کر سکتے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ :۔

(۱) اگر آفتاب اپنے مستقر سے منحرف ہو جائے تو پھر اُس کی شعاعوں میں یہ

تاثیر باقی نہیں رہ سکتی کہ وہ معدن میں لعل و گوہر کی تربیت کر سکیں۔ اسی طرح اگر کوئی شخص طلبہ کی صحیح تربیت کا آرزومند ہو تو اُسے لازم ہے کہ وہ اُن کو ایسے اساتذہ کے سپرد کرے، جو تربیت کے اہل ہوں یعنی اسلام سے منحرف نہ ہوں۔

(۲) آج یہ حالت ہے کہ ساری دُنیا تلاش حق سے بیگانہ ہو چکی ہے۔ تحقیق و اجتہاد کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔ اندریں حالات بھلا ہندی کالجوں کے اساتذہ طلبہ کی ذہنی تربیت کیا کر سکتے ہیں۔

(۳) آج کیفیت یہ ہے کہ جو لوگ (قرآن و حدیث کے نور سے منور ہو کر) اپنے زمانہ کے امام بن سکتے تھے، وہ روایات کے پھندوں میں گرفتار ہیں۔ اور خود اپنے زمانہ (یعنی عصر حاضر کے اوہام) کے پیرو اور مقلد ہیں۔ پس ایسے لوگ قوم کی کیا رہنمائی کر سکتے ہیں۔

غزل

(دوسری)

اس نظم میں اقبالؔ نے بعض حقائق و معارف دلکش انداز میں بیان کئے ہیں کہتے ہیں کہ

(۱) وہی شخص اپنی زندگی کے مقصد سے واقف ہو سکتا ہے جس کا دل اتباع شریعت سے منور ہو چکا ہو۔

(۲) بندۂ مومن، اس دنیا میں ہر وقت قرب الٰہی کے حصول کی خاطر جدوجہد کرتا رہتا ہے۔ اس لیے اُسے جیتے جی کبھی فرصت (LEISURE) نصیب

نہیں ہو سکتی، ہاں غلاموں کو چونکہ جہاد فی سبیل اللہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اس لیے وہ ساری زندگی فرصت کا لطف اُٹھاتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اُن کی زندگی پر ایک نظر ڈالنے سے اس شعر کی صداقت آشکار ہو سکتی ہے۔ وہ تاش کھیلتے ہیں، گھوڑ دوڑ میں جاتے ہیں، کلب میں جاتے ہیں۔ سینما دیکھتے ہیں، تفریح کرتے ہیں لیکن پھر بھی اُن کا وقت کاٹے نہیں کٹتا۔ مجبوراً وہ داستان گو نوکر رکھتے ہیں، تاکہ اُن کی فرصت کے اوقات کسی طرح بسر تو ہو سکیں۔

(۳) اے مسلمان! تو اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے، مغربی قوموں کے مادی عروج کو للچائی ہوئی نظر سے دیکھ رہا ہے۔ اس لیے میں دُعا کرتا ہوں کہ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم، تیری نظر کی نگہبانی فرمائیں، یعنی تجھے گمراہ ہونے سے محفوظ رکھیں۔

''صاحب مازاغ'' میں قرآن مجید کی اس آیت مبارکہ کی طرف اشارہ ہے جس میں اللہ نے آپ کی نگاہ کی بایں الفاظ توصیف فرمائی ہے۔ مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی۔ نہ تو آپ کی نگاہ بہکی نہ حد سے بڑھی''۔

(۴) اے مسلمان! تو کفار کی عیش و طرب کی محفلوں سے مرعوب نہ ہو جانا اس قسم کی محفلوں کو کبھی ثبات و دوام نصیب نہیں ہوا، اور نہ آئندہ ہو سکتا ہے، یہ بلوریں جام جن کی خوبصورتی ستاروں کو شرماتی ہے، سب فریب نظر ہیں، کوئی دن جاتا ہے کہ یہ محفلیں درہم برہم ہو جائیں گی۔

(۵) مجھے تو یہ افسوس ہے کہ تو کتابوں میں اس قدر مشغول رہتا ہے کہ کبھی کائنات خلقت پر غور ہی نہیں کرتا، فطرت کے مظاہر زبان حال سے صانع فطرت کے وجود پر گواہی دے رہے ہیں، لیکن تو اس قدر کور

ذوق ہوگیا ہے کہ کبھی ان حقائق کی طرف ملتفت ہی نہیں ہوتا۔
اکبر الٰہ آبادی نے بھی اس مضمون کو اپنے مخصوص انداز میں نظم کیا ہے صرف ایک شعر اس جگہ لکھتا ہے :۔

صاف آئیگی نظر صانع عالم کی جھلک
سامنے کچھ نہ رکھ آئینۂ فطرت کے سوا

دین و تعلیم

اس نظم میں اقبالؔ نے دین اور تعلیم سے متعلق بعض حقائق بیان کئے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ان پر غور کرنے سے حکیم مشرق کی ژرف نگاہی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ کہتے ہیں کہ

(۱) میں موجودہ زمانہ کے علماء اور فقہا سے بخوبی واقف ہوں، وہ کتابی علم تو رکھتے ہیں لیکن (الاماشاءاللہ) نظر یعنی روحانی طاقت سے محروم ہیں۔ یہ دولت تو صرف اخلاص یعنی عشق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہو سکتی ہے۔

(۲) اب رہا یہ نصاریٰ کا قائم کردہ نظام تعلیم اور اُنہی کا مقرر کردہ نصابِ تعلیم، یہ دراصل تعلیم نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کو دین اور آدمیت دونوں سے برگشتہ کر دینے کی ایک سازش ہے اور افسوس کہ مسلمان اس سازش کا شکار ہوگئے یعنی وہ زہر کو تریاق سمجھ رہے ہیں۔

(۳) جو قوم اپنی انفرادی اور اجتماعی خودی کے فطری تقاضوں کی تکمیل کا انتظام نہیں کرتی، یعنی اپنی خودی کی تربیت نہیں کرتی، وہ کبھی اِس دُنیا

میں سربلندی اور حکومت حاصل نہیں کر سکتی۔ بلکہ وہ ہمیشہ دوسری طاقتور قوموں کی غلام رہے گی۔ فطرت کا قانون یہ ہے کہ حکومت اُسے ملتی ہے جس کے اخلاق بہتر ہوں۔

(۴) اس شعر میں اقبالؔ نے عمرانیات اور تمدّن کا ایک زبردست نکتہ بیان کیا ہے۔ کاش مسلمان اس پر کماحقہٗ غور کرلیں! کہتے ہیں۔ کہ فطرت کے قوانین، یا اُس کے طریق کار پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ افراد کے قصور تو کبھی کبھی معاف کر دیتی ہے۔ لیکن ملّت کا قصور معاف نہیں کرتی۔ یعنی فرض کرو ایک حکمراں قوم ہے۔ اس کے بعض افراد کبھی کبھی کسی گناہ کے مرتکب ہوجاتے ہیں۔ تو فطرت ان کے گناہوں سے اغماض یا چشم پوشی کرلیتی ہے۔ لیکن اگر پوری قوم گناہ میں مبتلا ہوجائے (گناہ سے مراد، اللہ کے احکام کی نافرمانی یا قوانین فطرت کی خلاف ورزی ہے) تو فطرت اس قوم کو کبھی معاف نہیں کرتی۔ چنانچہ اس قول کی صداقت تاریخ عالم پر نظر ڈالنے سے بخوبی واضح ہو سکتی ہے۔

جاوید سے

اس عنوان کے تحت، علاّمہ مرحوم نے تین دلکش نظمیں لکھی ہیں جن میں اپنے دوسرے بیٹے جاویدؔ اقبالؔ سے خطاب کیا ہے۔ اور اس کے پردہ میں ملّت اسلامیہ کے نوجوانوں کو بیش قیمت نصائح، فرمائی ہیں :۔

(ا)

(۱) یہ کفر والحاد کا زمانہ ہے، جو دین کو مٹانے پر تلا ہوا ہے، وجہ یہ ہے کہ اس دور میں جو خیالات کار فرما ہیں، اُن کی بنیاد اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پر نہیں، بلکہ ملاحدہ، زنادقہ اور دشمن اسلام جماعتوں کے افکار پر ہے۔

(۲) اے جاوید! بلکہ اے مسلمان نوجوانو! بادشاہوں کے دربار سے اللہ کے مقبول بارگاہ بندوں کی جھونپڑی زیادہ محترم اور دلکش ہے۔ یعنی بادشاہوں کے محلات میں کھانے پینے کو عمدہ چیزیں مل سکتی ہیں۔ لیکن روح کو مسرت نہیں حاصل ہو سکتی۔ یہ نعمت صرف اللہ والوں کی صحبت سے حاصل ہو سکتی ہے [۱]

---

[۱] حقیقت یہ ہے کہ اقبالؔ نے جاوید کے پردہ میں قوم کے نوجوانوں کو یہ نصیحت کی ہے کہ اللہ والوں کی صحبت اختیار کرو۔ لیکن افسوس کہ قوم نے اس نصیحت پر عمل نہیں کیا اور سچ پوچھو تو قوم کا اس میں کچھ قصور نہیں ہے، کیونکہ مسلمانوں نے انگلستان کو اپنا کعبۂ مقصود قرار دے رکھا ہے، تو نوجوان بغداد یا قاہرہ کیسے جا سکتے ہیں؟ کیا خوب لکھا ہے اکبر الٰہ آبادی نے ؎

اب کہاں ذہن میں باقی ہیں براق و رفرف
ٹکٹکی بندھ گئی قوم کی، انجن کی طرف

= = = = = = = = =

(۳) لیکن یہ عیاری اور فریب کاری کا زمانہ ہے۔ لہٰذا ہر اُس شخص پر جو متشرع صورت بنا کر تمہیں "جماعت صالحین" میں شامل ہونے کی دعوت دے۔ بغیر تحقیق، ایمان مت لے آنا۔

(۴) افسوس کہ اس کافرانہ نظامِ حکومت میں قرآن وحدیث کے علوم تقریباً مٹ گئے۔ اور آج ہمارے ملک میں ان علوم کے ماہرین کا قحط رونما ہو چکا ہے [۱]

(۵) افسوس کہ میرا ملک ان قدسی نفوس انسانوں سے خالی ہو چکا ہے، جن کی نگاہ سے، گناہوں میں آلودہ انسانوں کی اصلاح ہو جاتی تھی۔ لیکن تو اس حقیقت سے کبھی غافل مت ہونا کہ تو جس خاندان کا نام لیوا ہے، اُس کے افراد ہمیشہ سے بزرگوں کی صحبت میں بیٹھتے چلے آئے ہیں۔

"عارفانہ مذاق" یہ تصوف کی اصطلاح ہے۔ یعنی بزرگانِ دین اور اللہ والوں کی صحبت میں بیٹھنے کی خواہش۔

(۶) پس تو اپنے دل کو اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے منور کرے۔ اس کے بعد، اگر تو فرنگی اساتذہ سے مغربی تعلیم حاصل کرے گا، تو وہ تعلیم تجھے نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ [۲]

---

[۱] چنانچہ آج سارے پاکستان میں حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب مرحوم کے پایہ کا کوئی مفسّر یا محدث موجود نہیں۔ بلکہ اب تو مثنوی رومیؒ، اور مکتوبات سرہندیؒ کا پڑھانے والا بھی اس مُلکِ خداداد میں کوئی نظر نہیں آتا۔ ۱۲

(اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ)

[۲] علامہ نے اس شعر میں دراصل مسلمان والدین کو نصیحت کی ہے (باقی بر صفحہ ۲۴۴)

(۷) اے مسلمان نوجوان! تو شوق سے دنیاوی عزت وجاہ یا مال ودولت حاصل کر، لیکن دُنیا یا اس کی دلچسپیوں کو مقصود حیات مت بنا۔ اپنی ملّت سے رابطہ استوار کر، اور اپنے اسلامی اصُولوں کو ہر وقت پیش نظر رکھ، یعنی خودی کی تربیت سے غافل مت ہو۔

(۸) و (۹) دراصل انسان اپنے اندر غیر محدود طاقتیں رکھتا ہے۔ اِس حقیقت کو سامنے رکھ اور اپنی مخفی قوتوں کو بروئے کار آنے کا موقع دے۔ لیکن اس کے لیے تجھے ہر وقت جدّوجہد کرنی ہوگی۔ چنانچہ دیکھ لے اگر کسان محنت کرتا ہے تو اُس کا بویا ہوا ہر دانہ سینکڑوں دانے پیدا کر سکتا ہے اسی طرح تیری شخصیت میں سینکڑوں خوبیاں پوشیدہ ہیں۔ پس تو سعئ پیہم سے اپنی صلاحیتوں کی تربیت کر۔

(۱۰) غافل مت ہو، دُنیا دارالعمل ہے۔ اپنی زندگی کو کھیل کود میں ضائع مت کر، بلکہ ہُنر (علم وفن) حاصل کر اور دُنیا میں نام پیدا کر۔

(بقیہ صـ۲۴۳) کہ اسکولوں میں داخل کرنے سے پہلے اپنے بچّوں کے دل ودماغ میں اسلام کی محبّت پیدا کردو، تاکہ وہ مغربی تعلیم کے جراثیم سے محفوظ رہ سکیں لیکن افسوس کہ ہمارا طرزِ عمل اس کے برعکس ہے، جہاں بچّہ نے ہوش سنبھالا، والدین نے اُسے کافر اتالیق کے حوالہ کر دیا۔ اسی لیے اکبر الٰہ آبادی نے ان نوجوانوں کی "اسلامی زندگی" پر بایں الفاظ ماتم کیا ہے ؎

گذران کا ہوا کب عالمِ اللہ اکبر میں
پلے کالج کے چکّر میں مرے صاحب کے دفتر میں

(۲)

(۱) یاد رکھ! اگر دل میں ترقی کا جذبہ نہ ہو تو انسان اس دُنیا میں کامیاب

(۲) و زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ دیکھ لے! جو حیوان، یا طائر عقل مند اور چالاک ہوتا ہے، وہ صیاد کے جال میں نہیں آتا۔ اسی طرح اگر تو، زیرکی اور چُستی سے کام لے تو کسی کے فریب میں نہیں آسکے گا۔

(۳) آبِ حیات، اِسی دُنیا میں ہے، اگر تو اسے حاصل کرنا چاہتا ہے، تو اس کے حصول کی تڑپ اپنے دل میں پیدا کر۔

آبِ حیات سے مراد ہے ایسی زندگی جس سے صفتِ دوام حاصل ہو جائے یعنی اگر تو یہ چاہتا ہے کہ تیرا نام دُنیا میں ہمیشہ زندہ رہے تو اس مقصد کے حصول کے لیے کوشش کر۔

(۴) اے بیٹے! غیرت، یعنی دین کی عزّت دُنیا میں برقرار رکھنے کا بے پناہ

(۵) و بے پناہ جذبہ، یہی حقیقی طریقت، یعنی شریعت کی روح ہے، اسلامی شریعت کا مقصد ہی یہ ہے کہ اُس پر عمل کرنے سے مسلمان کے اندر دین کے لیے غیرت پیدا ہو جائے۔

ع دوسرا نام اسی دین کا ہے فقرِ غیور

جب تک غیرت کا رنگ پیدا نہ ہو، شانِ فقر کی تکمیل نہیں ہو سکتی چنانچہ جو چیز مسلمان کو غیر اللہ کی غلامی یا اطاعت سے باز رکھ سکتی ہے۔ وہ یہی غیرت تو ہے۔ اگر مسلمان میں غیرت نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ چنانچہ دیکھ لے، شاہین موت قبول کرلے گا، لیکن چکور، یا تیتر کی غلامی نہیں کرے گا۔

سلطان ٹیپو شہید میں یہ غیرت ہی تو تھی جس کی بنا پر اُس نے موت

قبول کی۔ لیکن کافر کی غلامی قبول نہیں کی۔ اور نظام علی خاں میں اسی جواہر کا فقدان تھا۔ چنانچہ اس نے غلامی کرلی، اور غلاموں کا ایک طویل سلسلہ قائم کردیا۔ اور آج حیدر آباد کا "راج پرمکھ" اسی فقدانِ غیرت کی زندہ مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔

(۷تا۸) یاد رکھ! شاعری بذاتِ خود کوئی نایاب یا قابلِ فخر چیز نہیں ہے دُنیا میں ایک نہیں، سیکڑوں آدمی شاعری کے اعتبار سے انوریؔ اور جامیؔ کے ہم پلہ گذر چکے ہیں۔ میں شاعری کو اپنے لیے باعثِ فخر نہیں سمجھتا۔ میں عرفِ عام کے لحاظ سے شاعر نہیں ہوں، بلکہ میری حقیقت صرف اتنی ہے کہ میں قوم کو اپنے دردِ دل کی داستان سناتا ہوں، جس طرح کوئی عاشق محبوب کے بالاخانہ کے نیچے کھڑے ہوکر، اپنا دردِ دل اُسے سُنادے۔

(۸) میں جو دُنیا کی نظروں میں محترم ہوں، اس کی وجہ یہ نہیں، کہ میں کوئی بلند پایہ شاعر ہوں، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے قرآن اور حدیث کے حقائق و معارف نہایت سچائی کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کر دیئے ہیں۔ اور کسی کی رعایت نہیں کی۔ ع

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق

(۹) یاد رکھ! شہرت اور نیک نامی کسی شخص کو میراث میں نہیں مل سکتی۔ یہ دولت صرف اُسے مل سکتی ہے جو اس کے لیے کوشش کرے۔ اور اور اللہ کی سُنت یہ ہے کہ وہ اُنہیں لوگوں کو نیک نامی عطا کرتا ہے جو اُس کے مستحق ہوتے ہیں۔

(۱۰) میں تجھے وہی نصیحت کرتا ہوں جو نظامی گنجوی نے اپنے بیٹے کو کی

تھی۔ کہ اے بیٹے! دنیا میں جس جگہ بزرگی درکار ہے، وہاں محض میرے بیٹے ہونے کی بناء پر تجھے جگہ نہیں مل سکے گی، بزرگی کے مقام پر پہنچنے کے لیے بزرگ ہونا شرط ہے۔ پس بزرگی حاصل کر۔

(۳۱)

(۱) مومن، اس دُنیا، اور اُس کی فریب کاریوں سے ہر وقت متنفر رہتا ہے۔ کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ دُنیا پرست علماء اور امراء دونوں حصول جاہ کے لیے سرگرداں رہتے ہیں۔ جب بندۂ مومن یہ دیکھتا ہے۔ کہ "دین دار" لوگ ضرورت کے وقت، "دین" کو بھی داؤں پر لگا دیتے ہیں تو اُسے بہت رنج ہوتا ہے۔

(۲) آج دُنیا ہر قسم کے فنکاروں سے بھری پڑی ہے۔ لیکن مردِ مجاہد کہیں نظر نہیں آتا۔

(۳) اے بیٹے! اگر تجھ میں ہمت ہو تو، اپنے اندر وہ فقر پیدا کر جس کی تعلیم سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دُنیا کو دی تھی۔

نوٹ:۔ فقر کی دو قسمیں ہیں۔ ایک فقر حجازیؔ۔ دوسرا فقر ہندیؔ۔

(۴) فقر حجازی کی شناخت یہ ہے کہ اس فقر سے، آدمی میں اللہ کی ہی شانِ بے نیازی پیدا ہو جاتی ہے۔ یعنی صاحب فقر حجازی کسی انسان کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کرتا۔ اور نہ اللہ کے سوا کسی کو اپنا حاجت روا سمجھتا ہے۔

(۵) اس صاحب فقر کا مقام، کافروں کے حق میں اسی طرح پیامِ موت بن جاتا ہے، جس طرح شہباز کا مقام چڑیا اور کبوتر کے لیے۔ یعنی

مردِ مومن کفار پر اسی آسانی کے ساتھ غالب آ سکتا ہے۔ جس آسانی کے ساتھ شہباز کبوتر پر۔

(۶) نیز اس فقر سے انسان کی عقل، بو علی سینا۔ اور امام فخر الدین رازی (صاحب تفسیر کبیر) کی تصانیف کا مطالعہ کئے بغیر منوّر ہو جاتی ہے۔

(۷) اور اگر فطرت میں غلامی کا مادہ موجود نہ ہو (جس کا کوئی علاج نہیں) تو اس فقر کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان بت شکن بن جاتا ہے۔ اور اُسے وہی سطوت حاصل ہو جاتی ہے، جو سلطان محمود غزنوی کو حاصل تھی۔

(۸) یہ مردِ مومن، دراصل مُردوں کو زندہ کر سکتا ہے۔ یعنی اُس کی صحبت کے فیض سے کافر، مسلمان ہو جاتے ہیں۔ لیکن اُسے نَے نوازی کا چنداں شوق نہیں ہوتا۔ یعنی وہ اسرافیل کی طرح صور پھونک کر عالم کو تہ و بالا نہیں کرتا، بلکہ محض اپنی نگاہ سے انقلاب پیدا کر سکتا ہے اور کرتا ہے یعنی مُردوں کو زندہ کر سکتا ہے۔ دوسرا مطلب اس شعر کا یہ ہو سکتا ہے کہ جو کام اسرافیل، صور سے لیتا ہے

(۹) مومن یہ کام اپنی نگاہ سے لیتا ہے۔ بظاہر اس کی نگاہ سے دُنیا میں تلاطم برپا ہو جاتا ہے۔ لیکن دراصل وہ اپنی نگاہ سے بگڑے ہوئے کام بناتا ہے۔ اور لوگوں کی کارسازی کرتا ہے یعنی اس کا وجود دُنیا کے لیے باعثِ رحمت ہوتا ہے۔

(۱۰) جو مسلمان، اس فقرِ غیور کا مالک ہوتا ہے، وہ اپنی زبان سے وہی کام لے سکتا ہے جو ایک غازی تیر و سناں سے لیتا ہے۔

یعنی غازی اور صاحبِ فقر دونوں جہاد کرتے ہیں، ایک تلوار سے دوسرا اپنی نگاہ اور زبان سے۔ غازی تلوار سے کفر کا مقابلہ کرتا ہے اور فقیر اپنی نگاہ سے۔

چنانچہ جو کام شہاب الدین غوری نے تلوار سے کیا وہ ہمارے حضرت خواجہ معین الدین اجمیری سلطان الہندؒ نے نگاہ سے انجام دیا۔

سلطان شہاب الدین غوری کا نام غایت شہرت کی بنا پر محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ اسی خوش نصیب سلطان نے ۱۱۹۲ء میں دہلی اور اجمیر کے آخری فرمانروائے پتھورا کو میدانِ جنگ میں قتل کر کے ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت قائم کی ۱۲۰۶ء میں باطنی فرقہ کے ایک پیرو نے دھوکہ سے قتل کر دیا۔ ۱۲

حضرت سلطان الہند خواجہ غریب نوازؒ۔ ولادت سنجر ۵۳۰ھ۔ جب مدینہ منورہ حاضر ہوئے تو سرکار دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت دی کہ ہم نے تمہیں ہندوستان کی ولایت (روحانی بادشاہت) عطا کی۔ چنانچہ آپ ۵۸۶ھ میں لاہور تشریف لائے۔ اور مخدوم عالم حضرت داتا گنج بخش شیخ علی ہجویریؒ کے مزار مبارک پر چالیس دن قیام کے بعد دہلی کو اپنے قدموں سے برکت دی۔ وہاں سے پاپیادہ اجمیر تشریف لے گئے۔ راستہ میں جس پر نگاہ پڑ جاتی تھی، آپ کا حلقہ بگوش ہو جاتا تھا۔ چنانچہ آپ اجمیر پہنچے تو ہمراہیوں کی تعداد آٹھ سو سے متجاوز ہو چکی تھی۔ سلطان شہاب الدین نے تلوار کے زور سے ملک فتح کیا، آپ نے نگاہ کے زور سے قلوب مسخر کیے۔ ۱۲

(۱۱) پس اے نوجوان! تو اللہ سے اس فقیری کے حصول کی دُعا کر۔ کیونکہ مومن کے لیے یہی فقیری دراصل امیری ہے۔

اقبالؔ نے اس خیال کو اپنی کئی کتابوں میں مختلف طریقوں سے پیش کیا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کا نصب العین یہی ہے کہ مسلمان فقر کی طاقت سے حکومت کرے، تاکہ وہ حکومت دنیا کے لیے رحمت بن سکے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ فاروق اعظمؓ کی حکومت، اسی لیے اہل عالم کے لیے باعث رحمت تھی ؎

آں مسلماناں کہ میری کردہ اند
در شہنشاہی فقیری کردہ اند

تیسرا باب

(عورت)

تمہید عورت کا مسئلہ ہمارے زمانہ میں بہت پیچیدہ صورت اختیار کر چکا ہے اور یہ پیچیدگی مغربی تہذیب کی پیدا کردہ ہے۔ غلط تعلیم نے عورت کے دل میں یہ غلط خیال جاگزیں کر دیا ہے کہ مرد اور عورت میں کامل مساوات ہے اور عورت کسی اعتبار سے بھی مرد کی محتاج یا دستِ نگر نہیں ہے۔ اگر دُنیا قرآن مجید کے اصُول اختیار کرے تو عورت کا مسئلہ بآسانی حل ہو سکتا ہے۔ اللہ فرماتا ہے۔ اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ یعنی مرد حاکم ہیں عورتوں پر۔

اس کی تشریح یہ ہے کہ جہاں تک انعامات الٰہیہ کا تعلق ہے عورت اور مرد دونوں یکساں ہیں۔ لیکن اس لحاظ سے کہ عورت اپنی حفاظت کے لیے مرد کی محتاج ہے، وہ مرد سے کمتر یا فروتر ہے۔

اور اس لحاظ سے کہ وہ ماں بنتی ہے اس کا درجہ اس قدر بلند ہے ۔ کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :۔ " اَلْجَنَّةُ تَحْتَ اَقْدَامِ اُمَّهَاتِ " یعنی جنت ماؤں کے پاؤں کے نیچے ہے ۔ نیز اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ عورت کا حقیقی مقام آفس یا کارخانہ یا کلب یا میدانِ جنگ نہیں ہے بلکہ گھر ہے ۔ آج کل صورت یہ ہے کہ عورت گھر میں رہنا نہیں چاہتی اور یہی ساری خرابیوں کی جڑ ہے ۔

مردِ فرنگ

(پہلی)

اس نظم میں اقبالؔ نے یہ بتایا ہے ، کہ یورپ میں عورت کا مسئلہ اس قدر پیچیدہ کیوں ہو گیا ہے ۔ کہتے ہیں کہ :۔

اگرچہ یورپ کے حکماء ایک عرصہ سے مسئلہ زن کو سلجھانے کی کوشش کر رہے ہیں ۔ لیکن انہیں ابھی تک کامیابی نہیں ہو سکی ۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ معاشرت میں عورت کی کیا حیثیت ہے ؟

مغربی معاشرہ میں جو خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ابھی تک یہ طے نہیں ہو سکا کہ عورت کی حیثیت کیا ہے ۔ لیکن ہم ان خرابیوں کا ذمہ دار عورت کو قرار نہیں دے سکتے ۔ یعنی یہ تو سچ ہے کہ مغرب میں سوسائٹی کا نظام بگڑ گیا ہے لیکن اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ عورت کی فطرت خراب ہے ۔ نہیں وہ تو بالطبع بہت شریف ہے ۔ زمین و آسمان اس کی شرافت پر گواہ ہیں ۔

دراصل بات یہ ہے کہ یورپ کے مرد بھولے ہیں ، وہ عورت کی فطرت سے واقف نہیں ہیں ۔ اس لیے معاشرت میں فساد رونما ہو گیا ۔

عورت فطرتاً ، مرد کی دستِ نگر اور اپنی حفاظت کے لیے اس کی محتاج ہے ۔ علاوہ بریں اُسے فطرت نے ماں بننے اور بچوں کی پرورش کرنے اور گھر کا انتظام کرنے کے لیے پیدا کیا ہے ۔ یعنی قدرت نے مردوں اور عورتوں کے لیے جداگانہ دائرہ عمل مقرر کر دیا ہے ۔ وہ اس لیے پیدا نہیں کی گئی ہے کہ میدانِ جنگ میں دشمنوں کا مقابلہ کرے بلکہ اس لیے پیدا کی گئی ہے کہ :۔

(۱) ماں بنے یعنی بچے پیدا کرے اور ان کی صحیح طریق پر تربیت کرے ۔

(۲) گھر کا انتظام کرے اور مرد جو کچھ کما کر لائے اُسے سلیقہ کے ساتھ صرف کرے اور کچھ رقم پس انداز کرے ۔

(۳) اپنی عصمت کی حفاظت کرے تاکہ سوسائٹی میں فساد رونما نہ ہو ۔

الغرض فطرت نے اس کے لیے جو وظائفِ حیات مقرر کر دئے ہیں ان پر کاربند رہ کر معاشرت کو خوشگوار بنائے ۔

یورپ نے فطرت کے اصول اور عورت کی فطرت دونوں باتوں کو مدِّ نظر نہیں رکھا اور عورت کو اپنی تفریح کا آلہ بنا لیا یعنی وہ گھر کی ملکہ بننے کے بجائے کلب کی زینت بن گئی ۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ معاشرت میں فساد رونما ہو گیا ۔

ایک سوال

(دوسری)

اس نظم میں اقبالؔ نے یورپ کے معاشرتی نظام پر تنقید کی ہے۔ کہ یوں تو حکمائے یورپ نے سائنس اور فلسفہ میں بڑی ترقی کی ہے چنانچہ مشرق اور مغرب کے لوگ اُن کے خیالات کی تقلید کر رہے ہیں۔ لیکن اُن کی حکمت نے بنی آدم کو زندگی بسر کرنے کا طریقہ نہیں سکھایا اور معاشرت کا صحیح نظام قائم نہیں کیا اور اسی غلطی کا یہ نتیجہ ہے کہ مرد تو بیکاری میں مبتلا ہیں اور عورتوں میں ضبطِ تولید کا میلان پایا جاتا ہے۔ یعنی وہ بچے پیدا کرنے سے گھبراتی ہیں کیونکہ وہ اُن کی پرورش کو اپنے لیے وبالِ جان سمجھتی ہیں۔

پردہ

(پہلی)

اس نظم میں اقبالؔ نے ایک عجیب نکتہ پیدا کیا ہے عام طور سے "پردہ" کو عورت سے مخصوص سمجھا جاتا ہے یعنی ہم یہ سمجھتے ہیں کہ صرف عورت پردہ کرتی ہے مرد پردہ نہیں کرتے لیکن اقبال کہتے ہیں کہ دونوں پردہ میں ہیں۔ کہتے ہیں کہ

اگرچہ دنیا میں بہت سے انقلاب آئے لیکن یہ دنیا جہاں تھی، وہیں ہے۔ میں نے عورت اور مرد میں کوئی تفاوت نہیں

دیکھا دونوں خلوت نشین ہیں۔ بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اولادِ آدم ابھی تک پردہ میں ہے کیونکہ ابھی تک کسی نے اپنی خودی کو پردہ سے باہر نہیں نکالا۔

اقبالؔ کہتے ہیں کہ لوگ غلط کہتے ہیں کہ صرف عورت پردہ میں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ دونوں پردہ میں ہیں۔ کیونکہ ان کی خودی پردہ میں ہے۔ یعنی اس نظم میں اُنہوں نے نہایت دلپذیر انداز میں ہمیں اظہارِ خودی کی طرف راغب کیا ہے۔

خلوت

(دوسری)

اس نظم میں اقبالؔ نے خلوت (پردہ) کے فوائد بیان کئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس دَور کے لوگوں میں اپنی نمود و نمائش کا جذبہ حد سے بڑھ گیا ہے جس کو دیکھو اس دُھن میں ہے کہ کسی طرح مجھے شہرت نصیب ہو جائے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں کا چہرہ یعنی ظاہر تو بہت روشن اور خوبصورت ہے لیکن دل یعنی باطن بہت تاریک ہے۔

یاد رکھو! جب نظارہ کرنے کا شوق حد سے بڑھ جاتا ہے۔ تو آدمی کے خیالات پراگندہ اور ابتر ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ ہر وقت نئے نئے مناظر دیکھنے کی آرزو میں لگا رہتا ہے۔ کبھی کہتا ہے فلاں باغ میں چلو! کبھی سوچتا ہے فلاں کلب میں جا کر بیٹھوں۔ کبھی سینما کا طواف کرتا ہے۔ کبھی ہوٹلوں میں رات بسر کرتا ہے۔

(۳) یاد رکھو! وہی قطرہ آبِ نیساں، گوہر بنتا ہے جو صدف کے آغوش میں پنہاں ہو جاتا ہے۔ یعنی جب اُس قطرہ کو خلوت نصیب ہوتی ہے، (جب وہ پردہ کر لیتا ہے، تو وہ موتی بن جاتا ہے۔ اسی طرح خودی، خلوت میں مستحکم ہوتی ہے۔ یعنی جو آدمی اپنی خودی کی تربیت کرنی چاہتا ہے۔ اُسے نمود و نمائش کا جذبہ دل سے نکال دینا چاہیئے اور ۲۴ گھنٹے میں کچھ وقت خلوت کے لیے بھی مخصوص کرنا چاہیئے تاکہ وہ محاسبۂ نفس کر سکے اور تنہائی میں اپنی زندگی پر غور کر سکے کہ کس نہج پر بسر ہو رہی ہے۔

چنانچہ دنیا میں جس قدر بڑے بڑے آدمی گذرے ہیں خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم سب خلوت پسند تھے۔ لیکن اقبالؔ افسوس کرتے ہیں کہ یہ زمانہ ایسا ہے کہ اس میں دیر و حرم میں بھی خلوت میسر نہیں آسکتی، عورتیں اور مرد دونوں اپنے جسموں کی نمائش میں منہمک ہیں۔ اس لیے وہ اپنی روح سے یعنی اس کی تربیت سے غافل ہیں۔

عورت

اس نظم میں اقبالؔ نے ہمیں عورت کے حقیقی مرتبہ اور مقام سے آگاہ کیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اگرچہ ذہنی اعتبار سے عورت فروتر ہے۔ اور یہی وجہ کہ آج تک کوئی عورت نہ نبی ہوئی ہے نہ فلسفی یا منطقی، لیکن انبیاء اور حکماء دونوں نے پرورش اسی کی آغوش میں پائی ہے کہتے ہیں:۔

(۱) عورت کا وجود اس دُنیا کی خوبصورتی کا باعث ہے۔ اور مردوں کی زندگی میں جو کچھ سوز و دروں پایا جاتا ہے۔ اس کا باعث یہ ہے کہ وہ ہم سے موافقت پیدا کر سکتی ہے۔ اگر اس کا ساز (رفاقت) ہماری زندگی میں شامل نہ ہو تو ہمارے اندر سوز (گرمی) پیدا نہیں ہو سکتا۔ یعنی وہ ہم سے مانوس ہو کر ہماری زندگی کو پُر کیف بنا دیتی ہے۔

(۲) اُس کی مُشتِ خاک، پاکیزگی اور شرافت میں ثریا سے بھی اُونچی ہے۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ دُنیا میں جہاں کہیں شرافت پائی جاتی ہے۔ اس کا منبع عورت ہی کی ذات ہے۔

(۳) یہ سچ ہے کہ وہ فلسفہ میں کوئی بلند پایہ کتاب تصنیف نہ کر سکی لیکن یہ شرف اس کے لیے کیا کم ہے کہ وہ فلاسفہ کو عالمِ وجود میں لائی اور اُس نے ساری دُنیا کے حکماء کو اپنی آغوش میں پالا اور اس لائق بنایا کہ وہ فلسفہ طرازی کر سکیں۔

نوٹ:۔ "مکالمات افلاطون" افلاطون کی تعلیمات اور فلسفیانہ خیالات کے مختلف مجموعے ہیں جو اُس کی تصانیف میں سب سے زیادہ مشہور ہیں۔

اس نظم سے ناظرین کو اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ اقبال، عورت کو کس قدر عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے لیکن وہ اُس بے پردگی اور بے حیائی کے سخت خلاف تھے جو مسلمان عورتیں، محض یورپ کی کورانہ تقلید اور اپنے شوہروں کی کوتاہ بینی کی وجہ سے اختیار کرتی جاتی ہیں اور قیام پاکستان کے بعد تو یہ مرض علاج کی سرحد سے بہت آگے گذر چکا ہے۔ میرے خیال میں بہت اچھا ہوا کہ اقبال دُنیا میں موجود نہیں۔ ورنہ اگر وہ آج کراچی میں دخترانِ ملّت کا ذوقِ نمائش دیکھتے تو شاید اپنی تمام تصانیف کو نذرِ آتش کر کے تبت میں سکوت اختیار

کر لیتے!

آزادئ نسواں

اس نظم میں اقبالؔ نے بڑی خوبی کے ساتھ آزادئ نسواں کے مسئلہ پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے یعنی در پردہ پردہ کی حمایت بھی کر دی اور بظاہر کچھ نہیں کہا۔ کہتے ہیں کہ

(۱ تا ۳) اگرچہ میں بخوبی جانتا ہوں کہ بے پردگی عورت کے حق میں زہر ہے اور پردہ اس زہر کا تریاق ہے لیکن میں مصلحتاً خاموش ہوں کیونکہ مغرب کے مقلدین کور، یعنی فیشن پرست مسلمان تو مجھ سے پہلے ہی ناراض ہیں، میں اُنہیں مزید ناراضگی کا موقع نہیں دینا چاہتا۔

(۴) عورت کو اللہ نے اِس معاملہ میں بڑی بصیرت عطا فرمائی ہے۔ وہ خود فیصلہ کر سکتی ہے کہ آرائش اور قیمت میں کونسی چیز زیادہ ہے؟

آزادی اور بے پردگی یا زمرد کا گلوبند یعنی پردہ نشینی؟

لفظ "زمرد کا گلوبند" اس مصرع میں بہت لطف دے رہا ہے۔ اِس کے تین معنی ہیں (۱) بے پردہ عورتیں چونکہ زمرد کا گلوبند، پسند نہیں کرتیں اس لیے اس لفظ سے مراد ہے "پردہ"۔ (۲) گلوبند سے مراد ہے پابندی اور قید اور پردہ بھی ایک قید ہے (۳) زمرّد کا گلوبند بہت قیمتی چیز ہے۔ للٰہذا اقبال دریافت کرتے ہیں کہ تمہیں آزادی پسند ہے۔ جو ادنیٰ چیز ہے۔ یا زمرّد کا گلوبند پسند ہے جو قیمتی چیز ہے! نیز زمرّد کا گلوبند بہت قیمتی چیز ہے جو عموماً شوہر جہیز میں پیش کرتا ہے اس لیے اُس سے شوہر کی فرمانبرداری بھی مراد ہو سکتی ہے۔

عورت کی حفاظت

اس نظم میں اقبالؔ نے عمرانیات کا ایک زبردست نکتہ بیان کیا ہے جس کی اہمیت نہ پہچاننے کی وجہ سے یورپ کا معاشرتی نظام تہ و بالا ہو چکا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ نے عورت کو فطری طور پر کمزور بنایا ہے وہ اپنی اور اپنی عصمت کی حفاظت کے لیے مرد کی محتاج ہے۔

رضیہ سلطانہ اور چاند بی بی اور لکشمی بائی سب جانتے ہیں کہ کس قدر بہادر عورتیں گذری ہیں ان تینوں نے گھوڑے پر سوار ہو کر میدانِ جنگ میں دشمنوں کا مقابلہ اور فوجوں کی رہنمائی کی۔ لیکن اس کے باوجود تینوں (شوہر) کی محتاج تھیں یعنی مرد کی حمایت اور حفاظت کے بغیر زندگی بسر نہ کر سکیں۔ ان میں سے کسی نے یہ نہیں کہا یا اپنے طرزِ عمل سے یہ ثابت نہیں کیا کہ مجھے مرد یا شوہر کی ضرورت نہیں ہے۔ عورت گھوڑے پر سوار ہو کر، تلوار چلا سکتی ہے، بلکہ تختِ سلطنت پر بیٹھ کر حکومت بھی کر سکتی ہے، لیکن اپنی نسوانیت کی حفاظت نہیں کر سکتی۔

(۱) کہتے ہیں کہ ایک زندہ حقیقت میرے دل میں چھپی ہوئی ہے جسے میں بیان تو کر سکتا ہوں لیکن جو شخص بے غیرت ہے وہ اُسے کیا سمجھ سکتا ہے؟

(۲) وہ حقیقت یہ ہے کہ نسوانیتِ زن (عورت کا عورت پن) کی حفاظت نہ پردہ سے ہو سکتی ہے نہ تعلیم قدیم سے، نہ تعلیم جدید سے بلکہ صرف (مرد) اس کی نسوانیت کی حفاظت کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جارج ششم نے بھی اپنی بیٹی کی شادی کر دی حالانکہ وہ ولیۂ عہد ہے

اور آئندہ خود انگلستان کی ملکہ بن جائے گی۔

(۳) جس قوم نے اس نکتہ کو نہ سمجھا وہ بہت جلد تباہ ہوجائے گی۔

یورپ نے بحیثیت مجموعی اس نکتہ کو فراموش کردیا ہے۔ وہاں آزادیٔ نسواں کا مفہوم یہ ہے کہ عورت خود اپنی نسوانیت کی حفاظت کر سکتی ہے حالانکہ یہ خلاف فطرت ہے۔ اور چونکہ خلاف فطرت ہے اس لیے یورپ کا معاشرتی نظام بالکل تہ و بالا ہوچکا ہے اور (عنقریب) جو حال۔ رومتہ الکبریٰ کا ہوا تھا وہی اِس مہذب خطّۂ ارض کا ہونے والا ہے ۱۲۰

عورت اور تعلیم

اس نظم میں اقبالؔ نے یہ بتایا ہے کہ عورت کے لیے کس قسم کی تعلیم درکار ہے اور مغربی تعلیم نے عورت کی زندگی پر کیا اثرات مرتب کیئے ہیں کہتے ہیں کہ :-

(۱) فرنگی تہذیب کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ (عورت) جسے قدرت نے ماں بننے کے لیے پیدا کیا تھا، ماں بننے سے انکار کرنے لگی ہے اور وہ بچے پیدا کرنے اور اُنہیں پالنے کو اپنی آزادی میں رکاوٹ سمجھنے لگی ہے عورت کے اس رجحان کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ سلسلۂ اولادِ آدم منقطع ہوجائیگا۔

(۲) جس علم کی تاثیر سے عورت میں یہ جذبات پیدا ہوئے ہیں کہ وہ اپنی فطری حیثیت سے منکر ہوگئی ہے، اسی علم کو سمجھ دار لوگ، انسانیت کے لیے موت سے تعبیر کرتے ہیں، یعنی ایسا علم عورت کے حق میں زہر کا حکم رکھتا ہے۔

(۳) پس ثابت ہوا کہ اگر عورت کی تعلیم میں دین کا عنصر شامل نہ ہو۔ اور یورپ کے نظامِ تعلیم میں یہ عنصر شامل نہیں ہے۔ کیونکہ یہ نظام، فرنگی تہذیب پر مبنی ہے اور یہ تہذیب لادینی پر مبنی ہے۔ تو وہ علم و ہنر عورت کے پاکیزہ جذبات کے حق میں موت کا حکم رکھتا ہے۔

واضح ہو کہ اللہ نے عورت کو ماں بننے کے لیے پیدا کیا ہے اور اسی لیے عورت کو محبت اور ایثار کا مادّہ عطا فرمایا ہے۔ کیونکہ جب تک عورت میں یہ جذبات شدت کے ساتھ کارفرما نہ ہوں وہ بچوں کی پرورش کے لیے اپنے عیش کو قربان نہیں کرسکتی۔ لیکن مغربی تہذیب کا نتیجہ یہ ہے کہ عورت کا دل محبتِ مادری کے جذبات سے مُعرّا ہوتا جاتا ہے۔

عورت

اس نظم میں اقبالؔ نے عورت کی فطری حیثیت کو واضح کیا ہے کہ وہ فعلِ تخلیق میں مرد کے تعاون کی محتاج ہے۔ اگرچہ اس لحاظ سے عورت مرد کی دستِ نگر بن جاتی ہے۔ لیکن اس صورتِ حال سے کوئی مفر نہیں ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ

(۱) مرد اپنی ذاتی خوبیوں کا اظہار، دوسرے کی مدد کے بغیر کرسکتا ہے لیکن عورت اپنے جوہر کا اظہار مرد کے تعاون کے بغیر نہیں کر سکتی، یعنی عورت کا جوہر یہ ہے کہ وہ "ماں" بنتی ہے اور یہ کام مرد کے بغیر سرانجام نہیں پاسکتا۔

(۲) وہ اپنے جوہر کے اظہار کے لیے فطری جذبہ رکھتی ہے۔ لیکن چونکہ یہ

جذبہ مرد کے تعاون کے بغیر تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا، اسی لیے وہ اس کے تعاون کی طرف طبعی میلان رکھتی ہے۔ اور اسی لیے اس کی شخصیت میں لذتِ تخلیق کا عنصر نمایاں ہے۔

(۳) اس کی زندگی کے اسرار، اسی لذتِ تخلیق کی بدولت، آشکار ہوتے ہیں۔ اور اسی جذبہ کی بدولت دنیا کی یہ رونق برقرار ہے۔ اس میں شک نہیں کہ عورت کو اس جذبہ کی تکمیل کے لیے مرد کا دستِ نگر بننا پڑتا ہے، لیکن اس عقدہ کے حل کی اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں ہے کہ عورت اس معاملہ میں اپنی احتیاج کا اعتراف کرے۔ کیونکہ قانون فطرت یہی ہے۔"

ادبیات اور فنون لطیفہ

تمہید اس باب میں حضرت علامہ مرحوم نے ادب اور فنون لطیفہ (شاعری مصوری موسیقی) پر اسلامی زاویۂ نگاہ سے تنقید کی ہے، اور مسلمانوں کو مغربی وغیر اسلامی نظریات اور خیالات کی خرابیوں اور گمراہیوں سے آگاہ کیا ہے۔

چونکہ اقبالؔ دنیا کی ہر چیز کو اسلام کی روشنی میں دیکھتے ہیں اس لیے پاکستان کے اشتراکی اور الحاد پرست ادیب جو اپنے آپ کو "ترقی پسند" کہتے ہیں، اُن سے سخت ناراض ہیں اور ان پر "رجعت پسندی" کا الزام عائد کرتے ہیں مقصد ان لوگوں کا یہ ہے کہ مسلمان نوجوان اقبال سے بدظن ہو جائیں تاکہ ملحدانہ خیالات کو بآسانی قبول کر سکیں۔

کیا اچھا ہوتا اگر یہ لوگ، اقبالؔ کے روحانی فلسفہ پر تنقید کے بعد اپنے مادّی فلسفہ کی تشریح بھی کرتے اور اس سلسلہ میں ہمیں صرف مادّہ (MATTER) کی منطقی تعریف سے آگاہ کر دیتے تاکہ ہم دوسرا منطقی سوال یہ دریافت کر سکتے کہ مادّہ میں جو حرکت پائی جاتی ہے وہ ذاتی ہے یا عرضی؟ جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ مادّہ ہے کیا؟ اُس وقت تک حرکت کا مسئلہ زیرِ بحث نہیں آسکتا۔ لیکن ہمارے عُریانی پسند اشتراکی ادیبوں کو علم و فن سے کیا سروکار؟

دین و ہُنر

اس نظم میں اقبالؔ نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ دین اور ہنر (آرٹ) میں کیا رشتہ ہے؟ واضح ہو کہ انیسویں صدی میں یورپ کے ملحدوں نے یہ نظریہ پیش کیا کہ مذہب (یورپ میں صرف مذہب پایا جاتا ہے وہاں کے حکمار دین کے مفہوم سے بیگانہ ہیں) اور آرٹ میں کوئی رشتہ نہیں ہے۔ نیز آرٹ مقصود بالذات شئے ہے۔ اس کو انگریزی میں "فن برائے فن" یعنی ART FOR THE SAKE OF ART) کے نظریہ سے تعبیر کرتے ہیں۔

یہ ملحدانہ نظریہ، تہذیبِ مغرب کے ناپاک شانوں پر سوار ہو کر ہندوستان میں اس نظامِ تعلیم کی بدولت بآسانی شائع ہو گیا جسے فرنگیوں نے ہمارے سر پر مسلط کر دیا ہے، اور ہماری قوم کے اُن بدنصیب نوجوانوں نے جو یورپ کے ملحدانہ خیالات کا شکار ہو چکے ہیں، اس کو بڑی خوشی سے قبول کر لیا۔ کیونکہ یہ نظریہ اُن کے خیالات کے عین مطابق ہے۔ اور اس کا نام اُنہوں نے اپنے زعمِ باطل کی رو سے "ترقی پسند ادب" رکھا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ ادب انسانوں کو حیوانوں کی صف میں لا کر کھڑا کر دیتا ہے۔ اور آج ہندوستان اور پاکستان میں ہر قسم کی عُریاں نگاری فحاشی اس ادب کے نام سے فروغ پا رہی ہے اور ہماری قوم کے نوجوان (لڑکے اور لڑکیاں دونوں) زہر کے پیالہ کو آبِ حیات سمجھ کر نوش جانِ ناتواں فرما رہے ہیں!

علامہ مرحوم نے اس نظریہ کی تردید میں اپنا زورِ قلم پورا صرف کر دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ:-

(۱) موسیقی ہو یا شاعری، سیاست ہو یا علم و فن، دین ہو یا آرٹ یہ سب

انسانی زندگی کے لیے مفید ہو سکتے ہیں۔ انسان اِن سب چیزوں سے فوائد حاصل کر سکتا ہے۔

(۲) ان کی اصل، انسانی ضمیر میں پوشیدہ ہے اور ان کا مقام بہت اُونچا ہے۔

(۳) لیکن یہ سب انسانیت کے خادم ہیں۔ یعنی اگر ان علوم و فنون سے انسان کی خودی مستحکم ہو سکے تو لائقِ ستائش ہیں۔ ورنہ سب فضول ہیں۔ آرٹ اور زندگی میں یہ رشتہ ہے کہ آرٹ (فنونِ لطیفہ) زندگی کا خادم ہے۔ فن برائے فن کا نظریہ غلط ہے یعنی فن مقصود بالذات نہیں ہے انسانی شخصیت، فنونِ لطیفہ کی کسوٹی ہے۔ جو فن، انسانیت کو بلند کر سکے وہ اچھا ہے اور جس فن سے انسانیت تنزل کی طرف مائل ہو وہ بُرا ہے۔ اس معیار کی رُو سے "ترقی پسند ادب" مسلمانوں کی نظر میں مذموم ہے۔

(۴) یاد رکھو! اگر ادب اور آرٹ کو، دین کی قید سے آزاد کر دیا جائے تو یہ دونوں بیکار ہی نہیں بلکہ مُضر ہو جاتے ہیں اور جو قومیں، ادب اور آرٹ کو دین کا پابند نہیں بناتیں وہ ہلاک ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ اٹلی فرانس، اسپین وغیرہ تباہی کے دروازہ پر کھڑے ہیں۔

تخلیق

اقبال کہتے ہیں کہ آرٹ کا مقصد یہ ہے کہ آرٹسٹ (فنکار) نئے تصورات پیدا کرے۔ اگر کوئی فنکار، محض دوسروں کے خیالات کی تقلید کرتا ہے (جسے شاعری کی اصطلاح میں سرقہ کہتے ہیں) اور وہی فرسودہ خیالات

اپنے لفظوں میں پیش کرتا ہے تو اُسے تخلیق نہیں کہہ سکتے اور اگر کسی قوم کے فنکار، صفتِ تخلیق سے بہرہ ور نہیں تو وہ قوم دُنیا میں کوئی ترقی نہیں کرسکتی۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ :۔

(۱) اگر تم نئی دُنیا پیدا کرنا چاہتے ہو یعنی انسانی معاشرہ کے لیے کوئی نیا نظام بنانا چاہتے ہو جس سے قوم کو فائدہ پہنچے، تو دنیا کے سامنے نئے خیالات پیش کرو اور یاد رکھو کہ نئی دنیا، اینٹ اور پتھر کے مکان بنانے سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ نئے افکار سے پیدا ہوتی ہے۔

(۲) چنانچہ جن لوگوں نے اپنی خودی کی معرفت حاصل کی۔ اُنہوں نے اس چھوٹی سی ندی (خودی) سے وسیع سمندر پیدا کر دئیے یعنی دُنیا میں بڑے بڑے انقلاب پیدا کر دئیے۔

(۳) وہی شخص اس دنیا میں ابدی زندگی حاصل کرسکتا ہے جو اپنی اچھوتی قوتِ فکر سے غیر فانی کارنامے انجام دے۔ مثلاً جن لوگوں نے علوم و فنون میں نئی راہیں نکالی ہیں یا اُن کی مدد سے نئی چیزیں پیدا کی ہیں ان کا نام قیامت تک زندہ رہے ہیں۔

(۴) جب سے مشرقی اقوام خصوصاً مسلمانوں کی خودی مردہ ہوگئی ہے۔ اُنہوں نے کوئی نئی چیز پیدا نہیں کی۔

"ہوا نہ کوئی خدائی کا رازداں پیدا"

اس مصرع میں اقبال نے اپنے نظریہ کا اظہار کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر انسان، علم و فن میں ترقی کرے اور تحقیق و اجتہاد سے کام لے تو وہ مجازی طور پر، گویا خدائی کا رازداں بن جاتا ہے، یعنی جس طرح خدا، نئی نئی چیزیں پیدا کرتا رہتا ہے وہ بھی اپنی محدود طاقت کے مطابق نئی نئی چیزیں پیدا کرتا رہتا ہے۔ اس کو شاعرانہ رنگ میں اقبال نے خدائی کے

رازداں ہونے سے تعبیر کیا ہے۔

اقبال کی رائے میں اسلام ایسا دین ہے جو انسان کے اندر تخلیق "CREATIVE ACTIVITY" کی شان پیدا کرسکتا ہے۔ چنانچہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے قرآن حکیم کی آیات میں تدبر اور تفکر سے کام لے کر اپنے اندر یہ صفت پیدا کرلی تھی اور تاریخ گواہ ہے کہ اُنہوں نے ہر فن میں ایجادات کیں لیکن جب وہ لکیر کے فقیر بن گئے اور جب اُنہوں نے عقل سے کام لینا چھوڑ دیا تو یہ صفت اُن سے زائل ہوگئی۔ چنانچہ اُن کی گذشتہ چھ سو سال کی زندگی اس پر گواہ ہے یعنی انہوں نے گذشتہ چھ سو سال میں، کوئی نئی چیز پیدا نہیں کی۔ اور آج جس قدر ایجادات اور اختراعات ہمارے سامنے موجود ہیں یہ سب کی سب مغربی اقوام کی قوتِ تخلیق کے ثمرات ہیں۔

(۵) لیکن میں اپنی قوم سے نااُمید نہیں ہوں مجھے مسلمانوں میں زندگی کے آثار نظر آرہے ہیں، اُنہیں یہ احساس پیدا ہوگیا ہے کہ ہم زندگی کے ہر شعبہ میں، مغربی اقوام سے پیچھے ہیں۔ پس کوئی تعجب کی بات نہیں اگر مسلمان بھی میری نصیحت پر عمل کر کے اپنے اندر تخلیق کی قوت پیدا کرلیں۔

جنوں

(پہلی)

اس نظم میں اقبال نے قوم کو اپنے اندر جنون کا رنگ پیدا کرنے کی تلقین کی ہے۔ جنون اقبال کی اصطلاح ہے اور اس کا مطلب ہے انسان کے اندر

اپنی خودی کو مرتبۂ کمال پر پہنچانے کا جنون یا شدید جذبہ۔ چنانچہ وہ مثنوی "پس چہ باید کرد" میں جنون کی تعریف ان لفظوں میں کرتے ہیں۔

ہیچ قومے زیرِ چرخِ لاجورد
بے جنونِ ذو فنوں کارے نکرد

اقبال کو اپنی قوم سے ساری شکایت یہی تو ہے کہ وہ بکلی اِس جنون سے بیگانہ ہو گئی ہے اور اسی لیے دُنیا میں ذلیل و خوار ہے۔ یہ جنون کیا ہے؟ صفتِ عشق کا خارجی مظہر ہے۔ عشق کے لیے نصب العین (آئیڈیل) لازمی ہے اور وہ نصب العین، ذاتِ رسالتمآب ہے (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور اُس کے حصول کا ذریعہ اتباع سیرتِ محمدیہ ہے اور اتباع کے لیے صحبتِ مرشد شرط ہے۔ اسی لیے اقبال نے صحبتِ مرشد کو ضروری قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

دیں مجو اندر کتب اے بے خبر
علم و حکمت از کتب دیں از نظر

ہماری تمام کتابیں، ہمارا تمام سرمایہ ادبیات، ہماری شاعری۔

(او ۲) ہمارے مُلّاوں کا نصاب تعلیم اور اُن کا طریق زندگی جس میں تحقیق کو مطلق دخل نہیں۔ یہ سب شیشہ گروں کی دکانیں ہیں۔ لیکن افسوس ہماری قوم میں کوئی دیوانۂ فرزانہ ایسا نہیں جو ان شیشوں کو چکنا چور کر دے اور جنہیں یہ اہلیت ہے وہ کس مپرسی کے عالم میں، گوشۂ گمنامی میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ افسوس قوم اس حقیقت سے آگاہ نہیں کہ اگر وہ اُن لوگوں کی صحبت اختیار کرے تو وہ اپنی روحانیت سے قوم کے اندر انقلاب پیدا کر سکتے ہیں۔

(۳) یہ جنون صرف حجروں ہی میں نہیں مدرسہ میں بھی پیدا ہو سکتا ہے اس کے لیے یہ شرط نہیں کہ مسلمان گھر بار چھوڑ کر صحرا نوردی اختیار کر لیں مسلمان شوق سے دنیاوی علوم حاصل کریں لیکن اپنی زندگی کا کچھ حصہ ان دیوانوں (اللہ والوں) کی صحبت میں بھی بسر کریں تو اُن کے فیضِ صحبت سے اُن کے اندر بھی رنگِ جنوں پیدا ہو سکتا ہے۔

اپنے شعر سے

(دوسری)

اس مختصر نظم میں اقبالؔ نے خود اپنی شاعری سے خطاب کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ میں نے جو شاعری کی تو تحسین و آفرین حاصل کرنے کے لیے نہیں کی بلکہ میری طبیعت کا اقتضا یہی تھا کہ میں شعر کہوں۔ چونکہ شعر گوئی کا یہ جذبہ فطری تھا اس لیے، میرے اسرار یعنی جذبات دوسروں پر عیاں ہو گئے۔

پس میں چاہتا ہوں کہ میرا کلام جو میرے قلب کی گہرائیوں سے نکلا ہے ضائع نہ ہو جائے بلکہ میری آرزو یہ ہے کہ کسی سینہ پُر سوز میں جگہ حاصل کر سکے۔ یعنی میں نے شعر کے پردے میں قوم کو سربلندی کا راز بتایا ہے اس لیے میری آرزو ہے کہ میری قوم میرے کلام کو غور سے پڑھے اور اس پر عمل کرے۔ ؎

"کہ کسی سینہ پُر سوز میں خلوت کی تلاش"

یہ مصرع اقبال کی دلی آرزو کا آئینہ دار ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ قوم اُنہیں محض شاعر نہ سمجھ لے۔ بلکہ اُن کے پیغام کو حرزِ جاں بنائے لیکن افسوس

کہ ابھی تک تو ان کی یہ آرزو پوری ہوئی نہیں۔ چنانچہ خود ان کو بھی مرنے سے پہلے یہ تلخ احساس ہوگیا تھا کہ قوم نے ان کو بھی شاعروں کی صف میں داخل کردیا اور اسی لیے اُنھوں نے قوم کی اس ناقدری کی شکایت سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم سے کی تھی :-

من اے میرِ اُمم داد از تو خواہم
مرا یاراں غزل خوانے شمردند

نوٹ :- حقیقت یہ ہے کہ اقبال کا سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ وہ ایک مردہ قوم میں پیدا ہوئے۔ کہیں مُردے بھی سُنا کرتے ہیں۔

پیرس کی مسجد

(پہلی)

واضح ہو کہ فرانس نے گذشتہ پچاس سال سے مسلمان قوم کو غلام بنانے پر کمر باندھ رکھی ہے۔ چنانچہ جنگِ عظیم (اوّل) سے پہلے، اس دشمنِ اسلام نے مراکو۔ الجیریا اور ٹیونس کو زیرِ نگیں کیا، اور جنگِ عظیم کے بعد شام پر تسلّط قائم کیا اور اِن مُلکوں کے مسلمانوں کو مٹانے کے لیے اپنی ساری طاقت صرف کردی۔ ایک طرف تو یہ ظالمانہ طرزِ عمل روا رکھا دوسری طرف مسلمانانِ عالم کی ہمدردی حاصل کرنے کے پیرس میں ایک مسجد تعمیر کی، چونکہ اس مسجد کی تعمیر ناپاک مقاصد کی تکمیل کے لیے کی گئی اس لیے اقبال نے غیرتِ ملی سے متاثر ہوکر یہ نظم سُپردِ قلم کی :-

(۱) کہتے ہیں کہ میں اہلِ فرانس کے کمالِ فنِ تعمیر کی کیسے داد دے سکتا ہوں۔ مسجد جو اُنھوں نے پیرس میں بنائی ہے اِس کی بنیاد سچائی پر نہیں رکھی گئی۔

(۲) یہ مسجد نہیں ہے بلکہ فرنگی شعبدہ بازوں نے مسجد کی شکل میں تبخانہ تعمیر کیا ہے۔ تاکہ مسلمان اُن کی اسلام دوستی کے دھوکہ میں آجائیں۔

(۳) کیونکہ یہ بت کدہ انھی غارتگروں نے تعمیر کیا ہے۔ جنہوں نے دمشق کو جو مسلمانوں کا مرکز تھا، تباہ کردیا۔ اگر اُنھیں اسلام یا مسلمانوں سے ہمدردی ہوتی تو وہ دمشق کو ویران نہ کرتے۔ پس ان کا یہ فعل کسی طرح لائقِ ستائش نہیں ہے۔ اُنھوں نے یہ مسجد نہیں بنائی، مسلمانوں کے زخموں پر نمک چھڑکا ہے۔

ادبیات

(دوسری)

کہتے ہیں کہ اب ہمیں ادب میں نئی اور زندگی بخش راہیں تلاش کرنی لازم ہیں۔ گل و بلبل کے افسانے اور وصل و ہجر کی داستانیں اور کوچۂ معشوق میں رسوائیاں رقیبوں سے لڑائیاں، یہ سب فضول اور بیکار باتیں ہیں۔ قوم کو اس قسم کی شاعری سے کوئی اخلاقی یا مادّی نفع حاصل نہیں ہوسکتا۔ اب ہمیں چاہیئے کہ ہم شاعری کے کہنہ پیکر یا قدیم اسلوب میں نئی روح یعنی نئے تصورات داخل کریں یا قدیم اُستادوں کی تقلید سے باز آکر، اور اپنی عقل خداداد سے کام لے کر شاعری کو قوم کے حق میں مفید بنائیں۔

نگاہ

اس نظم کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کی رنگا رنگیوں اور فطرت کی نعمتوں سے لذت اندوز ہونے کے لیے مال و دولت کی ضرورت نہیں بلکہ نگاہ کی ضرورت ہے۔ ایسی نگاہ جو فطرت کے حسن و جمال کی قدر کر سکے۔ نگاہ سے مراد ہے۔ مظاہر فطرت کی تحسین کا ملکہ یا سلیقہ۔

کہتے ہیں کہ بہار کا موسم، باغوں میں ہر قسم کے پھول، عالمِ شباب، ذوقِ فنونِ لطیفہ، حسن و جمال جو مظاہر فطرت میں پایا جاتا ہے۔ چاندنی رات، نیلا سمندر، تاروں سے جگمگاتا ہوا آسمان، چاند کا سفر، آفتاب کا طلوع، یہ سب چیزیں بڑی دلکش ہیں بشرطیکہ نگاہ ہو۔ اور فطرت نے یہ دلکشی ہمارے لیے بالکل مفت مہیا کی ہے۔ اس سے لذّت اندوز ہونے کے لیے صرف نگاہ کی ضرورت ہے۔

مسجد قوّت الاسلام

۱۱۹۳ء میں جب مسلمانوں نے دلی فتح کی تو کچھ عرصہ کے بعد اُنھوں نے رائے پتھورا کے قلعہ میں ایک عظیم الشان مسجد کی بنیاد رکھی جس کا ایک مینار آج قطب مینار کے نام سے مشہور ہے۔ اگرچہ یہ مسجد پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکی لیکن اس ناتمام حالت میں بھی، مضبوطی اور عظمت کے لحاظ سے دیکھنے والوں کو متاثر کر سکتی ہے۔ چنانچہ اقبال نے اس نظم میں، اُس کی اسی عظمت اور استواری کا نقشہ کھینچا ہے۔ کہتے ہیں کہ:۔

(۱) احکام الٰہی سے روگردانی کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ میری قوم کا سینہ نور اسلام سے بالکل خالی ہو چکا ہے، افراد محض زبان سے "لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ" کہہ لیتے ہیں لیکن اس کلمہ کا ان کی زندگی پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا۔

(۲) صدیوں کی غلامی سے مسلمانوں کی حالت اس قدر بدل چکی ہے کہ فطرت بھی، اگرچہ اُس کی آنکھ بہت تیز ہے، ان کو نہیں پہچان سکتی۔

اے مسجد! جب میں مسلمانوں کے ضعف اور تیرے استحکام پر غور کرتا ہوں تو شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہوں۔ افسوس! ایک مسلمان وہ تھے، جنہوں نے تجھے بنایا، اور ایک مسلمان ہم ہیں کہ تیری حفاظت بھی نہیں کر سکتے۔

اے مسجد! مجھے تو تیرے اندر نماز پڑھتے ہوئے بھی شرم آتی ہے، میری رائے میں صرف وہ مسلمان تیرے اندر نماز پڑھ سکتا ہے جس کی تکبیروں سے کفر نیست و نابود ہو جائے۔

(۵) افسوس! مسلمانوں کے اندر نہ اب وہ عشق رسول ہے اور نہ وہ غیرتِ ملی ہے، نہ وہ سوز و گداز ہے، اور نہ ان کی نمازوں میں وہ خلوص ہے، اور نہ اُن کے درود میں وہ حرارت ہے جو کسی زمانہ میں اُن کی زندگی کا طغرائے امتیاز تھی۔

بے شک وہ اذانیں بھی دیتے ہیں۔ لیکن اب اُن کی اذانوں میں نہ عظمت ہے نہ ہیبت، نہ بلندی نہ شکوہ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اب مسلمان اِس قابل ہی نہیں کہ اس مسجد میں سجدہ کر لیں۔

تیاتر

اس نظم میں اقبال نے تھیٹر (THEATRE) پر تنقید کی ہے۔ کہ یہ فن، انسانی خودی کی تربیت کے لیے بہت مضرت رساں ہے۔ کیونکہ اس کا کمال یہ ہے کہ انسان نقال بن جائے۔ اور نقالی میں کمال اُس وقت حاصل ہو سکتا ہے جب ایکٹر اپنی خودی سے بیگانہ ہو جائے۔

(۱) اے انسان! اس حقیقت پر غور کر کہ تیرا حریم وجود، صرف تیری خودی سے منور ہو سکتا ہے۔ تیرے وجود کا انحصار تیری خودی پر ہے۔ اگر خودی مردہ ہو جائے تو، تو مُردہ ہو جائے گا۔

اور یہ حیات کیا ہے؟ یہ اُسی خودی کے سُرور، سوز و گداز اور ثبات و قیام کا دوسرا نام ہے۔

(۲) جو چیز تجھ کو اشرف المخلوقات بناتی ہے، اور مہر و پرویں سے اُونچا مرتبہ عطا کرتی ہے وہ خودی ہی تو ہے! اور تیری ذات و صفات تیری خودی ہی کے نور سے پیدا ہوتی ہیں۔

(۳) اندریں حالات، کیا یہ افسوسناک بات نہیں کہ تو اس قدر بیوقوف ہو جائے کہ حریم تیرا اور خودی غیر کی! جب تو نے اپنی شخصیت میں غیر کی خودی داخل کر دی، تو، تو باقی ہی کہاں رہا؟ یہ تو بُت پرستی کی دوسری شکل ہے۔ پس اے انسان! تو ایکٹنگ (تمثیل) کا پیشہ اختیار کر کے، لات و منات کی پرستش کا سلسلہ دوبارہ زندہ مت کر غور کر کہ ایکٹنگ کا کمال یہی تو ہے کہ تو باقی نہ رہے اور وہ شخص بن جائے، جس کا پارٹ تو اسٹیج پر ادا کر رہا ہے۔ پس جو ایکٹنگ کا کمال

ہے وہ تیری شخصیت کے لیے باعثِ زوال ہے۔ جب تو نہ رہا بلکہ اسٹیج پر "سکندر اعظم" یا "شاہجہان" بن گیا تو پھر نہ تیری خودی کا سوز باقی رہا نہ تیری زندگی کا ساز۔[1]

شعاعِ اُمید

اس دلپذیر تمثیلی نظم میں اقبال نے، ہندوستان کے باشندوں کو رجائیت (OPTIMISM) کی تعلیم دی ہے اور نصیحت کی ہے کہ مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ انشاءاللہ ضرور تاریکی دُور ہوگی، ناامید ہو جانا سب سے بڑا گناہ ہے کیونکہ اس کے بعد، ترقی کی کوئی صورت باقی نہیں رہتی۔

(۱)

سورج نے اپنی شعاعوں سے یہ کہا کہ اگرچہ تم عرصۂ دراز سے دُنیا اور دنیا والوں پر فیضان کی بارش کر رہی ہو لیکن وہ تمہاری کوئی قدر نہیں کرتے تم مدتوں سے فضا میں آوارہ ہو لیکن دنیا والے تمہارے ساتھ بے مہری کا سلوک کر رہے ہیں۔

نہ تمہیں ریت کے ذرّوں پر چمکنے میں راحت ہے۔ نہ پھولوں کا طواف

---

[1] : واضح ہو کہ انسانی شخصیت کی تکمیل سوز اور ساز سے ہوتی ہے۔ سوز کی بدولت انسان جدوجہد کرتا ہے یہ اس کی شانِ جلال ہے۔ ساز کی بدولت انسان ماحول سے موافقت پیدا کرتا ہے اور یہ اس کی شانِ جمال ہے لیکن جب ایک شخص "ایکٹر" بن جاتا ہے تو نہ سوز باقی رہتا ہے نہ ساز

کرنے سے کوئی فائدہ ہے۔ اس لیے تم سب کی سب چمنستان و بیابان و باغات پر فیض[1] سماوی نازل کرنا بند کر دو اور میری آغوش میں واپس آجاؤ خلاصہ یہ کہ جب دُنیا تمہاری قدر نہیں کرتی تو تم بھی دُنیا کو فائدہ پہنچانا چھوڑ دو۔ یہ پہلا حِصّہ، سورج کی نااُمیدی کا بیان کرتا ہے، چنانچہ شعاعیں آفتاب کے حکم کی تعمیل کرتی ہیں۔

(۱) اور دُنیا میں مایوسی اور نااُمیدی (DESPONDENCY) کا رنگ پیدا ہوتا جاتا ہے ہر شخص ترقی کے امکانات سے مایوس ہو کر کہتا ہے کہ

(۲) مغرب میں اُجالا ممکن نہیں ہے یعنی مغربی قومیں مادہ پرستی میں اِس درجہ منہمک ہو چکی ہیں کہ اب انکی نجات کی کوئی اُمید نہیں ہے۔ اُنہوں نے اللہ سے مُنہ موڑ کر، مشینوں کو اپنا سہارا بنا لیا ہے اور صرف مادّی ترقی کو مقصدِ حیات سمجھ لیا ہے۔

اب رہیں مشرقی قومیں، تو اگرچہ وہ تاریکی میں نہیں ہیں اور لذتِ نظارہ سے لُطف اندوز ہو رہی ہیں یعنی ان کا ایمان خدا پر ضرور ہے۔ لیکن اِن میں کوئی حرکت یا جدوجہد نظر نہیں آتی۔

خلاصہ یہ کہ مغربی اقوام، ایمان سے اور مشرقی اقوام عمل سے محروم ہیں اندریں حالات شعاعوں نے سورج سے کہا کہ اے آفتاب واقعی اِس دنیا میں ہمارا چمکنا بے سود ہے تو ہم کو ضرور اپنے سینہ میں پوشیدہ کر لے

(۳)

جب شعاعوں نے یہ بات آفتاب کی خدمت میں عرض کی تو ایک

[1] میں نے یہ لفظ مجازی طور پر استعمال کیا ہے۔

شعاع نے، جو چمک میں تو حور کی آنکھ کو شرماتی تھی اور بیتابی میں سیماب سے بھی بڑھی ہوئی تھی، آفتاب سے عرض کی کہ میں اہلِ عالم

(۲) کی بہبود سے نااُمید نہیں ہوں۔ اس لیے جب تک، مشرقی ممالک مغربی اقوام کی گرفت سے آزاد نہ ہو جائیں میں برابر اپنی روشنی سے نااُمیدی کے اندھیرے کو دُور کرتی رہوں گی۔

(۳) اور جب تک ہندوستانی بیدار نہیں ہو جائیں گے میں ہندوستان کی تاریک فضا کو ترک نہیں کروں گی، بلکہ نہایت استقلال کے ساتھ اس تاریک فضا میں لوگوں کو اُمید کا پیغام دیتی رہوں گی، کیونکہ ہندوستان،

(۴) تمام ایشیائی اقوام کی اُمیدوں کا مرکز ہے اور اقبال نے اسی سرزمین کو اپنے اشکوں سے سیراب کیا ہے اور اسی ملک کے باشندوں کو انسانیت کے مقام پر پہنچنے کا پیغام دیا ہے۔

(۵) اسی ملک کی خاک سے، چاند اور پروین کی آنکھیں روشن ہیں اور اسی ملک کی خاک کا ہر سنگریزہ، موتی سے بھی بڑھ کر قیمتی ہے۔

(۶) اس سرزمین نے بڑے بڑے فلاسفہ اور حکماء پیدا کیے ہیں۔[1]

(۷) افسوس ایک زمانہ تھا کہ ہندوستان کی محفل میں مذہب کا ساز بڑی دلکشی کے ساتھ بجتا رہتا تھا اور ہندو اور مسلمان دونوں اپنے اپنے مذہب کے پرستار تھے اور دلوں میں خوفِ خدا رکھتے تھے۔

[1] اشارہ ہے گوتم، مہاویر، کپل، جیمنی، ویاس، بدریان، بھرتری ہری شنکر آچاریہ، ولبھ آچاریہ اور دوسرے حکماء کی طرف جو ہندوستان کی سرزمین میں پیدا ہوئے۔

(۸) لیکن اب یہ کیفیت ہے کہ برہمن تو بُت خانہ کے دروازہ پر سو رہا ہے اور مسلمان مسجد کے اندر اپنی تقدیر کو رو رہا ہے۔ ایک غافل ہے دوسرا عمل سے بیگانہ ہے اور نتیجہ اُن دونوں صورتوں کا ایک ہی ہے۔ یعنی اغیار کی غلامی۔

پس میں تو نہ مشرقی اقوام سے نا اُمید ہوں نہ مغربی اقوام سے، بلکہ دونوں کو راہ راست دکھاؤں گی۔

اس نظم کا مطلب یہ ہے کہ اقبال مسلمان کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ اُٹھو! مایوسی کے جال سے نکلو! اور مشرق اور مغرب دونوں کو اسلام کا زندگی بخش پیغام پہنچاؤ۔ کیونکہ اسلام ہی وہ سچا دین ہے جو مشرق اور مغرب کے تمام امراض کا مداوا کر سکتا ہے۔

نوٹ:۔ جن لوگوں نے اقبال کے کلام کا بانگِ درا سے لے کر ارمغان حجاز تک مطالعہ کیا ہے۔ اُن پر یہ حقیقت واضح ہو سکتی ہے کہ اقبال کو ہندوستان سے بہت محبت تھی اور وہ ہندو اور مسلمان دونوں ہی کا بھلا چاہتے تھے۔ اور اسی جذبہ سے متاثر ہو کر اُنھوں نے ۱۹۳۰ء میں اپنے الہ آباد کے خطبۂ صدارت میں تقسیم ہند یا پاکستان کی تجویز پیش کی تھی تاکہ دونوں قومیں صلح و آشتی کے ساتھ ترقی کر سکیں لیکن افسوس کہ کانگریس اور مہاسبھا دونوں ہندو جماعتوں نے ان کی مخالفت کی اور آج بھی یہ جماعتیں اپنے معاندانہ طرزِ عمل سے، ہندوستان اور پاکستان دونوں کو نقصان پہنچا رہی ہیں۔ گویا اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی مار رہی ہیں۔

اُمیّد

اس نظم میں اقبال نے مسلمانوں کو دوسرے انداز سے رجائیت کا پیغام دیا ہے۔ اقبال کا فلسفہ یہ ہے کہ یہ دُنیا محض عناصر کا کھیل نہیں ہے۔ اس کی تخلیق بلا مقصد نہیں ہوئی ہے، اگرچہ بعض پہلوؤں سے ہمیں اس میں نقائص نظر آتے ہیں۔ لیکن بحیثیتِ مجموعی یہ دُنیا بہتری کی طرف حرکت کر رہی ہے۔

اقبال نہ تو یہ کہتے ہیں کہ یہ دُنیا مُصیبت کا گھر ہے اور اِس میں سراسر بدی ہی بدی ہے اس لیے اصلاح کی کوشش بے سود ہے۔ اس نظریہ کو فلسفہ کی اصطلاح میں قنوطیت (PASSVISM) کہتے ہیں۔

اور نہ یہ کہتے ہیں کہ یہ دُنیا سراسر خیر و برکت ہے کہیں کوئی نقص یا برائی نہیں ہے اس لیے اصلاح کی کوئی ضرورت نہیں اس کو رجائیت یعنی (OPTIMISM) کہتے ہیں۔

بلکہ اِن کی پوزیشن اِن دونوں مذہبوں کے بین بین ہے یعنی وہ یہ کہتے ہیں چونکہ اللہ نے یہ دُنیا ایک مقصد کے لیے بنائی ہے اس لیے بتدریج اصلاح پذیر ہے۔ اور انجام کار نیکی، بدی پر غالب آجائے گی۔ یہ بھی رجائیت ہی کی ایک قسم ہے اور اسے فلسفہ کی اصطلاح میں (MELIORISM) کہتے ہیں۔ جس کے لیے ابھی تک اُردو میں کوئی خاص اصطلاح وضع نہیں کی گئی ہے۔

(۱) کہتے ہیں کہ اگرچہ میں نہ سپاہی ہوں نہ فوج کا سردار ہوں لیکن اللہ کے فضل و کرم اور اُن وعدوں پر جو اُس نے قرآن مجید میں

مومنوں سے کئے ہیں، یقین رکھتا ہوں اس لیے باوجود بے سروسامانی زمانہ کی پیدا کردہ مشکلات کا خوب مقابلہ کرتا ہوں۔

(۲) لوگ کہتے ہیں میں شاعر ہوں۔ ممکن ہے یہ بات صحیح ہو۔ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ فطرت نے مجھے ذکر و فکر، اور جذب و سرور عطا کیا ہے اور میں انہیں چاروں عطیاتِ فطرت کو کلام موزوں کے ذریعہ سے دُنیا کے سامنے پیش کرتا رہتا ہوں۔

(۳) بندۂ حق یعنی مردِ مومن کی پیشانی سے جو جلال ٹپکتا ہے، وہ صرف اس کی پیشانی میں محدود نہیں ہے، بلکہ ضمیر وجود اِسی جلال سے لبریز ہے۔ یعنی کائنات کے ہر ذرّہ میں وہ جلال پوشیدہ ہے۔ (کیونکہ وجود) اسی صفتِ جلال پر موقوف ہے، پس اے مسلمان! تو اللہ کی صفتِ تخلیق کا مشاہدہ ہر ذرّہ میں کر سکتا ہے۔

دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ چونکہ جلال، وجود کی اصل ہے (ضمیر وجود کے معنی ہیں وجود کی اصل حقیقت) اس لیے اگر تو، اپنے وجود کو دُنیا پر واضح کر دے، دُنیا والوں کو اپنے وجود کا یقین دلا دے تو تیرے اندر بھی شان جلال پیدا ہو سکتی ہے۔ یعنی تو بھی بندۂ مومن بننے کی کوشش کر۔

(۴) میں اسے کافری تو نہیں کہہ سکتا لیکن میری نظر میں یہ بات کفر سے کم بھی نہیں کہ مسلمان جسے مردِ حق ہونا چاہیئے اللہ سے غافل ہو کر حاضر و موجود کا غلام ہو جائے یعنی دُنیا کی دلچسپیوں اور نعمتوں کی طرف متوجہ ہو کر اپنی حیات کے مقصد سے غافل ہو جائے۔ اس کو ایک مثال سے واضح کر دوں، فرض کیجئے آپ نے اپنے ملازم کو، باغ کی

حفاظت کے لیے مقرر کیا لیکن جب وہ نگرانی کر رہا تھا اُسے ایک عورت دکھائی دی اور وہ مستقبل کے انعامات اور آقا کی یعنی آپ کی خوشنودی کی گراں بہا دولت سے غافل ہو کر بلکہ اپنے مقصدِ حیات (نگرانی) سے غافل ہو کر، اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ اور باغ کو "اللہ" پر چھوڑ کر اس کے حصول میں منہمک ہو گیا (اور جب وہ باغ سے چلا گیا تو لوگوں نے پھل چرائے اور جانوروں نے پودوں کو پامال کر دیا) تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ شخص "گرفتارِ حاضر و موجود" ہو گیا۔

(۵) اے مسلمان! اگر تیرے ہاتھ سے حکومتِ ہند نکل گئی تو رنجیدہ مت ہو، کیونکہ دولت اور حکومت، کسی قوم کی موروثی ملکیت نہیں ہے۔ انشاء اللہ نیا دَور آنے والا ہے۔ ایسا دَور جس میں تجھے پھر یہ دولتِ گم گشتہ مِل جائے گی۔ پس تو ہمت نہ ہار۔ ترقی کے لیے کوشش کیے جا۔ ۱۲

نگاہِ شوق

اس دلکش نظم میں اقبال نے نگاہِ شوق یا جذبۂ عشق کے ثمرات بیان کیے ہیں۔ اس نظم کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان، عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سرشار ہو کر اپنی خودی کو مرتبۂ کمال پر پہنچائے تو پہلے اس کے اندر ایک انقلاب رونما ہو جاتا ہے پھر وہ دنیا میں انقلاب پیدا کر دیتا ہے اقبال نے اس حقیقت کو بار بار واضح طور پر بیان کیا ہے کہ جب تک

مسلمان اپنے ضمیر کی گہرائیوں میں انقلاب پیدا نہیں کریں گے وہ دُنیا میں کوئی انقلاب برپا نہیں کر سکتے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ

(۱) اس کائنات کی تخلیق اِس نہج پر ہوئی ہے۔ کہ اس کی باطنی خوبیاں ہر وقت ظاہر ہوتی رہتی ہیں۔ ہر شئے اپنے مقام کو حاصل کرنا چاہتی ہے اور اقبال نے اس مقام کے حصول کی کوشش کو ذوقِ آشکارائی" سے تعبیر کیا ہے۔

(۲) پس اگر نگاہِ شوق بھی شریک بینائی ہو جائے یعنی اگر مسلمان عشقِ رسولِ صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت اپنی باطنی حِس کو جسے اصطلاح میں بصیرت کہتے ہیں، بیدار کرے تو اُسے یہ دُنیا صرف عناصر کا کھیل نظر نہیں آئے گی بلکہ وہ اس حقیقت سے آگاہ ہو جائے گا کہ یہ کائنات اس لیے پیدا کی گئی ہے کہ مومن اس کو اپنے تصرف میں لاکر اس میں اللہ کے قانون کو نافذ کرے اور اس طرح اس دُنیا کو بنی آدم کے لیے رحمت بنا دے۔

(۳) جب یہ نگاہ پیدا ہو جاتی ہے تو محکوم قوم کے افراد، حکمرانی کے اہل بن جاتے ہیں اور دُنیا اُن کے قدم چومنے لگتی ہے۔

(۴) اسی نگاہِ شوق کی بدولت مسلمان میں قاہری یعنی رنگ جلال اور دلبری یعنی رنگِ جمال پیدا ہو جاتا ہے۔ قاہری کی بدولت وہ دُنیا میں حکومت حاصل کرتا ہے اور دلبری کی بدولت اس کا وجود، اہلِ دُنیا کے حق میں رحمت بن جاتا ہے۔

(۵) اسی نگاہ کی بدولت مسلمان میں دشت پیمائی یعنی جدوجہد کا مادّہ پیدا ہو جاتا ہے اور اس لیے وہ ہر وقت باطل سے برسرِ پیکار

رہتا ہے۔

(۶) اے مخاطب! اگر تیرے اندر نگاہِ شوق پیدا نہ ہو یعنی اگر تیرے اندر، اسلام کو بلند کرنے کا جذبہ پیدا نہ ہو، تو تیرا وجود بالکل بیکار ہے۔ بلکہ تیرا وجود، اسلام کی رسوائی کا موجب بن جائے گا۔

نوٹ:۔ موجودہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی اس شعر کی صداقت پر گواہ ہے بلاشبہ، آج ہمارا وجود اسلام کے دامن پر ایک بدنما دھبّا بنا ہوا ہے۔

اہلِ ہُنر سے

اس نظم میں اقبال نے اہلِ ہنر کو خودی کے مرتبہ اور مقام سے آگاہ کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ

(۱) آفتاب، ماہتاب، اجرامِ فلکی اور دوسری چیزیں مثلاً زمین آسمان یہ سب عارضی اور فانی ہیں، لیکن خودی، اگر عشق کی بدولت پختہ ہو جائے تو لازوال ہو جاتی ہے۔ پس تو فانی کو چھوڑ کر باقی کے حصول کی کوشش کر۔

(۲) چونکہ دینِ حق یعنی اسلام کی روح انسانوں میں نسلی امتیاز روا نہیں رکھتی بلکہ مساواتِ نسلِ انسان کا سبق دیتی ہے، اس لیے اگر کوئی صاحبِ فن (آرٹسٹ) اپنے فن سے نسلی امتیازات کے تصور کو تقویت دیتا ہے تو وہ سچا آرٹسٹ نہیں ہے۔

(۳) تو اپنی خودی کی عظمت کا اس بات سے انداز کر سکتا ہے۔ کہ

جب تو کائنات میں غور کرتا ہے تو ذکر و فکر کی دولت سے مالا مال ہو جاتا ہے۔ یعنی کائنات میں جو قوانین نافذ ہیں تو ان کا مطالعہ کرتا ہے اور نئی چیزیں دریافت کرتا ہے۔ یہ فکر ہے پھر تو صانعِ کائنات کی ہستی سے آگاہ ہو کر اس کی اطاعت کرتا ہے۔ یہ ذکر ہے اور یہ دونوں باتیں ذکر و فکر۔ بذاتِ خود نہایت قیمتی بلکہ خودی کی ترقی کے لیے اشد ضروری ہیں۔

اور جب تیری خودی کو اللہ تعالیٰ کی حضوری نصیب ہوتی ہے تو اس پر فیضانِ سماوی کا نزول ہوتا ہے اور وہ فیضان عموماً شاعری یا نغمہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

اقبال نے خودی کی دو حالتیں بیان کی ہیں۔ پہلی حالت وہ ہے جب خودی کائنات کی طرف متوجہ ہوتی ہے اس کو "خودی کا غیاب" کہا ہے۔ اور دوسری حالت وہ ہے جب خودی اللہ کی طرف متوجہ ہوتی ہے یہ حالت "خودی کا حضور" ہے اور یہ دونوں صورتیں انسان کے لیے مفید ہیں جیسا کہ اوپر مذکور ہوا۔

(۴) لیکن اگر تو غلامی کی لعنت میں گرفتار ہے (اور مشرقی ممالک کے تمام اہل ہنر کسی نہ کسی قسم کی غلامی میں مبتلا ہیں) تو یقیناً تیرا آرٹ غلامی کا علمبردار ہوگا، اور بُت پرستی کی تعلیم دے گا بُت پرستی سے مراد وہی دوسروں کی غلامی ہے۔

اور اگر تیری روح، اپنی ذاتی شرافت سے آگاہ ہے با لفاظِ دگر اگر تیری خودی بیدار ہے تو پھر ساری کائنات تیری غلامی کرے گی اور تو جن اور انسان دونوں پر حکمراں ہو گا۔

غزل

اس غزل میں اقبال نے بعض حقائق و معارف بیان کئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ :-

(۱) اے مردِ مسلماں! اگر موتیوں کی آرزو ہے تو ساحل کی زندگی سے قطع تعلق کر کے تجھے مشکلات کا مقابلہ کرنا ہو گا۔ اور اگر تو عافیت کی زندگی بسر کرنے کا آرزومند ہے تو پھر موتیوں کا خیال چھوڑ دے ساحل کے باشندوں کو تو (یعنی بلا مشقت) صرف خس و خاشاک حاصل ہو سکتا ہے۔

(۲) میرے کلام میں، یہ تاثیر ہے کہ تیری زندگی میں انقلاب پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن افسوس کہ تیری خودی مُردہ ہو چکی ہے اس لیے جس طرح گیلے پتے جل نہیں سکتے، اسی طرح تیرے اندر میرے کلام سے کوئی حرکت یا زندگی پیدا نہیں ہو سکتی۔

(۳) تیرا زمانہ، یا تیری زندگی، بس ویسی ہی ہو گی جیسی تاثیر تو اس میں پیدا کر دے۔ اگر تو جدوجہد کرے گا، یقیناً کامیاب ہو گا، لیکن اگر تو عمل سے کنارہ کش ہو کر، کسی حجرہ میں بیٹھ جائے گا تو یقیناً تھوڑے دنوں کے بعد دوسروں کا دستِ نگر بن جائے گا۔ الغرض، تیری زندگی پر افلاک یا ستارے حکمراں نہیں ہیں بلکہ تو خود اپنی کامیابی یا ناکامی کا ذمہ دار ہے۔

(۴) عام طور سے تو یہ دیکھا جاتا ہے کہ جنوں (عورت کا عشق) انسان کو گریبان چاک کرنے پر راغب کرتا ہے لیکن اقبال کہتے ہیں کہ

ایک جنوں (عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم) ایسا بھی ہے جو گریبان درکنار، تقدیر کے چاک کو بھی سی سکتا ہے۔ یعنی بگڑی ہوئی تقدیر کو بنا سکتا ہے۔

نوٹ:- اس شعر کا لطف چونکہ تشریح سے ظاہر نہیں ہو سکتا اس لیے میں نے قصداً اس کی وضاحت سے اجتناب کیا ہے۔

(۵) عام طور سے لوگ شراب پیکر مست ہوتے ہیں لیکن یہ رندی کا کمال نہیں ہے، اقبال کی نظر میں کمال یہ ہے کہ آدمی بلے پیئے مست ہو جائے بلکہ مست رہے۔ اور یہ کمال، مرشد کی صحبت سے حاصل ہو سکتا ہے۔ شراب کا نشہ تھوڑی دیر بعد اُتر جاتا ہے لیکن محبت الٰہی کا نشہ انگوری شراب کا محتاج نہیں ہے اور جب ایک دفعہ آدمی اس شراب سے مست ہو جاتا ہے تو پھر جیتے جی یہ نشہ نہیں اُترتا۔

مشرق کے میخانوں میں اب تک وہ شراب موجود ہے جس سے عقل روشن ہو سکتی ہے یعنی اسلام کی تعلیمات اگر کسی مرشد کامل سے حاصل کی جائیں تو انسان حقیقی معنوں میں عالم بن سکتا ہے۔

مغربی علوم سے عقل انسانی تاریک ہو جاتی ہے یعنی انسان اللہ اور اس کے رسولؐ سے بیگانہ ہو جاتا ہے لیکن قرآن مجید انسانی عقل کو نور ایمان سے منوّر کر سکتا ہے ۱۲

(۶) اہل نظر یعنی اللہ والے، یورپ کے مستقبل سے ناامید ہو چکے ہیں۔ یعنی ان کی رائے میں اس خطہ کی بربادی یقینی ہے۔ کیونکہ یہ خطہ اب ان اقوام سے معمور ہے جن کے قلوب، اللہ کی محبت سے بالکل خالی ہو گئے ہیں بلکہ یہ قومیں مادّہ پرستی میں مبتلا ہو کر اللہ سے اپنا

تعلق یکسر منقطع کر چکی ہیں۔

نوٹ:- اقبال نے یہ شعر ۱۹۳۵ء میں لکھا تھا۔ اس کی جزوی صداقت تو دوسری جنگِ عظیم میں واضح ہو چکی ہے اب مکمل تباہی تیسری جنگ میں ہو جائے گی جو عنقریب شروع ہونے والی ہے۔ بقول شخصیکہ

ع پیمانہ بھر چکا ہے چھلکنے کی دیر ہے

وجود

اِس نظم میں اقبال نے ہمیں وجود انسانی کے مقام سے آگاہ کیا ہے یعنی یہ کہ اگر انسان اپنی خودی کو پختہ کرے تو اس کا وجود، غیر فانی ہو سکتا ہے۔ یہاں انہوں نے ”وجود“ کو ”خودی“ کے معنوں میں استعمال کیا ہے کہتے ہیں کہ

(۱) اے مخاطب! تیری دنیاوی زندگی عارضی اور فانی ہے اس لیے شاید تجھے یہ خیال ہو کہ میرا وجود عارضی اور فانی ہے لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے۔ وجود کے مختلف مقامات ہیں۔ چیونٹی، مکڑی مچھر بلکہ اونٹ ہاتھی اور انسان، وجود کے اعتبار سے سب یکساں ہیں یعنی وجود سب میں مشترک ہے چیونٹی بھی موجود ہے انسان بھی موجود ہے لیکن چیونٹی یا ہاتھی کا وجود اپنے اندر شان عبدیت نہیں رکھتا۔ یہ شرف صرف انسانی وجود کو حاصل ہے کہ اگر انسان اپنی خودی کو مستحکم کرے تو اس کا وجود غیر فانی یا ابدی ہو جائے گا۔

(۲) پس اگر تیرے ہنر میں خواہ وہ شاعری ہو یا مصوّری یا موسیقی تعبیر

خودی کا جوہر موجود نہیں تو یہ سارے فنونِ لطیفہ بالکل بیکار ہیں۔
اس کے معنی یہ ہیں کہ خودی، معیارِ حسن و قبح ہے اور آرٹ کو خودی کا خادم ہونا چاہیئے، مثلاً وہ شاعری مذموم ہے جو مسلمان کے اندر جہاد فی سبیل اللہ کا جذبہ پیدا نہ کر دے [1]

(۳) اے مسلمان! یاد رکھ کہ مکتب و کالج اور میکدہ (خانقاہ) آج کل دونوں مقامات میں نفیِ خودی کا درس دیا جاتا ہے اس لیے اگر تو ابدی زندگی کا طالب ہے تو کسی مرشدِ کامل کی صحبت میں بیٹھ کر ہمیشہ زندہ رہنے کا طریقہ سیکھ، تاکہ تو دنیا میں بھی زندہ رہ سکے۔ اور مرنے کے بعد بھی زندہ رہ سکے۔

سرود

اس نظم میں اقبال نے یہ بتایا ہے کہ صرف وہ نغمہ حلال ہے جو دل کو بیدار کر دے جو دل میں محبت الٰہی کا جذبہ پیدا کر دے۔

(۱) غور کرو کہ بانسری کی آواز میں یہ شراب کا سا سرور کہاں سے آیا! حقیقت یہ ہے کہ اس کی اصل (یعنی مستی و سرور کی بنیاد) چوب نے

---

[1] اگر اقبال کا پیش کردہ معیار صحیح ہے تو پھر ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ لاہور اور کراچی میں جس قدر مشاعرے منعقد ہوتے ہیں اور ماشاء اللہ ہر روز ہوتے ہیں یہ سب قوم کے حق میں "افیون" ہیں۔ وائے برحال، کہ دلی اور لکھنؤ کا حسرت ناک انجام دیکھنے کے بعد بھی ہماری آنکھیں نہیں کھلیں۔

یا بانسری نہیں ہے بلکہ نے نواز کا دل ہے۔

(۲) اب اس بات پر غور کرو کہ دل کیا چیز ہے؟ کیا وہ مضغۂ گوشت کا نام ہے؟ اس میں یہ مستی اور سرور کہاں سے آیا، جو نے نواز، نے میں منتقل کر دیتا ہے؟ آخر یہ بانسری کی آواز اس قدر دلکش کیوں ہوتی ہے کہ انسان تو خیر انسان ہے، حیوان بھی اس سے متاثر ہو جاتے ہیں؟ آخر ایک معمولی سا صاحبدل! تختِ کیخسرو کو کس طرح تہ و بالا کر دیتا ہے؟ اور بڑے بڑے بادشاہ اس کو دیکھ کر کیوں لرزہ براندام ہو جاتے ہیں؟

(۳) پھر یہ غور کرو کہ قوموں کی زندگی، دل کی زندگی پر کیوں منحصر ہے؟ اور اسے ایک پہلو پر قرار کیوں نہیں ہے؟ صاحبِ دل پر مختلف حالات کیوں طاری ہوتے رہتے ہیں؟ وہ ہر وقت ہنگامہ کیوں پسند کرتا ہے؟

(۴) پھر اس پر بھی غور کرو کہ "دل" صاحبدل کو کیا چیز عطا کر دیتا ہے کہ اس کی نظر میں بادشاہ اور بادشاہت کسی چیز کی کوئی وقعت نہیں رہتی وہ بادشاہوں کو خاطر میں نہیں لاتا لیکن اس میں یہ سطوت کہاں سے آجاتی ہے؟

(۵) پس معلوم ہوا کہ "دل" اس کائنات میں سب سے بڑی قوت محرکہ (MOTIVE POWER) ہے اور لامحدود توانائی کا خزانہ ہے۔ اگر دل زندہ ہو جائے تو قومیں ہی زندہ نہیں ہو جاتیں اُن کے افراد بھی معجزات دکھانے لگتے ہیں اور بعض اوقات ایک فرد پوری جماعت پر بھاری نظر آتا ہے۔

پس اشد ضروری ہے کہ مُغنّی، نغمہ سرائی سے پہلے نغمہ کی اصل یا اسکے

سرچشمہ سے آگاہی حاصل کرے یعنی دل کے اسرار و رموز سے واقف ہوجائے۔ اور اگر وہ اس حقیقت سے خبردار ہوجائے کہ دل سرچشمۂ حیات ہے تو پھر اس کی موسیقی، قوموں کے لیے خود پیامِ حیات ہوجائیگی اور اگر ایسا نہ ہوا تو یہی موسیقی، بنی آدم کے حق میں پیامِ موت[1] بن جائے گی اور تاریخ گواہ ہے کہ بن جاتی ہے۔

نسیم و شبنم

اقبال نے اس نظم میں نسیم اور شبنم کے پردہ میں عالم ناسوت اور عالم ملکوت یا انسان اور فرشتہ کے باہمی رشتہ کو واضح کیا ہے۔ انگریزی زبان میں اس اسلوب کو (ALLEGORY) کہتے ہیں جس کا ترجمہ اس شعر سے کرسکتے ہیں۔ ؎

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں
گفتہ آید در حدیثِ دیگراں!

اس نظم میں بظاہر بادِ نسیم اور شبنم کا مکالمہ درج ہے لیکن نسیم اور شبنم سے شاعر کی مراد کچھ اور ہے یعنی حدیثِ دیگراں کے پردہ میں سرِّ دلبراں بیان کیا ہے۔

(۱) نسیم نے شبنم سے کہا کہ میں ساری عمر غنچوں کو شگفتہ کرتی رہی یعنی فضائے ارضی میں زندگی بسر کی، اور فضائے انجم تک میری رسائی نہ ہوسکی۔

(۲) لیکن مجھے بلبلوں کی نغمہ سرائی میں کچھ لطف نہیں آتا اس لیے میں ترکِ وطن

---

[1] پاکستان کا مسلمان تو چکی کے دو پاٹوں میں پس رہا ہے نیچے شاعری کا پاٹ ہے اوپر موسیقی کا۔ ۱۲

کرنا چاہتی ہوں۔

(۳) اے شبنم تجھے تقدیر الٰہی نے دونوں (عالموں) سے آگاہی بخشی ہے تو مجھے بتا کہ "خاکِ چمن" اچھی یا فضائے آسمان اچھی؟

(۴) نسیم نے یہ سوال سُن کر شبنم کو جواب دیا کہ اے شبنم! اگر تو اپنی نظر کو بلند اور مقاصد کو ارفع کرے تو گلشن بھی افلاک کا ہم رتبہ ہے۔ اس میں بھی وہی عظمت پوشیدہ ہے جو سراپردۂ افلاک میں نظر آتی ہے ضرورت اُس تیز نظر کے پیدا کرنے کی ہے جو گلشن کی عظمت مخفی کو دیکھ سکے۔

اس تمثیل کا مطلب یہ ہے کہ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دُنیا بڑی ہے یہاں رہ کر خدا نہیں مل سکتا اس لیے ترک وطن یعنی ترکِ دُنیا کرنا ضروری ہے فرشتہ جواب دیتا ہے کہ اگر انسان دنیا کی فانی دلچسپیوں میں (جسے خس و خاشاک گلشن سے تعبیر کیا گیا ہے) منہمک ہوکر مقصدِ حیات سے غافل نہ ہوجائے تو ترکِ دُنیا کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔ دُنیا میں رہ کر بھی انسان اللہ سے تعلق پیدا کرسکتا ہے "گلشن" بھی افلاک ہی کا "سر" یا بھید ہے یعنی انسان عالمِ ناسوت میں رہ کر بھی، عالمِ ملکوت کے رہنے والوں میں شامل ہوسکتا ہے۔ چنانچہ حضراتِ انبیاء اور اولیاء کی زندگیاں اقبال کے اس دعویٰ پر شاہد عادل ہیں۔

اہرامِ مصر

(پہلی)

اس نظم میں اقبالؔ نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ آرٹسٹ، اپنے آرٹ کو مرتبۂ کمال پر اس وقت پہنچا سکتا ہے جب وہ اپنے آپ کو فطرت کی تقلید سے آزاد کرلے۔ دوسرے لفظوں میں آرٹ کے اندر صفتِ دوام اس وقت پیدا ہو سکتی ہے جب اس کے اندر جدت (ORIGINALITY) ہو۔

(۱) مصر کے ریگستانوں پر نظر کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ان کی خاموش فضا میں، فطرت نے صرف ریت کے ٹیلے بنائے ہیں جو آج بنتے ہیں کل بگڑ جاتے ہیں۔

(۲) لیکن انسان نے جو اہرام (PYRAMID) تعمیر کئے ہیں وہ نہایت عظیم الشان اور مستحکم ہیں، ہزاروں سال سے بدستور قائم ہیں۔

(۳) پس ہنرمند کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے ہنر کو فطرت کی غلامی سے آزاد کرے یعنی اپنی ذاتی کوشش سے اپنے معلومات کو پائیداری عطا کرے۔ یاد رکھو آرٹسٹ، نخچیر (صید) نہیں ہوتا بلکہ خود صیّاد ہوتا ہے اور وہ اپنے آرٹ میں اپنے اجتہادِ فکر سے، رنگِ دوام پیدا کرتا ہے۔

مخلوقاتِ ہنر

(دوسری)

اس نظم میں اقبالؔ نے ہندوستان کے اُن اربابِ ہنر پر تنقید کی ہے جو

اپنے اندر کوئی تخلیقی قوت نہیں رکھتے اور اس لیے شاعری مصوری اور موسیقی اور دیگر فنونِ لطیفہ میں کوئی جدت پیدا نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا تمام سرمایۂ فن، توارد و نقالی اور سرقہ کی مختلف صورتوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ اس نظم میں طنز کا رنگ بہت نمایاں ہے۔ کہتے ہیں کہ

(۱) ہمارے مُلک کے اربابِ ہنر، اپنے ہنر کے جو نمونے پیش کرتے ہیں وہ اپنے اندر کوئی جدت نہیں رکھتے اور ان پر نظر ڈالنے سے، ان ہنرمندوں کی ذہنیت بالکل عیاں ہو جاتی ہے۔

(۲) ان کے "کمالاتِ ہنر" میں نہ اُن کی ذاتی یا شخصی خصوصیت یعنی انفرادیت نظر آتی ہے نہ زندگی سے مطابقت پائی جاتی ہے ان کے آرٹ سے دیکھنے والوں کے اندر، جدوجہد یا مشکلاتِ زندگی پر غالب آنے کا کوئی جذبہ پیدا نہیں ہوتا۔

(۳) افسوس! ہمارے آرٹسٹ، ابھی تک پرانے زمانہ کے لات و منات کی پرستش کر رہے ہیں۔ مثلاً شاعری میں وہی معشوق کی کج ادائی وہی فراق کی راتیں، اور وہی رقیب کے طعنے وغیرہ وغیرہ یہی حال دوسرے فنون کا ہے، الغرض ہمارے فنکار، ہر معاملہ میں کورانہ تقلید کر رہے ہیں اپنی ذاتی کوشش سے نئی راہیں پیدا نہیں کرتے۔

(۴) اے ہندی فنکار! دراصل تیری خودی مُردہ ہو چکی ہے (غلامی اور تقلید کورانہ کی بنا پر) اسی لیے تیرا ہنر، تیری موت کا اعلان کر رہا ہے اور تجھ کو گمنامی کی طرف لے جا رہا ہے یعنی جب تو طبیعاتی (طبعی) زاویۂ نگاہ سے مرجائے گا تو تیرا نام چند روز کے بعد مٹ جائے گا کیونکہ دنیا میں انہی شاعروں اور مصوروں کا نام باقی رہتا ہے جو اچھوتا کارنامہ

پیش کرتے ہیں ۔

اقبال

اس مختصر نظم میں، اقبال نے بڑے بلیغ انداز سے اپنے کلام پر تبصرہ بھی کیا ہے اور اپنا مقام بھی واضح کیا ہے ۔

اسلوب بیان ایسا دلکش ہے کہ لفظوں سے اس کا بیان نہیں ہو سکتا۔ بس یوں سمجھو کہ یہ نظم اقبال کی جدت طرازی کا بہترین نمونہ ہے ۔ جدت سے میری مراد ہے، بات کہنے کا سلیقہ! اور سچ پوچھو تو یہی چیز شاعری کی جان ہے سچ کہا تھا، غالب نے کہ شاعری مضمون آفرینی کا نام ہے ، قافیہ پیمائی کا نام نہیں ہے،، اس نظم میں لفظ "فردوس،، کس قدر موزوں ہے ! شاعر نے اس لفظ سے ہمیں یہ بتا دیا کہ میں رومیؒ سنائیؒ اور حلاجؒ تینوں بزرگوں کو کیا سمجھتا ہوں۔

علاوہ بریں یہ لفظ ہم کو فوراً عالم رنگ و بو سے بلند کر کے فردوس میں پہنچا دیتا ہے جہاں نہ غلامی ہے اور نہ ضمیر فروشی نہ پالیسی (POLICY) ہے، نہ ڈپلومیسی (DIPLOMACY)

(ب) رومیؒ سنائیؒ اور حلاجؒ کا ذکر کر کے، اقبال نے ضمناً اپنا روحانی سلسلہ بھی بیان کر دیا۔ اُنہوں نے اپنا شمار اسپنوزا اور ہیگل، ارسطو اور کانٹ یا نطشہ اور برگساں کے زمرہ میں نہیں کیا بلکہ سنائیؒ اور رومیؒ کی شاگردی پر فخر کیا ہے۔

کلام اقبال کا مطالعہ کرنے والوں سے یہ حقیقت مخفی نہیں ہے کہ اقبال کو

ان تینوں بزرگوں سے بڑی عقیدت تھی جس کا اظہار اُن کی تصانیف سے جا بجا ہوتا ہے اور رومی کو تو اُنہوں نے اپنا مرشد اور رہنما قرار دیا ہے اور جس طرح مولانا رومؒ نے سنائیؒ اور عطارؒ کی اتباع پر فخر کیا ہے ۔

عطار روح بود و سنائی دو چشم او
ما از پئے سنائیؒ و عطار آمدیم!

اسی طرح اقبال نے اسرار خودی (۱۹۱۴ء) سے لے کر ارمغان حجاز (۱۹۳۸ء) تک ہر کتاب میں رومی کی شاگردی پر فخر کیا ہے بلکہ ہمیں بھی یہی مشورہ دیا ہے چنانچہ جاوید نامہ میں لکھتے ہیں :-

پیر رومی را رفیق راہ ساز — تا خدا بخشد ترا سوز و گداز
زانکہ رومی مغز را داند ز پوست — پائے او محکم فتد در کوئے دوست

بال جبریل کی اس نظم (سما سکتا نہیں پہنائے فطرت میں مرا سودا) پر جو مختصر تمہید اقبال نے لکھی ہے اس سے اُن کی اُس گہری عقیدت کا اندازہ ہو سکتا ہے جو اُن کو حکیم سنائیؒ کے ساتھ تھی۔

(ج) اس نظم سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ اقبال کے فلسفہ یا بنیادی خیالات یا تصورات کو مغربی حکماء سے ماخوذ سمجھتے ہیں وہ اقبال کو بالکل نہیں سمجھتے اُنہوں نے دراصل قرآن مجید، احادیث رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)، اور اُن کے بعد رومی اور دوسرے مسلمان صوفیاء مثلاً امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ کے خیالات سے استفادہ کیا ہے اور محض استفادہ ہی نہیں کیا بلکہ اس پر فخر کیا ہے۔ چنانچہ ارمغان حجاز میں جو ان کی زندگی کے بالکل آخری زمانہ کا کلام ہے وہ خود اپنے آپ کو مثیل رومیؒ قرار دیتے ہیں۔ اور ہر دانشمند انسان اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ ایک شخص اپنے آپ کو اگر کسی کا مثل

قرار دے تو وہ اس شخص کی انتہائی عزت کرتا ہے بلکہ اس کی تقلید کو اپنے لیے باعثِ فخر و مباہات سمجھتا ہے۔

چو رومی در حرم دادم اذاں من — از و آموختم اسرارِ جانِ من
بہ دورِ فتنۂ عصرِ کہن او — بہ دورِ فتنۂ عصرِ رواں من

(د) چوتھی غور طلب بات یہ ہے کہ اس نظم میں اقبال نے اپنا کارنامہ بھی بیان کر دیا ہے کہ میں نے مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا ہے۔ کیونکہ اسلام ہی وہ دینِ حق ہے جس نے سب سے پہلے دنیا کو خودی کی مخفی طاقتوں سے آگاہ کیا اور چونکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خودی، کمال کے انتہائی نقطہ پر پہنچ گئی تھی۔ اسی لیے آپ ہمارے لیے اُسوۂ حسنہ ہیں۔ اب پڑھیے اس شعر کو

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفےٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

فردوس میں ایک دن مولانا رومؒ، حکیم سنائیؒ سے یہ کہہ رہے تھے۔ کہ افسوس! مشرقی ممالک ہنوز غلامی میں گرفتار ہیں۔
یہ سن کر حسین ابن منصور حلاجؒ نے یہ کہا کہ یہ تو سچ ہے کہ صدیوں سے کوئی "حلاجِ کار ازداں" پیدا نہیں ہوا ہے لیکن اللہ کا شکر ہے کہ آخر کار ایک قلندر (اقبال) نے خودی کا راز فاش کر دیا ہے۔ انشاء اللہ اب مسلمان آزاد ہو جائیں گے[۱]۔

---

[۱] واضح ہو کہ میں نے اقبال کے کلام کی تشریح اپنی فہم کے مطابق ہی کی ہے۔ اور میرا نظریہ یہ ہے کہ اگر ایک قوم کسی طرح سیاسی غلامی سے آزاد ہو جائے، تو میں اُسے اس وقت تک آزاد نہیں سمجھوں گا جب تک وہ قوم سب سے پہلے (باقی ص ۲۹۷)

اب رہے مغربی پاکستان کے مسلمان! تو یہاں بھی وہی "ریڈ کراس" ہے، وہی اتوار کی تعطیل ہے، وہی انگریزی لباس ہے وہی "ریس کورس" ہے، وہی انگریزیت ہے، وہی کافرانہ نظامِ تعلیم ہے، وہی عریانی ہے۔ وہی مینا بازار ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہی جمہوری نظام ہے۔ جس میں بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے!

فنونِ لطیفہ

اس نظم میں اقبال نے ہمیں آرٹ کی غرض و غایت سے آگاہ کیا ہے کہ آرٹ کے اندر اگر باطل کو فنا کرنے کی قوت نہیں تو وہ آرٹ نہیں بلکہ محض تضییعِ اوقات کا موجب ہے۔ واضح ہو کہ اقبال نے آرٹ کو خودی کا خادم قرار دیا ہے۔ آج کل کے عریانی پسند کوتاہ نظر ادیب، آرٹ کو مقصود بالذات سمجھتے ہیں اور اس غلط خیال کا نتیجہ "خودی" کی تباہی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ اقبال کی تعلیم یہ ہے کہ ہماری آخری وفاداری کا مرکز آرٹ۔

(بقیہ ص ۲۹۶) ذہنی غلامی سے آزادی حاصل نہ کرے۔
مثلاً یوں کہنے کو تو مشرقی پاکستان کے مسلمان "آزاد" ہو گئے ہیں۔ لیکن میری رائے میں وہ آزاد نہیں ہیں بلکہ ذہنی طور پر بدستور ہندوؤں کے غلام ہیں۔ وہی ہندوؤں کا سنسکرات رسم الخط ہے، وہی غیر اسلامی زبان ہے وہی غیر اسلامی افکار ہیں۔ مختصر یہ کہ بنگالی مسلمانوں کا تمدن بالکل ہندوانہ ہے جو، اُن کی مادری بنگلہ زبان کا لازمی نتیجہ ہے۔

نہیں بلکہ قرآن اور سنت نبویؐ کی روشنی میں خودی کی تکمیل ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ

(ا) ہماری آخری وفاداری کا مرکز اللہ ہے۔

(ب) اللہ ہم سے یہ چاہتا ہے کہ ہم اپنے اندر اس کی نیابت کی اہلیت اور صلاحیت پیدا کریں، یعنی دنیا میں اس کی حکومت قائم کریں۔ یہ "خلیفۃ اللہ" کا حقیقی مفہوم یہی ہے۔ طاقت کے بغیر خلافت، ایک لفظ بے معنیٰ ہے، اسی لیے ۱۹۲۴ء میں ترکوں نے خلیفہ کو پنشن دے کر رخصت کر دیا۔

(ج) نیابت یا خلافت کی صلاحیت پیدا نہیں ہو سکتی جب تک ہم قرآن اور سنت نبویؐ کی روشنی میں، اپنی خودی کو مرتبہ کمال تک نہ پہنچا دیں

پس آرٹ، خودی کے تابع ہے۔ آزاد نہیں ہے اور وہی آرٹ لائق تحسین ہے جو استحکام خودی میں معاون ثابت ہو سکے۔

ع جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

(۱) اے اہل نظر یعنی اے ارباب ہنر!
آرٹ کی تحسین کی صلاحیت پیدا کرنا بہت اچھی بات ہے۔ لیکن اگر تم آرٹ کی حقیقت کو نہیں دیکھ سکتے تو پھر تم اہل نظر نہیں ہو۔

(۲) آرٹ کا مقصد، جذبات نفسانی کو برانگیختہ کرنا نہیں ہے (جیسا کہ کارل مارکس اور فرائڈ کے مقلدین سمجھتے ہیں) بلکہ خودی کے اندر پختگی کا رنگ پیدا کرنا۔

(۳) اگر انسانی خودی باطل کی دنیا میں تلاطم پیدا نہیں کر سکتی تو پھر اس میں اور گائے یا بیل کی خودی میں کیا فرق ہے؟

(۴) ایسی شاعری اور موسیقی سے کیا فائدہ جس کی بدولت انسان کے اندر جدوجہد کا جذبہ پیدا نہ ہو (اگر اقبال کا یہ معیار صحیح ہے تو پاکستانی مشاعرے اور قوالی دونوں قوم کے حق میں افیون سے کم نہیں ہیں)

(۵) یاد رکھو! جب تک کسی قوم میں فوق العادۃ کارنامے انجام دینے کی صلاحیت پیدا نہ ہو جائے، وہ قوم دنیا میں سربلند اور حکمران نہیں ہو سکتی۔

پس جس آرٹ سے باطل کا مقابلہ کرنے یا دشمن پر غالب آنے کی طاقت پیدا نہیں ہوتی وہ آرٹ نہیں ہے بلکہ اخلاق کو تباہ کرنے کا ذریعہ ہے

صبح چمن

اس دلکش نظم میں اقبال نے گل، شبنم اور صبح کے پردہ میں انسان کو چند نکتے سمجھائے ہیں۔

پھول نے شبنم سے کہا کہ تو یہ سمجھتی تھی کہ میرا وطن (زمین) بہت دور ہے۔ اس لیے شاید میں وہاں تک نہ پہنچ سکوں۔

شبنم نے جواب دیا کہ تیرا یہ قول صحیح ہے کہ وطن دور نہیں ہے لیکن اس کی صداقت اس وقت تک آشکار نہیں ہو سکتی جب تک انسان محنت اور مشقت (جدوجہد) سے کام نہ لے۔ اگر ایک شخص جدوجہد سے جی چرائے تو اس کے لیے بلاشبہ گردوں سے زمین بہت دور ہے۔

یہ سن کر صبح نے کہا کہ گلستاں کی سیر کرنے کے لیے آؤ تو نسیم (صبح کی ہوا) کی طرح آؤ (یعنی دنیا میں اس طرح زندگی بسر کرو کہ کسی کو تمہاری ذات

سے تکلیف نہ پہنچے۔

نیز اس کی یہ صفت بھی اپنے اندر پیدا کرو کہ دنیا میں سب سے ملو جلو لیکن اللہ تعالیٰ سے تعلق میں کمی پیدا نہ ہو۔

خلاصۂ کلام اینکہ اگر انسان ہمت سے کام لے تو اس کا وطن (آسمان) اس سے دُور نہیں ہے۔ انسان کو دنیا کی ہر پاک چیز سے فائدہ اُٹھانے کی اجازت ہے لیکن خدا سے تعلق کا دامن اس کے ہاتھوں سے نہیں چھوٹنا چاہیے۔ ۱۲۰

خاقانی

اس نظم میں اقبال نے ایران کے مشہور شاعر افضل الدین خاقانی کے ایک شعر پر تضمین کی ہے، جو ان کو بہت پسند آیا حقیقت یہ ہے کہ خاقانی بھی بیدل غالب۔ عرفی اور نظیری کی طرح اقبال کا محبوب فارسی شاعر ہے کلیاتِ خاقانی میں انہیں قصاید سے بہت زیادہ مثنوی تحفۃ العراقین پسند تھی چنانچہ اس کے دو شعروں پر تضمین اس کتاب (ضربِ کلیم) کے آغاز میں گذر چکی ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ خاقانی نے اس شعر میں، اس قانون مکافات کو واضح کیا ہے جو دنیا میں جاری ہے۔

(۱-۲) خاقانی، جو تحفۃ العراقین کا مصنف ہے، اربابِ نظر میں بہت مقبول ہے وہ بڑا زیرک شاعر ہے اور اسرارِ کائنات سے واقف ہے۔

(۳-۴) معانی کی دُنیا بہت خاموش ہے اور خود اپنی زبان سے کوئی متکبرانہ دعویٰ نہیں کرتی۔

دوسرے معنیٰ اس شعر کے یہ ہو سکتے ہیں کہ معانی کی دنیا بہت خاموش ہے۔

لیکن اس کا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ کوئی شخص مجھے سمجھ نہیں سکتا اے مخاطب! تو خاقانی سے پوچھ کہ اس دُنیا کی حقیقت کیا ہے۔

(۵) وہ قانون مکافاتِ عمل سے بخوبی واقف ہے اس لیے اس نے اس شعر میں بڑے پتہ کی بات کہہ دی ہے۔

ہمیں بھی اس حیرت انگیز دنیا سے قدرے آگاہی حاصل کرنی چاہیے جس میں قانون مکافات عمل رائج ہے۔ چنانچہ اسی قانون کا ثمرہ ہے کہ آج کل دنیا میں ابلیسیت تو باقی ہے لیکن آدمیت مُردہ ہو چکی ہے یعنی آدم علیہ السلام کی اولاد نے جب انبیا (اپنے اجداد) کی اتباع چھوڑ دی اور ابلیس (اپنے دشمن) کی اطاعت اختیار کرلی تو آدمؑ کی اولاد ہونا، بنی آدم کے کچھ کام نہ آیا۔ ان میں سے آدمیت و شرافت، بالکل نکل گئی اور اس کے بجائے ابلیسیت آگئی، یعنی جیسے عمل کیے ویسی ہی سیرت بن گئی۔

اس شعر کے ایک معنی اور بھی ہو سکتے ہیں وہ یہ کہ واقعی یہ دنیا عجیب و غریب ہے بلکہ اس کی دلفریبیاں اس قدر زبردست ہیں کہ بیان سے باہر ہیں ضرور اس میں کوئی راز ہے کہ ابلیس تو باقی ہے لیکن حضرت ابوالبشر کا انتقال ہو گیا یعنی آدم کی اولاد، ابلیس کی اولاد سے ہار گئی اور زنؔ، زرؔ، زمینؔ کی پرستار بن گئی۔ پس لاؤ ہم بھی ذرا اس کا مزہ چکھیں! ذرا ہم بھی بطور خود اس کی دلفریبی سے آگاہی حاصل کریں۔

(لفظی ترجمہ:۔ بو بردن بمعنی اطلاع بہم رسانیدن)، یعنی ایسی دنیا ضرور اس قابل ہے کہ اس سے آگاہی حاصل کی جائے جہاں آدمیت تو عنقا ہے اور ہر جگہ شیطنت کا چرچا ہے آؤ آزما کر تو دیکھیں کہ دنیا کی لذت میں کیا بات ہے کہ ایک دنیا اس کی لذت میں گرفتار ہے۔

رومی

(پہلی)

اس نظم میں ہم کو اقبال نے رومیؒ کے مرتبہ اور مقام سے آگاہ کیا ہے۔ اگرچہ وہ لوگ جنہوں نے کلام اقبال کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے۔ رومی کے مقام سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے اس نظم کے محتاج نہیں ہو سکتے لیکن اقبال نے یہ خراج رومی کی بارگاہ میں اپنی بے پناہ عقیدت کی بنا پر پیش کیا ہے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں، کلام اللہ شریف اور حدیث رسول اللہ کے بعد مثنوی سے اقبال نے سب سے زیادہ استفادہ کیا ہے۔ اور ان کی عقیدت کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ انہوں نے وہی مسلک اختیار کر لیا جو مولانا رومؒ کا تھا یعنی عقل پر عشق کی برتری فرماتے ہیں۔

(۱) اے مخاطب! یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے کہ تو کائنات میں کسی شے کی حقیقت سے واقف نہیں ہے۔ بلکہ تو خود اپنے وجود سے آگاہ نہیں ہے تو ابھی تک یہ نہیں سمجھ سکا کہ خود "میں" کیا ہوں؟

(۲) تیرے اندر نیاز، احتیاج اور محکومی کی شان تو موجود ہے لیکن تیرے اندر ناز، استغنا، اور حکومت کی شان پیدا نہیں ہوئی تو خود بادشاہوں کے دروازوں پر جاتا ہے لیکن کوئی بادشاہ تیرے دروازے پر نہیں آتا۔ تیری نماز، قیام سے خالی ہے یعنی تو اللہ کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا نہیں ہوتا بلکہ ارباب حکومت کی چوکھٹ پر مسلسل سجدے کرتا رہتا ہے۔ بالفاظ دگر تو نماز تو پڑھتا ہے لیکن اس میں سجدہ ہی سجدہ ہے قیام کہیں نظر نہیں آتا۔ حالانکہ نماز میں سجدے کے علاوہ قیام بھی ہوتا

ہے۔

(۳) مختصر یہ کہ تیری خودی کے ساز کے سب تار ٹوٹے ہوئے ہیں یعنی تیری خودی بیکار ہو چکی ہے۔ دنیا میں اس کی کوئی قیمت نہیں۔ کیا تو جانتا ہے کہ ان سب امراض کا باعث کیا ہے؟ ان کا باعث یہ ہے کہ تو نے ابھی تک مثنوی مولانا رومؒ کا مطالعہ کر کے اس کی تعلیم پر عمل نہیں کیا اور مثنوی کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور سرکارِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو اور چونکہ اطاعت کے لیے محبت لازمی ہے اس لیے حضور کی ذات سے عشق پیدا کرو۔ الغرض عشق رسول تمام بیماریوں کا علاج ہے۔ چنانچہ مولانا خود فرماتے ہیں:

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما ... دے طبیبِ جملہ علتہائے ما
اے دوائے نخوت و ناموسِ ما ... اے تو افلاطون و جالینوس ما

جدّت

(دوسری)

اس نظم میں اقبال نے ہمیں جدّت یعنی ندرتِ فکر (ORIGINALITY) کی قدر و قیمت اور اس کے ثمرات سے آگاہ کیا ہے یعنی یہ بتایا ہے کہ اگر ہم دوسروں کے خیالات کی تقلید کے بجائے خود اپنی قوت، کی نشوونما کریں اور اس خداداد نعمت کو مرتبۂ کمال پر پہنچائیں تو کیا نتیجہ ہوگا۔

(۱) اے مخاطب! اگر تو اپنی خودی میں ڈوب کر، اپنی ذہنی قوتوں کو صیقل کر کے، بطور خود، اس کائنات میں غور و فکر کرے تو ایک عالم تیرے

افکار کی روشنی سے منور ہو جائے گا۔

(۲) بڑے بڑے آدمی تیرے خیالات سے استفادہ کریں گے بلکہ تو تسخیرِ عناصر کرکے، کائنات پر حکمراں ہو جائے گا۔

(۳) تیرے پاکیزہ اور بلند خیالات کی بدولت دنیا میں انقلاب رونما ہو سکتا ہے اور تیرے تخلیقی کارنامے، فطرت کے کارناموں سے بڑھ سکتے ہیں۔ (ریڈیو، لاسلکی، ٹیلی ویژن، ٹیلیفون یہ اور سینکڑوں ایجادات سب اجتہاد اور تحقیق یا جدّتِ فکر ہی کے ثمرات ہیں)

مجھے حیرت ہے کہ تو کیوں غیروں کے افکار کی تقلید کر رہا ہے؟ کیا تو اس قدر عاجز اور درماندہ ہے کہ اپنی خودی تک بھی تیری رسائی نہیں ہے؟ یعنی کیا تجھے یہ معلوم نہیں کہ تو اپنی خودی کو مرتبۂ کمال تک پہنچا سکتا ہے۔ اگر تو ہمّت کرے تو یہ کام چنداں مشکل نہیں ہے۔

مرزا بیدل

اس نظم میں، اقبال نے، عظیم آباد[۱] (پٹنہ) کے جلیل القدر فارسی شاعر مرزا عبدالقادر بیدل کے مشہور شعر پر تضمین کی ہے۔ یہ وہی بیدل ہیں جن کے تتبع کی کوشش غالب نے بھی کی تھی، چنانچہ اس کی دشواری کو انھوں نے اس شعر میں بیان کیا ہے۔

طرزِ بیدل ریختہ لکھنا اسد اللہ خاں! قیامت ہے

[۱] عظیم آباد جسے اب عرفِ عام میں پٹنہ کہتے ہیں صوبہ بہار کا دارالحکومت ہے۔ داغ دہلوی نے اس نام کو اپنے ایک مقطع میں استعمال کرکے دوبارہ (باقی بر صفحہ ۳۰۵)

واضح ہو کہ میرزا بیدل کا تتبع اس لیے دشوار ہے کہ ایک تو وہ آسان اور معمولی مضمون کو پیچیدہ اور مغلق طریق پر بیان کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ فلسفہ اور حکمت کے اکثر مشکل مسائل کو اپنی غزل کا موضوع بناتے ہیں۔

مثلاً غالب کا یہ شعر بیدل کے اندازِ بیان کے "تتبع" ہی کی وجہ سے دشوار ہو گیا ورنہ بات صرف اتنی سی ہے کہ عاشق کی وفات کے بعد معشوق نے سرمہ لگانا چھوڑ دیا کیونکہ پھر زمرۂ عشاق میں، کوئی اس قابل نظر نہ آیا کہ اُس پر بیداد کی جائے۔

درخورِ عرض نہیں، جوہرِ بیداد کو جا
نگہِ ناز ہے سرمہ سے خفا میرے بعد

اقبالؔ چونکہ غالب کا حشر دیکھ چکے تھے اس لیے اُنہوں نے بیدل سے استفادہ تو کیا لیکن اس کے رنگ میں لکھنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔

بیدلؔ نے اپنے اس شعر میں اس مسئلہ پر اظہارِ رائے کیا ہے کہ یہ کائنات حقیقی ہے یا غیر حقیقی؟ یہ وہی مسئلہ ہے جو قدیم زمانہ سے حکمار کے درمیان معرکۃ الآراء رہا ہے۔ چونکہ اقبال کو بھی اس مسئلہ سے دلچسپی تھی اس لیے اُنہوں نے اس شعر پر تضمین کر دی کہتے ہیں کہ

(۱) سوال یہ ہے کہ یہ کائنات، زمین، صحرا، پہاڑ، آسمان حقیقی ہے یا محض فریبِ نظر ہے؟

(۲) کوئی کہتا ہے کہ یہ دنیا واقعی موجود ہے، کوئی کہتا ہے کہ نہیں، اس کی کوئی

(بقیہ صفحہ گزشتہ) زندہ کر دیا۔

کوئی چھینٹا پڑے تو داغ کلکتہ چلے جائیں
عظیم آباد میں ہم منتظر ساون کے بیٹھے ہیں

حقیقت نہیں ہے، محض موہوم ہے۔

(۴) لیکن میرزا بیدل نے اس مسئلہ کو بڑی خوبی کے ساتھ سمجھایا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ "مومن کا قلب اگر اس قدر وسیع ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کی تمام تجلیات کو اپنے اندر لے سکتا تو کائنات کا وجود ہی نہ ہوتا، لیکن چونکہ مینا (بوتل) تنگ تھی اس لیے، رنگِ مئے (تجلیاتِ انوار الٰہیہ) بوتل (قلب مومن) سے باہر جلوہ گر ہوگیا، یعنی کائنات موجود ہوگئی۔

بالفاظ دگر کائنات کا وجود، حقیقی نہیں ہے بلکہ ظلّی ہے یا کائنات کی حقیقت وجود نہیں بلکہ عدم ہے اور جو کچھ نظر آتا ہے یہ پرتو ہے، اللہ تعالیٰ کی تجلیات کا، خلاصہ کلام یہ ہے کہ یہ دنیا، ذات کے اعتبار سے معدوم ہے تجلیات کے اعتبار سے موجود ہے۔

نوٹ:- میں نے جو مطلب لکھا ہے اس کے سمجھنے کے لیے ان تین باتوں کو مدِنظر رکھنا اشد ضروری ہے۔

(۱) یہ کائنات، بیدل کی رائے میں، تجلیات انوار الٰہیہ کا مظہر ہے۔ اس کے علاوہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

(۲) مومن کا قلب تجلیات کا مہبط ہے۔ اگر اس میں وسعت ہوتی تو ساری تجلیات کو اپنے اندر جذب کر لیتا، لیکن اس میں اس قدر وسعت نہیں ہے اس لیے کائنات بھی عالم وجود میں آگئی۔

(۳) کائنات کا وجود، حقیقی نہیں ہے بلکہ پرتو ہے کسی کے آئینۂ رُخ کا۔ اب خود بیدل کا ایک شعر پیش کرتا ہوں تاکہ ناظرین کو اس کا مسلک خود اس کی زبان سے معلوم ہو جائے۔

راستی برفتنہ انگیز است سروِ قامتت ✤ ہستیٔ ما جز دروغ مصلحت آمیز نیست

جلال و جمال

اس نظم میں اقبال نے اس نکتہ کو واضح کیا ہے کہ اگرچہ انسان کے لیے جلال اور جمال دونوں ضروری ہیں لیکن جلال نہ ہو تو جمال بے تاثیر ہے اس جگہ اس امر کی صراحت ضروری ہے کہ اقبال کے اس قول کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جمال نہ ہو تو محض جلال، خودی کی تکمیل کے لیے کافی ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں اپنی اپنی جگہ بہت ضروری ہیں، اور خودی کی تکمیل ان دونوں پر موقوف ہے اگر ان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی زندگی سے خارج کر دیا جائے، تو خودی ناقص رہ جائے گی۔ چنانچہ اقبال نے مثنوی "پس چہ باید کرد" میں اس کی صراحت کر دی ہے :-

رائے بے قوّت ہمہ مکر و فسوں ✤ قوّت بے رائے، جہل است و جنوں

یعنی جمال ہو اور اس کے ساتھ جلال نہ ہو تو وہ جمال محض مکر و فسوں ہے یعنی بے تاثیر ہے۔ مثلاً آپ کا خیال کیسا ہی اچھا کیوں نہ ہو لیکن اگر آپ کے پاس طاقت نہیں ہے تو اُس پر کون عمل کرے گا! اور طاقت ہو لیکن اس کے ساتھ صحیح خیال نہ ہو تو پھر وہ طاقتور انسان چنگیز بن جاتا ہے یعنی وہ قوت چونکہ اندھی ہوتی ہے اس لیے بنی آدم کے حق میں مصیبت بن جاتی ہے۔ قصہ مختصر، اس نظم میں اقبال نے صرف ایک پہلو کو واضح کیا ہے۔ اور وہ جیسا کہ اوپر مذکور ہوا یہ ہے کہ جلال نہ ہو تو جمال بے تاثیر ہے۔ نیز میں اس شرح میں کسی جگہ اس بات کی وضاحت کر چکا ہوں کہ جلال اور جمال کا منبع لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ ہے، لَآ اِلٰہ سے جلال اور اِلَّا اللہ سے جمال پیدا ہوتا ہے، اب نظم کا مطلب لکھتا ہوں۔ کہتے ہیں کہ :-

(۱) اسے مخاطب! اگر تو فلسفہ اور حکمت کو بہت وقیع یا اپنی زندگی کے لیے کافی سمجھتا ہے تو تیری مرضی تجھے یہ خیال مبارک ہو، لیکن میں تو افلاطون کے فلسفہ پر زورِ حیدری کو ترجیح دیتا ہوں کیونکہ مسلمان کا مقصدِ حیات باطل کا مقابلہ کرنا ہے اور یہ مقصد فلسفہ سے نہیں بلکہ روحانی طاقت سے حاصل ہو سکتا ہے۔ بالفاظِ دگر میں تو عقل کے مقابلہ میں عشق کو ترجیح دیتا ہوں (واضح ہو کہ جنابِ حیدر کرار رضؓ میں یہ طاقتِ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی بدولت پیدا ہوئی تھی۔)

(۲) میں تو اسی کو حقیقی جمال و زیبائی سمجھتا ہوں کہ مسلمان میں باطل کا مقابلہ کرنے کے لیے بازو میں طاقت اور دل میں حوصلہ ہو۔ دیکھ لو! آسمانوں کو اللہ نے اپنی قدرت (قوت) ہی سے تابع فرمان بنا رکھا ہے۔

اس مصرع کے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ قوت کے سامنے کائنات کی بڑی سے بڑی چیز مطیع بن جاتی ہے۔

(۳) اگر انسان میں جلال (قوت) نہ ہو تو اس کی تقریر کیسی ہی دلکش کیوں نہ ہو مخالف کے اندر کوئی تاثیر پیدا نہیں کر سکتی۔ اگر موسیقی میں سوز و گداز نہ ہو تو سامعین پر کوئی تاثیر مرتب نہیں ہو سکتی۔

(۴) میرا ذاتی نظریہ تو یہ ہے کہ میں اپنی سزا کے لیے اُس آگ کو بھی پسند نہیں کروں گا جس کے شعلوں میں حدت اور تندی نہ ہو کیونکہ جلنے میں مجھے کوئی لطف نہیں آئے گا بالفاظ دگر سزا کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔

مصوّر

اس نظم میں اقبال نے مصوّری کی حقیقت واضح کی ہے کہ حقیقی مصوّری وہ ہے جس میں مصوّر کی شخصیت یا انفرادیت کا رنگ نمایاں ہو سکے۔ یعنی تصویر دیکھ کر ہم مصوّر کی ذہنی کیفیات کا اندازہ کر سکیں۔ کہتے ہیں کہ

(۱) ہندوستان کے مصوروں میں تخیل (IMAGINTION) کا فقدان ہے

(۲) وہ سب، مغرب کے فنکاروں کی تقلید کرتے ہیں، اپنی جدّتِ فکر کا اظہار نہیں کرتے ان کی ذہنیت پست ہے اس لیے وہ تصویر میں کوئی ندرت پیدا نہیں کر سکتے۔ بلکہ زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ ہمارے مصوّروں میں مشرقی طرزِ مصوری کا رنگ بھی نظر نہیں آتا۔

(۳) اسے مصوّر! مجھے تیرے کمالات بخوبی معلوم ہیں! تو مانیؔ و بہزادؔ کے طرز سے بھی واقف ہے۔ اور جوشوا رینلڈ (JOSHVA REYMOLD) بلکہ مائیکل اینجلو (MICHAEL ANGELO) کے اسلوب سے بھی آگاہ ہے یعنی تو مشرقی اور مغربی دونوں قسم کے مصوروں کی نقالی کر سکتا ہے۔

(۴) نیز، تو نے اپنی تصاویر میں فطرت کو دکھایا بھی ہے اور دیکھا بھی ہے لیکن یہ کافی نہیں ہے تو اپنی تصاویر میں اپنی خودی کو بھی تو ظاہر کر۔ یعنی ایسی تصاویر پیش کر جن سے تیری انفرادیت کا اظہار ہو سکے کیونکہ آرٹ، نقالی کا نام نہیں ہے بلکہ اُچھوتے تخیلات کو مختلف رنگوں کے ذریعہ سے واضح کرتے کا نام ہے۔

سرودِ حلال

یہ کسی قدر مشکل نظم ہے۔ اس میں اقبال نے یہ بتایا ہے کہ وہ سرود یا نغمہ کونسا ہے جس کو مذہبِ خودی میں جائز قرار دیا جاسکتا ہے یعنی وہ موسیقی کونسی ہے۔ جو مردِ مومن کے لیے جائز ہے۔ کہتے ہیں کہ

(۱) عام گویّوں کے گانے اور تان پلٹے سن کر، تھوڑی دیر کے لیے دل ضرور شگفتہ ہو جاتا ہے لیکن یہ شگفتگی اور لذّت، دائمی اور زندگی بخش نہیں ہوتی لہٰذا یہ عارضی سرور، محض بیکار ہے۔

(۲) افسوس! وہ موسیقی ابھی تک کہیں سننے میں نہیں آئی جو دل میں حقیقی سوز و گداز پیدا کر دے۔

(۳) جس کی تاثیر سے انسان کے قلب میں ایسی طمانیت پیدا ہو جائے کہ وہ خوف اور غم (حُزن)، ان دو بلاؤں سے محفوظ ہو جائے۔ واضح ہو کہ قلب انسانی کے سب سے بڑے دشمن دو ہیں خوف اور حُزن اس کی تفصیل یہ ہے کہ انسان، جب تک اس کا تعلق اللہ سے استوار و مستحکم نہ ہو جائے یا تو آئندہ آفات سے ڈرتا رہتا ہے یا گذشتہ غلطیوں پر افسوس کرتا رہتا ہے، اور جب تک قلب انسانی پر خوف اور حُزن مُسلّط رہتے ہیں وہ کوئی روحانی ترقی نہیں کر سکتا۔ قرآن مجید میں مومنوں کی شان یہ بیان کی گئی ہے کہ :۔

وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔	نہ اُنہیں خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اقبال کہتے ہیں کہ مسلمان کے لیے وہ موسیقی جائز ہے جو اس کے قلب کو خوف

اور غم سے پاک کر کے، دائمی سرور اور ابدی اطمینان عطا کر دے اور وہ موسیقی، قرآن مجید کی تلاوت سے حاصل ہو سکتی ہے۔

یہ وہ موسیقی ہے جس کی بدولت، ایاز (غلام) کو محمود (سلطان) کا مقام حاصل ہو جاتا ہے۔

اس مصرع میں "مقام محمود" کی ترکیب بہت خوب ہے بلکہ میری تحسین سے بالاتر ہے۔ کیونکہ "مقام محمود" کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک معنی تو وہی ہیں جو میں نے بیان کئے ہیں دوسرے اور ارفع معنیٰ یہ ہیں کہ اس میں اشارہ ہے اس آیتِ مبارکہ کی طرف :۔

عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا	اے ہمارے محبوبؐ آپؐ رات کو پچھلے پہر اُٹھ کر نماز تہجد پڑھا کیجیے یقین ہے۔

کہ اس کے معاوضہ میں آپ کا پروردگار آپؐ کو مقام محمود عطا فرما دے گا۔

اس شعر سے ناظرین، اقبال کی شاعری کی نوعیت سے بھی آگاہ ہو سکتے ہیں کہ اس کا سرچشمہ قرآن حکیم ہے، دگر ہیچ۔

(۴) اے مسلمان! پس لازم ہے کہ تو وہ سرود (نغمہ) سُن جس کی تاثیر سے تو علائقِ دنیوی سے پاک ہو جائے اور تیری زبان پر ہر وقت "لا موجود اِلَّا اللّٰہ" کا کلمہ جاری رہے یعنی یہ دنیا اور اس کی دلچسپیاں سب فانی ہیں حقیقی وجود صرف ایک ہے اور میں اُسی وجود حقیقی یعنی اللہ کے سہارے سے موجود ہوں۔ میرا وجود، حقیقی یا اصلی نہیں ہے، اگر میں موجود ہوں تو محض اس لیے کہ وہ موجود ہے وہ نہ ہوتا تو کچھ بھی نہ ہوتا۔

نوٹ:۔ لا موجود اِلَّا اللّٰہ کی یہ وہ تعبیر ہے جو اقبال نے حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی سے سیکھی ہے۔ ۱۲

(۵) جس سرود کو مذہبِ خودی کے فقہا جائز سمجھتے ہیں یعنی ذکرِ الٰہی کا سرور افسوس کہ وہ سرود ابھی تک کسی مطرب یعنی زبردست اور عظیم الشّان روحانی بزرگ کے ظہور کا منتظر ہے۔ خلاصۂ کلام یہ کہ اس زمانہ میں نفسانی خواہشات کو برانگیختہ کرنے والا سرود تو مل سکتا ہے۔ لیکن روحانیت پیدا کرنے والا سرود ناپید ہے۔

سرودِ حرام

(پہلی)

اس نظم میں اقبال نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ کونسی موسیقی حرام ہے۔ کہتے ہیں کہ:-

(۱) نہ تو میرے ذکر میں صوفیوں کا سا سوز و سرور ہے اور نہ میری فکر میں یہ اہلیت ہے کہ وہ ثواب و عذاب کا اندازہ کر سکے یعنی نہ میں کوئی صوفی صافی ہوں نہ مفتی شرع۔

(۲) اس لیے میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ جو کچھ میں کہنے والا ہوں، فقہا بھی اُس سے متفق ہوجائیں (تاکہ میرا قول مستند قرار پاسکے)

(۳) وہ موسیقی بالکل حرام ہے جس کو سن کر مسلمان کی قوتِ عملی مُردہ ہوجائے۔ اور وہ کشمکشِ حیات سے کنارہ کش ہوجائے۔۱۲

فوّارہ

(دوسری)

اس مختصر نظم میں اقبال نے ایک پیش پا افتادہ مضمون سے اپنے نظریہ کی تائید کی ہے۔ بظاہر نہر اور فوارّہ کا موازنہ ہے لیکن ان دو شعروں میں اقبال نے بات پتہ کی کہی ہے۔ کہتے ہیں کہ نہر کو دیکھو چونکہ اس میں زورِ دروں نہیں ہے بلکہ یہ دریا کی محتاج ہے اس لیے بہتو رہی ہے لیکن خاک سے ہمکنار ہے اس میں

اُٹھنے یا اُبھرنے یا بلند ہونے کی طاقت نہیں ہے اسی لیے مجھے اس کی روانی کا منظر پسند نہیں ہے اے نوجوان! نہر (غلاموں یا محتاجوں) کی طرف مت دیکھ فوارّہ (بلند حوصلہ خوددار عزت مند انسانوں) کی طرف دیکھ، بظاہر نہر کے طول کے مقابلہ میں، بہت چھوٹا ہے لیکن اس کے دل میں اُمنگ ہے اُبھرنے کی طاقت ہے اس لیے بلندی کی طرف مائل ہے چونکہ اقبال کی رائے میں، اسلام، انسان کو اُبھرنے اور بلند ہونے کی تعلیم دیتا ہے اس لیے ان کو ہر وہ شئے پسند آتی ہے جس میں بلندی کا رنگ نظر آتا ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنے کلام میں جا بجا شاہین اور عقاب اور شہباز کا ذکر کیا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ ان پرندوں میں اُنھیں مردِ مومن کی بعض صفات کا پرتو نظر آتا ہے شاہین کی درویشی ملاحظہ ہو:-

پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں ✦ کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

شاعر

اس دلپذیر نظم میں اقبال نے شاعروں کو پیغام دیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے شاعروں کو کس قسم کی شاعری کرنی چاہیئے۔ کہتے ہیں -

(۱) مشرق کی شاعری کی دنیا میں، شاعری محض لفظی طلسم ہے نفس (مضمون) کا فقدان ہے، خدا جانے ہمارے شاعروں کے دماغوں میں مضامین اور خیالات ہیں بھی یا نہیں۔

(۲) اے پاکستان کے شاعر! غلامی کی بدولت جس قوم کی خودی ضعیف ہوجائے، اس قوم کے حق میں عجمی مذاق کی شاعری (وصل و ہجر کے افسانے اور دریائے راوی کے رومان) بالکل بیکار بلکہ مُضر ہے۔

(۳) خواہ تو پُر شوکت الفاظ استعمال کرے یا بالکل سادہ، اور اسلوبِ بیان غالبؔ کا ہو یا داغؔ کا، اصلی چیز یہ ہے کہ مضامین نہایت عالیشان اور حوصلہ افزا ہوں۔

جن کی بدولت قوم کی قوّتِ عمل تیز ہو جائے۔

(۴) یاد رکھو! اس دنیا میں کوئی قوم جدوجہد (جہاد) اور سعیٔ پیہم کے بغیر سرداری اور حکمرانی حاصل نہیں کر سکتی۔

(۵) پس میری یہ دُعا ہے کہ تیری شاعری سے قوم کے اندر، سربلندی کے حصول کا ایسا بے پناہ جذبہ پیدا ہو جائے کہ ایک عزت کا مقام حاصل کرنے کے بعد، دوسرا مقام حاصل کرنے کی تڑپ پیدا ہو اور یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہے یعنی ترقی کا جذبہ کبھی سرد نہ ہو۔

شعرِ عجم

اس نظم میں اقبال نے ایرانی شاعری پر تنقید کی ہے جس نے ان کی رائے میں مسلمانوں کی قوت عمل کو مفلوج کر دیا۔ کہتے ہیں کہ

(۱) اگرچہ ایرانی شاعری بہت مسرت انگیز اور دلکش ہے لیکن اس کے مطالعہ سے، انسانی خودی کو استحکام نصیب نہیں ہو سکتا۔

(۲) اگر بلبل کی خوش الحانی سے باغ پر افسردگی (خزاں کا رنگ) طاری ہو جائے تو اُسے خاموش رہنا بہتر ہے۔ اسی طرح اگر شاعر یہ دیکھے کہ میرے کلام سے قوم میں مایوسی اور دل شکستگی پیدا ہوتی ہے تو شاعری ترک کر دے۔

(۳) اگر شاعروں کے کلام سے قوم کے اندر وہ طاقت پیدا نہ ہو سکے جس کی بدولت اُس قوم کے افراد، غلامی کی زنجیروں کو توڑ سکیں تو خواہ ان کی شاعری آسمان سے اونچی ہو تو بھی بیکار ہے۔ مثلاً بیدلؔ ہی کے کلام کو دیکھ لیجیے نہایت دشوار اور مغلق ہے اور انداز بیان اس قدر مشکل ہے کہ بعض اشعار بالکل چیستاں بن گئے ہیں۔ لیکن اس کی شاعری سے قوم کے اندر "عمل صالح" کا کوئی جذبہ پیدا نہیں ہوا۔

اے دوستو! اے شاعرو! یہ عیش و عشرت کا زمانہ نہیں بلکہ جدّوجہد کا دور ہے

لٰہذا قوم کو عمل کا پیغام دو اور ہر اس بات سے پرہیز اور اجتناب کرو جو تمہیں حقیقت پسندی سے دُور کر دے اور وہمی دُنیا کی طرف لے جائے۔

ہنروران ِہند

اس نظم میں اقبال نے ہندوستان (اب پاکستان کو بھی شامل کر لیا جائے) کے فنکاروں کی ذہنیت یا نفسیاتی حالت پر تنقید کی ہے۔ کہتے ہیں۔

(۱) اِن کے تخیلات اور تصوّرات ایسے مرُدہ ہیں کہ ان کے کلام یا مضامین خصوصاً افسانوں کے پڑھنے کے بعد اگر کسی کے اندر پاکیزہ جذبات موجود ہوں، تو وہ بھی مردہ ہو جاتے ہیں، پیدا ہونا تو خارج از بحث ہے۔ اور اگر کوئی قوم ان کے خیالات کی پیروی کرنے لگے تو یقیناً تباہ ہو جائے گی۔

(۲) ہندوستان کے شاعر مصوّر اور افسانہ نگار اپنے کلام میں اپنی تصاویر میں اور اپنے افسانوں میں ایسے تخیلات پیش کرتے ہیں جن سے قوّتِ عمل افسردہ بلکہ مردہ ہو جاتی ہے ان بُت پرستوں کا آرٹ زندگی اور حقائق زندگی سے بالکل دُور ہے، یہ لوگ سچائی اور حقیقت سے بیگانہ ہو کر ایک فرضی اور وہمی دنیا میں رہتے ہیں اور اپنے فن کے نمونوں سے قوم کو افیون کی گولیاں کھلاتے رہتے ہیں۔

مثلاً جب پاکستان کے نوجوان (لڑکے اور لڑکیاں) رات دن ریکارڈوں اور ریڈیو پر مشاعروں اور کتابوں میں، اس قسم کے اشعار سنتے اور پڑھتے رہیں گے کہ

ہمیں تو شامِ غم میں کاٹنی ہے زندگی اپنی ۔۔۔ یا ۔۔۔ کہ وہ ساحل پہ ہوتے اور کشتی ڈوبتی اپنی

تو آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ان کی ذہنیت کس قدر افسردہ اور غم پسند ہو جائے گی۔ کیا ایسے نوجوان، جہاد میں حصہ لے سکتے ہیں؟ یا مشکلات زندگی پر غالب آ سکتے ہیں! ہرگز نہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب اُن کے دل اور دماغ میں غرقابی اور فنا کا تصور جاگزین ہو جائیگا تو پھر اُبھرنے اور جدوجہد کرنے اور موجوں کا مقابلہ کرنے اور ساحل پر پہنچنے کا تصور کب اور کیسے پیدا ہو سکے گا۔؟

جب ایک نوجوان کی زندگی کا مقصدِ وحید صرف یہ ہو کہ اس کا محبوب تو ساحل پر دُوربین ہاتھ میں لیے بیٹھا ہو اور وہ خود اس قدر پست ہمت، مایوس، کمزور، بزدل اور دل شکستہ ہو کہ کنارے پر پہنچ کر محبوب سے ملنے کا تصور بھی نہ کر سکتا ہو بلکہ محبوب کو اپنی محبت کا آخری ثبوت دیکر منجدھار میں غرق ہو جانے کو مقصد حیات سمجھتا ہو، تو وہ نوجوان، تلوار ہاتھ میں لے کر، میدانِ جنگ میں کیسے اور کس طرح جا سکتا ہے۔

(۳) ہندوستان و پاکستان کے فنکار، زندگی کے بلند مقامات تو نوجوانوں سے پوشیدہ رکھتے ہیں بلکہ اُن کو پستی کی طرف لیجاتے ہیں اور ان کا مقصد یہ ہے کہ انسان کے اخلاق حسنہ اور پاکیزہ صفات کو فنا کر دیں اور اُن کے بجائے نفسانی (حیوانی) خواہشات اور جنسی میلانات کو برانگیختہ کر دیں

(۴) یہی وجہ ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے شاعروں، مصوروں اور افسانہ نگاروں کے یہاں ہر جگہ عورت ہی عورت جلوہ گر ہے۔ عموماً شاعروں کا مشغلہ یہ ہے کہ لفظوں کے ذریعہ سے عورت کے جسم کے مختلف اعضاء کی تصویر کھینچتے رہتے ہیں اور مشاعروں میں اسی قسم کے شعروں پر "داد" بھی ملتی ہے۔

مصوروں کا مشغلہ یہ ہے کہ ایسی تصاویر بناتے ہیں جن میں عورت لباس کے باوجود، عریاں نظر آتی ہے اور ایسی ہی تصاویر زیادہ مقبول ہوتی ہیں اور لطف یہ ہے کہ اسے آرٹ کا کمال سمجھا جاتا ہے۔ افسانہ نگاروں کا مشغلہ یہ ہے کہ عورت اور مرد کے جنسی تعلقات کو مزے لے لیکر بیان کرتے ہیں اور اسے حقیقت نگاری سمجھتے ہیں اور غلط فہمی کی انتہا یہ ہے کہ اپنے آپ کو ترقی پسند، کہتے ہیں حالانکہ یہ ترقی نہیں بلکہ ذہنی پستی اور اخلاقی موت ہے۔

نوٹ :- علامہ نے شاعر مصوّر اور افسانہ نگار کا ذکر تو کر دیا لیکن ان کے سرپرستوں کا تذکرہ خدا جانے کیوں نہیں کیا! حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کو اور ان کے اس انسانیت کش آرٹ کو جو کچھ فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ وہ سب فلمیں بنانے والوں کی نگاہِ کرم کا نتیجہ ہے۔ پاکستان کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو دین، مذہب، اخلاق اور آدمیت سے برگشتہ کرنے میں یہ فلمیں (FILMS) "میجر پارٹ" ادا کر رہی ہیں، چنانچہ ان کی بدولت ہمارے اخلاق اس قدر تباہ ہو چکے ہیں کہ مسلمان ماں خود اپنی جوان بیٹی کو ساتھ لیکر "نرگس" کا کام" دیکھنے جاتی ہے اور اسے مطلق معیوب نہیں سمجھتی اور اب تو کراچی میں کالج کی مسلمان لڑکیاں "شکنتلا" کا روپ بھر کر، روز روشن میں "ارباب نظر" سے خراج تحسین وصول کرتی ہیں بلکہ پہلا انعام حاصل کرتی ہیں۔

مردِ بزرگ

اس نظم میں اقبال نے مردِ مومن کی صفات بیان کی ہیں کہتے ہیں کہ:۔

(۱) مومن، کفر سے نفرت کرتا ہے اور اس کی نفرت بہت شدید ہوتی ہے یعنی وہ کفر سے کسی قسم کی مفاہمت نہیں کر سکتا۔ وہ اسلام سے محبت کرتا ہے اور اس کی محبت بھی بہت شدید ہوتی ہے یعنی وہ اسلام کے لیے اپنی زندگی تک قربان کر سکتا ہے۔ واضح ہو کہ یہ مضمون اس آیت سے ماخوذ ہے :

وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ	اور جو لوگ آپؐ کے ساتھ ہیں اُن کی حالت یہ ہے کہ وہ کافروں پر بہت شدید ہیں لیکن آپس میں ایک دوسرے پر بہت شفیق اور مہربان ہیں۔

نیز مومن اگر اللہ کے بندوں پر قہر یا سختی کرتا ہے تو اس میں بھی شفقت کا رنگ پوشیدہ ہوتا ہے وہ اس طرح کہ اُستاد اگر شاگردوں پر سختی کرتا ہے تو اس میں، اُستاد کو شاگردوں کی بہتری ہی مدِّ نظر ہوتی ہے۔

(۲) اس کی دوسری صفت یہ ہے کہ اگرچہ اُس کی پرورش تقلید کے ماحول میں ہوتی ہے لیکن وہ اپنی فطری صلاحیت کی بدولت، اپنے ماحول میں انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ پرانی رسموں اور بُری باتوں کو مٹا کر، پاکیزہ طرزِ زندگی کی تخلیق کرتا ہے۔

(۳) اگرچہ وہ بظاہر، سب لوگوں کے ساتھ رہتا ہے، سب سے ملتا جُلتا ہے لیکن اللہ کے سوا کسی کو اپنا محبوب یا مقصدِ حیات نہیں بناتا۔ گویا وہ شمعِ محفل کی طرح سب کو اپنی ذات سے فائدہ پہنچاتا ہے لیکن خود سب سے الگ رہتا ہے۔

(۴) اس کی دماغی قوتیں نہایت روشن ہوتی ہیں۔ اسی لیے وہ صاحبِ فراست ہوتا ہے جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مومن کی فراست

سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے اس کی گفتگو نہایت سادہ اور سچی ہوتی ہے۔ لیکن آسان لفظوں میں وہ بڑے حکیمانہ نکتے بیان کر جاتا ہے۔

(۵) وہ دُنیا کو، دُنیاداروں کے زاویۂ نگاہ سے نہیں دیکھتا، بلکہ ہر بات کو قرآن اور سنّت کی روشنی میں دیکھتا ہے، اِسی وجہ سے اس کا اندازِ نظر اپنے زمانہ سے جُدا ہوتا ہے مثلاً دنیا دار، دنیاوی فوائد اور مادّی اغراض کے حصول کی خاطر، ضمیر فروشی بھی کر لیتے ہیں لیکن مومن اسباب کو کبھی جائز نہیں رکھتا۔ وہ فقر و فاقہ میں گذر کر لیتا ہے لیکن ایمان نہیں بیچتا۔ یہی وجہ ہے کہ "پیرانِ طریق" یعنی دنیا دار علماء یا صوفیا اس کے احوال اور مقامات سے آگاہ نہیں ہو سکتے۔

عالمِ نو

اقبال نے اس نظم میں یہ بتایا ہے کہ عالمِ نو کیسے پیدا ہوتا ہے اور اس کا خمیر کن چیزوں سے تیار ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ :-

(۱) عالمِ نو (نئی دنیا) وہ شخص پیدا کر سکتا ہے جس کا دل زندہ ہو یعنی جس کی خودی مرتبۂ کمال تک پہنچ چکی ہو۔ چونکہ وہ ضمیرِ کائنات سے آگاہ ہوتا ہے اس لیے یہ بھی جانتا ہے کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ چنانچہ وہ جب سونے کے لیے لیٹتا ہے تو یہ خیال اس کے ذہن میں ہوتا ہے کہ میں ایک نئی دُنیا بناؤں گا، جس میں اللہ کے بندے، اللہ کی مرضی پر چل سکیں جس میں اسلام کا نام بلند ہو سکے، جس میں کفر ذلیل اور مغلوب ہو سکے۔ اس لیے وہ خواب

بھی دیکھتا ہے تو عالمِ نو کا یا خواب میں عالمِ نو کی تصویر بناتا ہے ۔ یعنی سوتے جاگتے اسلام کی سربلندی کا خیال اس کے دل پر مسلط رہتا ہے ۔

(۲) جب وہ سو کر اُٹھتا ہے اور ہمیشہ بانگ اذان اُسے بیدار کر دیتی ہے تو وہ رات بھر جن تصوّرات میں غلطاں رہا ہے بس انہی خیالات کو عملی جامہ پہنانے میں مصروف ہو جاتا ہے ۔ جو دُنیا اُس نے خواب میں بنائی تھی اُسے اب خارج میں تعمیر کرنے لگتا ہے یعنی اسلام کی سربلندی کے لیے کوشاں ہو جاتا ہے ۔ خلاصہ یہ کہ جب وہ سوتے لیٹا تھا تو اسلام کی سربلندی کا خیال دل میں لے کر لیٹا تھا ۔ خواب میں بھی یہی خیالات اس کے دل پر مسلّط رہے اور جب سو کر اُٹھا تو پھر انہی خیالات کو خارجی شکل دینے میں مصروف ہو گیا ۔

(۳) اس نئی دنیا کا بدن ، اُسی کی کفِ خاک سے بنتا ہے ۔ اور اُسی کی تکبیر سے اس دُنیا میں روح پڑتی ہے ۔ یعنی وہ اپنی شخصیت یا ظاہری وجود کی بدولت اُس نئی دنیا کو خارجی شکل عطا کرتا ہے اور اس نئی دُنیا میں جو کچھ خوبی اور پاکیزگی نظر آتی ہے یہ سب کچھ اُسی مردِ مومن کے نعرۂ تکبیر کی بدولت نظر آتی ہے اُسی کی تکبیر سے باطل سرنگوں ہوتا ہے اور اُسی کی تکبیر سے اسلام کا بول بالا ہوتا ہے ۔

واضح ہو کہ اقبال نے اس قسم کی نظموں میں ، عصرِ حاضر کے مسلمانوں کو اُن کے اسلاف کے کارنامے یاد دلائے ہیں کہ جب مسلمان زندہ تھے تو وہ اسی دنیا میں ، عالمِ نو پیدا کرتے رہتے تھے ۔ مثلاً جب اُنھوں نے مصر فتح کر لیا تو طرابلس کی فتح کے منصوبے باندھا کرتے تھے اور اسی طرح الجزائر اور مراقش کی فتح کے بعد اُنھوں نے سوچا کہ کیوں نہ اسپین کو

فتح کیا جائے ، اُندلس (SPAIN) میں اس وقت پرانی دُنیا کا سکہ رواں تھا ۔ عربوں نے سوچا کہ لاؤ اس خطۂ ارضی میں عالمِ نو پیدا کریں (اس عالم کی خصوصیات اوپر مذکور ہو چکی ہیں) ، تو انھوں نے فوج کشی کی — میدانِ جنگ میں اُن کی نعشیں پیوندِ زمین ہو گئیں ، اُن کا جسم اُندلس کی مٹی میں مل گیا ۔ یہ ہے مطلب اس مصرع کا ؎

بدن اس تازہ جہاں کا ہے اُسی کی کفِ خاک

اور یہ فتح جو ان کو حاصل ہوئی یہ سب کرشمہ تھا نعرۂ تکبیر کا یعنی فتح کے بعد ہی اُندلس میں اسلام کا نام سربلند ہوا ۔ اسی لیے اقبال نے یہ کہا کہ : ؎

روح اس تازہ جہاں کی ہے اُسی کی تکبیر!

اب نہ وہ مسلمان ہیں ، نہ وہ اُن کے تصورات ہیں ، نہ وہ کائناتِ نو کی تشکیل کے ولولے ہیں ۔ اس دَور میں یہ سب خواب کی باتیں ہیں بلکہ ایک دور رس تخیّل پرست[1] (VISIONARY IDEALIST) کے احساساتِ قلبی کی تصاویر ہیں ۔

---

[1] یہ لفظ میں نے یہاں قصداً استعمال کیا ہے کیونکہ مارچ ۱۹۳۲ء میں علامہ مرحوم نے اپنے خطبۂ صدارت میں ، یہ مرکب توصیفی خود اپنے لیے استعمال کیا تھا لیکن اس میں شک نہیں کہ جو خواب اُنھوں نے ۱۹۳۰ء میں دیکھا تھا ۱۹۴۷ء میں اس کی تعبیر ساری دنیا کے سامنے مجسّم ہو گئی ۔ ۱۲

ایجادِ معانی

اس نظم میں اقبال نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ اگرچہ فنونِ لطیفہ مثلاً شاعری مصوری اور موسیقی، کی نعمت خداداد ہے۔ "DIVINE" لیکن اس کے باوجود ان فنون میں کمال حاصل کرنے کے لیے بڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔

(۱) اگرچہ نئے معانی پیدا کرنے کی قوت، خداداد ہوتی ہے، پھر بھی اربابِ فن کو اپنے اپنے فن میں مہارتِ تامہ حاصل کرنے کے لیے سعیٔ پیہم اور کوششِ بلیغ، صرف کرنی پڑتی ہے۔

(۲) مثلاً خواجہ حافظؒ نے شاعری کی دنیا میں غیر فانی شہرت حاصل کی لیکن دیوانِ حافظ اور مرقع بہزاد دونوں، بڑی محنت کے بعد مرتب ہوئے تھے۔[۱]

(۳) سچ یہ ہے کہ مسلسل کوشش اور لگاتار محنت کے بغیر، انسانی شخصیت کی کوئی خوبی ظاہر نہیں ہو سکتی۔ دیکھ لو فرہاد کا نام دنیائے عاشقی میں اُس وقت روشن ہوا جب اُس نے برسوں کی لگاتار محنت سے پہاڑ جیسی چیز کاٹ کر رکھ دی۔

---

[۱] اقبال کے قول کی صداقت ناظرین پر اس وقت واضح ہو سکتی ہے جب وہ خود کسی فن میں مہارت حاصل کریں یا کسی صاحبِ فن سے یہ دریافت کریں کہ آپ نے اس فن کی تحصیل میں کتنا وقت صرف کیا۔ مثلاً شاہ سدا رنگ نے (بعہد محمد شاہ) موسیقی میں ایک خاص طرز ایجاد کی جسے "خیال" کہتے ہیں۔ لیکن یہ صاحبِ فن تیس سال تک اپنے مکان کی چار دیواری سے باہر نہیں نکلا، تب کہیں جا کر اس طرز کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکا۔ ۱۲

موسیقی

اس نظم میں اقبال نے موسیقی کی خصوصیت بیان کی ہے کہ :۔

(۱) حقیقی موسیقی وہ ہے جس کو سُن کر انسان کے اندر جذبات عالیہ برانگیختہ ہو جائیں یعنی محبت الٰہی کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ اگر موسیقی سُن کر دل میں جوش پیدا نہ ہو اور رگوں میں خون نہ دوڑنے لگے یعنی جہاد کا جذبہ پیدا نہ ہو تو وہ نغمہ اسبات کی دلیل ہے کہ مُغنّی کا دل خود مُردہ ہے اور مردہ کسی کو بیدار نہیں کر سکتا۔

(۲) وہ مُغنّی جس کا دل خود محبتِ الٰہی سے لبریز نہ ہو، وہ اپنی موسیقی سے سامعین کو نفع کے بجائے نقصان پہنچاتا ہے۔ بلکہ اُن کی زندگیوں کو تباہ کر دیتا ہے۔ قوم ایسی موسیقی سے بالکل مُردہ ہو جاتی ہے۔ اور اس میں عمل کا جذبہ فنا ہو جاتا ہے۔

(۳) میں نے مشرق اور مغرب دونوں حصّوں میں اس بات کی تحقیق کی لیکن کہیں بھی مجھے کوئی مُغنّی ایسا نہ ملا جس کا نغمہ سُن کر انسان کے دل میں محبتِ الٰہی کا جذبہ پیدا ہو جائے۔

ذوقِ نظر

(پہلی)

اقبال نے اس نظم میں ایک چینی کے طرزِ عمل سے ایک دلپذیر نکتہ اخذ کیا ہے کہ جب جلاد اُسے قتل کرنے پر آمادہ ہوا تو اُس نے یہ کہا کہ ذرا ایک

منٹ کے لیے توقف کر، میں تیری شمشیر کی آب وتاب کو دیکھ کر اپنے ذوقِ نظر کی تسکین کا سامان بہم پہنچالوں۔ اس کے بعد مجھے شوق سے قتل کر دینا۔

اقبالؔ نے اس واقعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اگر کسی شخص کی خودی بلند ہو جائے تو وہ موت سے بالکل نہیں گھبراتا نیز چونکہ اس کی خودی مرتبۂ کمال پر پہنچ جاتی ہے اس لیے وہ کائنات میں کمال اور حسن وجمال کی قدر کرنا سیکھ جاتا ہے جہاں بھی اُسے کسی چیز میں کمال نظر آتا ہے (اور کمال میں جمال مضمر ہوتا ہے) وہ اس کو ضرور دیکھ لیتا ہے اور اس طرح اپنے ذوقِ نظر کی تسکین کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔

اس چینی کی جگہ اگر کوئی اور شخص ہوتا جس کی خودی ناقص یا پست ہوتی تو وہ تلوار کو دیکھ کر سراسیمہ ہو جاتا، لیکن اُس چینی کی خودی چونکہ بلند تھی اس لیے وہ موت کے تصور سے قطعاً مضطرب نہیں ہوا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ انسان میں ذوق نظر اُسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب اُس کی خودی بلند ہو جائے۔

شعر

(دوسری)

اس نظم میں اقبال نے شعر کی حقیقت سمجھائی ہے کہ :۔

(۱) اگرچہ میں شعر کے اسرار ورموز سے آگاہ نہیں ہوں لیکن ایک نکتہ ایسا بتاتا ہوں جس کی تصدیق قوموں کی تاریخ سے ہو سکتی ہے۔

(۲) وہ نکتہ یہ ہے کہ جس شاعری سے قومیں زندہ ہو سکتی ہیں اور دنیا میں سربلندی

حاصل کر سکتی ہیں، وہ شاعری یا نغمۂ جبریل ہوتی ہے یا بانگ اسرافیل یعنی اُس شاعری میں یا تو پاکیزہ خیالات ہوتے ہیں جن کی بدولت قوم میں نیکی کی طرف میلان پیدا ہوتا ہے یا پھر اُس میں عمل صالح کی ترغیب ہوتی ہے جس کی بدولت قوم میں جہاد کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔

رقص وموسیقی

(پہلی)

اس نظم میں اقبال نے شاعری، موسیقی اور رقص کے ربط باہمی کو واضح کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ

(۱) شاعری میں وہ لذت ہے کہ جبرئیل اور ابلیس (نیکوکار اور بدکار) دونوں اُس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اچھا شعر مسلم اور کافر دونوں سے خراجِ تحسین وصول کرتا ہے۔ اور رقص وموسیقی سے انسانوں میں سوز وگداز کا رنگ پیدا ہوتا ہے بلکہ محویت کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔

ایک چینی حکیم نے ان تینوں کے ربط باہمی کو اس طرح بیان کیا ہے کہ اگر موسیقی کو ایک انسان فرض کر لیا جائے تو شاعری اس کے لیے بمنزلہ روح ہے اور رقص بمنزلۂ بدن ہے یعنی شاعری، موسیقی کا باطنی پہلو ہے اور رقص اس کا ظاہری پہلو ہے۔ بالفاظ دگر، شاعری، الفاظ سے تاثیر پیدا کرتی ہے، موسیقی آواز سے تاثیر پیدا کرتی ہے۔ رقص، اعضائے جسمانی کی موزوں حرکات کا نام ہے، موسیقی آوازِ انسانی کی موزوں حرکات کا نام ہے۔ گویا موسیقی، شاعری اور رقص دونوں کی صفات اور کیفیات

کی جامع ہے۔

نوٹ :۔ اس میں شک نہیں کہ موسیقی کا مرتبہ فنی اعتبار سے، جملہ فنون لطیفہ پر فائق ہے۔ شعر اور رقص صرف انسانوں کو متاثر کر سکتے ہیں۔ لیکن موسیقی، حیوانات تک کو متاثر کر سکتی ہے۔ آواز کا جادو ہر قسم کے جادو سے افضل ہے۔ اسی لیے ارسطو نے موسیقی کو روح کی غذا قرار دیا ہے۔ ۱۲۰

ضبط

(دوسری)

اس نظم میں اقبال نے ہمیں ضبطِ نفس کا فلسفہ سمجھایا ہے واضح ہو کہ تصوّف میں پہلے ضبط حواس کی تعلیم دی جاتی ہے پھر ضبطِ نفس کی اور میرا مسلک یہ ہے کہ جو شخص اپنے اوپر قابو نہیں پا سکتا وہ دنیا میں دوسروں کو اپنے قابوں میں ہرگز نہیں لا سکتا۔ بالفاظ دگر جو شخص اپنے نفس پر حکومت نہیں کر سکتا۔ وہ دوسروں کے دلوں پر حکومت کرنے کا کبھی مستحق نہیں ہو سکتا۔

صوفیائے کرامؒ کی زندگیوں کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ انسانوں کے دلوں پر حکومت کرتے تھے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انہوں نے پہلے اپنے نفس پر حکومت حاصل کر لی تھی۔ اپنشدوں میں لکھا ہے کہ تمہارے اصلی دشمن پانچ ہیں۔ کام، کرودھ، موہ، لوبھ اور اہنکار۔ ان پانچ دشمنوں کو زیر کر لو، ساری دنیا تمہاری غلام ہو جائے گی۔ اور یہ بات بالکل صحیح ہے

(۱) کہتے ہیں کہ دُنیا والوں کا طریقہ یہ ہے کہ زمانہ یعنی اہل زمانہ کا گلہ کرتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ طریقہ، مسلک درویشی کے بالکل خلاف ہے

جو لوگ اپنے نفس پر قابو رکھتے ہیں وہ کسی کا شکوہ نہیں کرتے بلکہ اگر کوئی شخص اُنہیں تکلیف پہنچاتا ہے تو بھی حرف شکایت زبان پر نہیں لاتے

(۲) اس کی وجہ یہ ہے کہ آہ و فغاں کرنا کمزوروں اور بزدلوں کا شیوہ ہوتا ہے بہادر آدمی کبھی آہ و فغاں کر کے اپنی خودی کو رسوا نہیں کرتا۔ دیکھ لو! لومڑی یا بھیڑ بکری ذرا سی تکلیف سے چیخنے لگتی ہے لیکن شیر گولی کھا کر بھی آہ و فغاں نہیں کرتا۔

رقص

اس نظم بلیغ میں اقبال نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ رقص کی دو مختلف قسمیں ہیں پہلی قسم رقص جسمانی ہے یعنی وہ رقص (ناچ) جو جسم کے ذریعہ سے کیا جاتا ہے جس میں جسم رقص کرتا ہے دوسری قسم رقص روحانی ہے یعنی وہ رقص جو روح کی مدد سے کیا جاتا ہے جس میں روح رقص کرتی ہے اور جس طرح دونوں کی نوعیت اور کیفیت میں فرق ہے اسی طرح ان کے ثمرات میں بھی فرق ہے یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ اقبال روح کے رقص کو پسند کرتے ہیں بلکہ اس کے شیدائی ہیں۔

اقبال کی نظر میں روح کے رقص کی جو قدر و منزلت ہے اس کا کچھ اندازہ اس شرح کے ناظرین کو اس بات سے ہو سکتا ہے کہ جاوید نامہ کے آخری باب میں اقبال نے اپنی قوم کے نوجوانوں کو چند نصیحتیں کی ہیں (عنوان اس باب کا "خطاب بہ جاوید سخنے بہ نژادِ نو" ہے) اور اس سلسلہ میں آخری نصیحت یہ کی ہے۔

رقصِ تن در گردش آرد خاک را — رقصِ جاں برہم زند افلاک را
اے مرا تسکینِ جانِ ناشکیب — تو اگر از رقصِ جاں گیری نصیب
رمزِ دینِ مصطفیٰ گویم ترا !! — ہم بقبر اندر دُعا گویم ترا

کہتے ہیں کہ اے مسلمان نوجوان ! یاد رکھ کہ رقصِ تن ، تو محض تیرے جسم کو گردش میں لاتا ہے ۔ لیکن رقصِ جاں ، ساری کائنات کو گردش میں لا سکتا ہے ۔ بلکہ اس کی بدولت تیرے اندر اس قدر طاقت پیدا ہو جائیگی کہ تو نئی دنیا پیدا کر سکے گا ۔

اے میری بیقرار روح کے لیے باعثِ تسکین[۱] ! اگر تو اپنی روح کو رقص کرنا سکھا دے تو میں تجھے دین اسلام کی حقیقت سے آگاہ کر دوں گا اور تجھ سے اس قدر خوش ہوں گا کہ مرنے کے بعد قبر میں بھی تیرے لیے دُعا کرتا رہوں گا ۔

ان اشعار سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اقبال " رقصِ جاں " کو اس قدر قیمتی کیوں سمجھتے ہیں ؟ محض اس لیے کہ اس میں دین اسلام کی حقیقت مضمر ہے دینِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی غرض و غایت ہی یہ ہے کہ مسلمان کی روح رقص کرنے لگے

(حاشیہ صفحہ گذشتہ) افسوس کہ اس " گنجِ شائیگاں " کی اشاعت کو ۱۸ سال ہونے آئے لیکن ابھی تک قوم کے نوجوانوں نے اس کتاب کے مطالعہ کی طرف کوئی توجہ نہیں کی اور اگر اس خطۂ پاک میں ، انگریزوں کا مدوّن کردہ نظام اور نصابِ تعلیم ، اسی طرح جاری رہا تو مجھے اندیشہ ہے کہ اقبال کا یہ پیغام " صدا بصحرا " ثابت ہو گا ۔

[۱] کیا یہ افسوس کا مقام نہیں کہ قوم کے جن نونہالوں کو اقبال مرحوم نے اپنے لیے باعثِ تسکین قرار دیا تھا وہ مرحوم کو تسکین دینے کے بجائے خود تسکین کی تلاش میں جو بلی ہیجنگ ، انگارا اور رٹز کا طواف کر رہے ہیں ۔ یعنی ریت میں سے تیل نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں ۔ !

اب ضربِ کلیم کے شعروں کا مطلب لکھتا ہوں :-

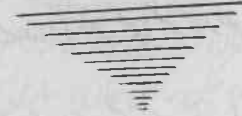
اے مسلمان نوجوان ! یہ رقص بدن تیرے لیے مناسب نہیں ہے ۔ اس ناچ میں یورپ کی قوموں کو مصروف رہنے دے ، کیونکہ وہ مادّہ پرست ہیں اور رقص بدن کے علاوہ اور کسی قسم کا رقص ان کی سمجھ میں نہیں آ سکتا ۔

تو اپنی روح کو رقص کرنا سکھا کیونکہ اللہ نے تجھے اس لیے پیدا کیا ہے کہ تو اپنے زمانہ کے فراعنہ (اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کے قانون کے بجائے اپنا وضع کردہ قانون ملک میں نافذ کرتے ہیں اور اللہ کے بندوں کو اُس قانون کی اطاعت کا حکم دیتے ہیں) کا مقابلہ کر سکے اور ظاہر ہے کہ یہ طاقت تجھ میں اُسی وقت ہو سکتی ہے جب تو اپنے اندر شانِ کلیمی پیدا کر لے اور یہ شان اس وقت حاصل ہوتی ہے جب روح رقص کر سکے ۔

یاد رکھ کہ جسم کے رقص کا صلہ یا ثمرہ یہ ہے کہ انسان تھوڑی دیر کے لیے تو لطف اندوز ہو جاتا ہے لیکن رقص سے فارغ ہو کر بالکل تھک جاتا ہے اور تشنگی محسوس کرتا ہے ۔ چنانچہ اس تشنگی کو اپنی حماقت کی بنا پر جام آتشیں سے بجھاتا ہے اور اس کا نتیجہ " خمار " کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور اس کے رفع کرنے کے لیے " صبوحی " درکار ہوتی ہے ۔ صبوحی (صبح کی شراب) سے پھر خمار لاحق ہوتا ہے اس کو دفع کرنے کے لیے پھر شراب پیتا ہے ۔ مختصر یہ کہ ساری عمر اسی خمار اور سکر کے چکر میں گرفتار رہ کر حیوانوں کی سی زندگی بسر کرنے کے بعد راہی ملکِ عدم ہو جاتا ہے لیکن روح کے رقص کا صلہ ایسا عظیم الشان ہے کہ تیرے تصوّر میں بھی نہیں آ سکتا ۔ جو شخص اپنی روح کو رقص کرنا سکھا دیتا ہے ، فرشتے درویشی

کا تاج اس کے سر پر رکھ دیتے ہیں۔ کونسی درویشی!

؏ وہ درویشی کہ اس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری



باب پنجم

سیاسیات مشرق و مغرب

تمہید اس باب میں اقبال نے اہلِ مغرب کی سیاست اور اُن کے مختلف سیاسی نظاموں مثلاً اشتراکیت، جمہوریت، ملوکیت، اور آمریت پر تبصرہ کیا ہے۔ اور مختلف پیرایوں میں اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ اِن کی سیاست اور ان کے سیاسی نظام سب کے سب عیاری مکاری اور ظلم و ستم پر مبنی ہیں۔ اور اُن کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کے بندوں کو اللہ اور اُس کے قانون سے بیگانہ بنا کر اپنی خواہشات کا غلام بنائیں۔ اس لیے مسلمانوں کا فرض یہ ہے کہ وہ ابلیس کے اِن فرزندوں کے خلاف متحدہ محاذ قائم کریں اور یو این او کے مقابلہ کے لیے تنظیم مسلمانانِ عالم کی بنیاد ڈالیں تاکہ ابلیسی نظام کو شکست دے کر دنیا میں اسلامی نظام قائم کر سکیں۔ اگر تمام دنیا کے مسلمان اللہ کا نام لے کر "وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰہِ" پر عامل ہو جائیں تو وہ دنیا میں انقلاب پیدا کر سکتے ہیں۔

اشتراکیت

اقبال نے ضرب کلیم کے علاوہ پیام مشرق جاوید نامہ، بال جبریل، مثنوی "پس چہ باید کرد" اور ارمغان حجاز میں بھی بیسویں صدی کی اس جدید عالمگیر تحریک کے ہر پہلو پر مختلف پیرایوں میں نقد و تبصرہ کیا ہے اور اُنہوں نے اپنی

تصانیف میں اس بحث پر جس قدر لکھا ہے اگر اس کو ایک جگہ جمع کر کے اُس پر تبصرہ کیا جائے تو بلاشبہ پانچ چھ سو صفحے کی کتاب بن جائے گی۔ میں اس شرح میں اس قسم کی کوئی کوشش نہیں کر سکتا۔ صرف دو باتوں پر اکتفا کروں گا۔

(۱) اقبال کو کارل مارکس اور اشتراکیت سے جو کچھ دلچسپی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مذہب کے بعض اصول، اسلامی اصولوں سے جزوی مشابہت رکھتے ہیں مثلاً دونوں سرمایہ داری کے دشمن ہیں، ملوکیت کے دشمن ہیں کلیسائی نظام کے دشمن ہیں۔ دونوں محنت کش طبقے کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور دونوں طبقہ داری کشمکش سے معاشرہ کو آزاد رکھنا چاہتے ہیں۔

(۲) لیکن اقبال کو کارل مارکس کے نظریہ سے پیدا شدہ تمام نتائج سے شدید اختلاف ہے اس لیے کہ اِن سب کی بنیاد جدلیاتی مادیت اور عمل وردِ عمل کے فلسفہ پر ہے اور ظاہر ہے کہ اسلام، بلاواسطہ موثر خدا کو تسلیم کرنے کے بعد، کسی ایسے نظریہ کا حامی نہیں ہو سکتا جس کی بنیاد خالص مادیت پر ہو۔

کارل مارکس KARL MARX جو حکیمانہ اشتراکیت "SCIETIFIC SOCIALICM" کا بانی ہے، یہودی الاصل تھا ۱۸۱۸ء میں جرمنی میں پیدا ہوا۔ اور ہیگل کے مشہور متبع فائر باخ (PEWER EACH) کی تصانیف کی بدولت، ہیگل کے فلسفہ کا پیرو بن گیا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد، اس کے خیالات میں انقلاب عظیم پیدا ہو گیا۔ اور اس نے خدا اور مذہب دونوں کا انکار کر دیا۔ چنانچہ اس کا یہ فقرہ بہت مشہور ہے۔

"مذہب عوام کے لیے بمنزلہ افیون ہے۔"

سیاسی اختلافات کی بنا پر، اربابِ حکومت نے اس کو جلاوطن کر دیا۔ چنانچہ اُس نے کچھ عرصہ "بادیہ پیمائی" کرنے کے بعد لندن میں سکونت اختیار کر لی۔ اور وہیں بحالت عسرت ۱۸۸۳ء میں وفات پائی اس کی مشہور تصنیف سرمایہ (THE CAPITAL) ہے جس میں اُس نے ہیگل کے مشہور جدلیاتی طریق "DIALECTIC METHOD" کی مدد سے اپنے معاشی نظام کو مدوّن کیا ہے اور روس کے اشتراکی اس کتاب کو وہی مرتبہ دیتے ہیں جو عیسائی لوگ بائیبل کو دیتے ہیں اقبال نے مارکس کے فلسفہ یا معاشی نظام پر اس شعر میں بہت جامع تبصرہ کر دیا ہے۔

دین آں پیغمبر حق ناشناس
بر مساواتِ شکم دارد اساس

اس مختصر تمہید کے بعد اب نظم کا مطلب لکھتا ہوں:

(۱) "قوموں کی روش" توضیح طلب ہے۔ واضح ہو کہ معاشیات کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ زر (سرمایہ) موجب پیداوار دولت ہے یا محنت؟ بالفاظِ دگر، سوال یہ ہے کہ مؤثر اول کون ہے؟ سرمایہ یا مزدور؟ اسی کو عرف عام میں یوں کہتے ہیں کہ آجکل سرمایہ اور مزدور میں جنگ ہے یورپ و امریکہ کی اکثر و بیشتر قوموں کی روش یہ ہے کہ سرمایہ، موجب پیداوار دولت ہے اس کے مقابلہ میں اشتراکیت یہ کہتی ہے کہ یہی تو فساد کی جڑ ہے، سرمایہ نہیں بلکہ محنت، موجب پیداوار دولت ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ یورپ کی قوموں کی روش سے مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اشتراکی روس (ROSSIA) نے جو

طریق کار اختیار کیا ہے وہ بے سود نہیں ہے اُس سے ایک بڑا فائدہ مرتب ہونے کی اُمید ہے۔

(۲) حقیقت یہ ہے کہ زمانہ، سرمایہ داری کے فرسودہ طریقہ سے بیزار ہو چکا ہے اس لیے فکرِ انسانی نئے طریقے ایجاد کرنے پر مجبور ہو گئی ہے اور وہ نیا طریقہ یہ ہے کہ سرمایہ نہیں بلکہ محنت، موجبِ پیداوارِ دولت ہے۔

(۳) انسان کی ہوس (دولت جمع کرنے کی خواہش) نے جن اسرار کو عوام کی نظروں سے پوشیدہ رکھا تھا وہ اسرار، اب کھلتے نظر آتے ہیں۔ اسرار سے اقبال کی مراد محنت کا مؤثرِ اول ہونا ہے اور اسی نکتہ یا اصول کو یورپ کے سرمایہ داروں نے، عوام سے پوشیدہ رکھا تھا۔

(۴) اندریں حالات میں مسلمانوں کو قرآن مجید میں تدبر کی دعوت دیتا ہوں تاکہ وہ اس حقیقت سے آگاہ ہو سکیں کہ دنیا میں قرآنی اصول کے رائج ہونے کا وقت آگیا ہے یعنی جو اصول قرآن حکیم نے پیش کیے ہیں دُنیا اُن اصولوں کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو رہی ہے۔

نوٹ:۔ اسی بات کو اقبال نے ارمغانِ حجاز میں ابلیس کی زبان سے یوں ادا کیا ہے:۔

عصرِ حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں!

(۵) جو نکتہ قرآن مجید کی اس آیت میں بیان کیا گیا ہے شاید اس دَور میں اس کی حقیقت نمودار ہو جائے۔ وہ آیت یہ ہے:۔

وَيَسْئَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ ۚ قُلِ الْعَفْوَ ۔ (۲ : ۲۱۹)

لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں کیا یعنی کس قدر مال خرچ کریں۔ آپ کہہ دیجیے کہ جو تمہارے ذاتی خرچ سے بچے۔ یعنی ضروری اخراجات زندگی کے لیے پس انداز کرنے کے بعد جس قدر روپیہ تمہارے پاس بچے وہ سب اللہ کی راہ میں صرف کر دو۔ اسی آیت کا ترجمہ اقبال نے جاوید نامہ میں اس طرح کیا ہے۔

با مسلماں گفت جاں بر کف بنہ
ہر چہ از حاجت فزوں داری بدہ

عفو کے لغوی معنیٰ زیادتی یا زائد کے ہیں۔ یعنی مَازَادَ عَلَى الْحَوَائِجِ الْاَصْلِيَّةِ وَالْقُوَّةِ الْمُوَلِّدَةِ ۔

جو چیز بھی انسان کی اصلی حاجات اور قوتِ مولدہ سے زائد ہو وہ عفو ہے۔

واضح ہو کہ اس آیت میں قرآن مجید نے فرد اور مملکت کے مابین معاشی تعلق کو واضح فرمایا ہے، کہ ضرورت کے وقت، مملکت، افراد سے وہ تمام روپیہ جو اُن کی جائز ضروریات سے زائد ان کے پاس جمع ہو، لے سکتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلامی نظامِ حکومت میں، بیک جنبشِ قلم، سرمایہ داری ختم ہو سکتی ہے اور ہو جاتی ہے۔ (سرمایہ داری تو پیدا ہی اُس وقت ہوتی ہے جب فالتو روپیہ ہر سال کسی کے پاس جمع ہوتا رہے) اور افراد کے بجائے، سارا قومی سرمایہ، مملکت کی تحویل میں آجاتا ہے اور مملکت اُس قومی سرمایہ کو مفادِ عمومی کے لیے استعمال کر سکتی ہے اور کرتی ہے۔ اس لیے دولت چند افراد میں محدود ہو جانے کے بجائے عوام الناس یعنی تمام افرادِ قوم کے لیے باعثِ آسائش بن جاتی ہے اور

امیر اور غریب کا شدید امتیاز، تقریباً مٹ جاتا ہے اور یہی اسلام چاہتا ہے کہ ہر شخص آسائش کی زندگی بسر کرے۔ یہ طریقِ کار، اسلامی نظامِ معیشت کے بالکل خلاف ہے۔ کہ قوم کے معدودے چند افراد تو عیش کریں کروڑپتی بن جائیں اور اکثریت، نانِ شبینہ کے لیے بھی ترستی رہے۔

جب یہ مُسلّم ہے کہ دولت، مزدور کی محنت سے پیدا ہوئی ہے۔ تو کیا اس سے بڑھ کر کوئی ظلم، ہو سکتا ہے۔ کہ وہی مزدور نانِ شبینہ کا محتاج ہو؟ ع کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار؟

میری رائے میں اقبال نے یہ شعر نہیں لکھا ہے بلکہ اسلامی نظامِ معیشت کی روح، دو مصرعوں میں بیان کر دی ہے:۔

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

سرمایہ دارانہ نظام سے اقبال کو جس قدر نفرت تھی وہ پوری شدت کے ساتھ اس شعر میں جلوہ گر ہے۔

آمدم برسرِ مطلب، اقبال، مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ روس کے اس طرزِ عمل سے کم از کم یہ فائدہ ضرور ہوگا کہ اس آیت کی صداقت، دُنیا پر آشکارا ہو جائے گی۔

اس تمام نظم کو غور سے پڑھنے کے بعد اب پھر پہلے شعر کو پڑھیے تو اس کی سچائی واضح ہو جائے گی یعنی روس کی روش بے سود نہیں ہے۔ یعنی اسلام کے حق میں ضرور مفید ثابت ہوگی۔

اندریں حالات مسلمانوں کا خصوصاً پاکستان کے مسلمانوں کا فرضِ اوّلین یہ ہے کہ وہ اس دولتِ خداداد میں (اللہ اُس کو چشمِ بد سے محفوظ رکھے، اسلامی

نظامِ معیشت رائج کر دیں تاکہ ایک طرف دُنیا میں اسلام کا بول بالا ہو جائے۔ دوسری طرف مسلمانانِ پاکستان، اشتراکیت کے فتنہ سے محفوظ رہ سکیں اشتراکیت کا فتنہ یہ ہے کہ وہ انسانوں کو روٹی تو دیتی ہے؛ لیکن روح کو فنا کر دیتی ہے:۔

کردہ ام اندر مقاماتش نگہ
لا سلاطین، لا کلیسا، لا اِلٰہ

(جاوید نامہ)

کارل مارکس کی آواز

(پہلی)

اس نظم میں اقبال نے، اشتراکیت کے بانی کی تعلیمات کی ایک خصوصیت کو واضح کیا ہے۔ جو یہ ہے کہ نظامِ معیشت ایسا ہونا چاہیئے جس میں مزدور کو اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ مل سکے اور سرمایہ داری میں سب کچھ ہے لیکن یہی چیز نہیں ہے اور اسی کے فقدان سے یہ دنیا جہنم بن گئی ہے اس ملعون نظام میں، مزدور (محنت کش طبقہ، انسان کے درجہ سے گر کر حیوانات سے بھی بدتر ہو جاتا ہے کیونکہ بعض سرمایہ داروں کے کُتّے بھی مزدوروں سے بہتر زندگی بسر کرتے ہیں۔ کیا یہ انتہائی ظلم و ستم نہیں کہ جو مزدور، دولت مندوں کے لیے عالیشان محلات تعمیر کرتا ہے وہ خود "فٹ پاتھ" پر اپنی بے کیف زندگی کے دن، ایڑیاں رگڑ رگڑ کر کاٹتا ہے! اقبال نے مزدور کی حالت کا جو نقشہ کھینچا ہے اس میں سے تین شعر

میں اس جگہ لکھتا ہوں :-

خواجہ نانِ بندۂ مزدور خورد | آبروئے دخترِ مزدور بُرد
در حضورش بندہ می نالد چو نے | بر لب او نالہ ہائے پے بپے
نے بجامش بادہ نے در سبوست | کاخہا تعمیر کرد و خود بکوست

یعنی سرمایہ دار، مزدور سے روٹی بھی چھین کر کھا جاتا ہے اور اس کی بیٹی کی آبرو بھی لے لیتا ہے[1] مزدور کی حالت یہ ہے کہ وہ سرمایہ دار (زمیندار) کے سامنے گریہ وزاری کرتا ہے بلکہ اس کی پوری زندگی ایک مسلسل فریاد ہے۔ حد یہ ہے کہ روٹی جس کے لیے وہ بیچارہ، دن رات محنت کرتا ہے، نہ اس کے پیٹ میں ہے نہ ہاتھ میں ہے۔ ظلم کی انتہا یہ ہے کہ وہ سرمایہ دار کے لیے قصر تعمیر کرتا ہے لیکن خود بے گھر رہتا ہے۔ اسی کی محنت سے سرمایہ دار "سوٹ" پہنتا ہے لیکن وہ خود نیم عُریاں پھرتا ہے۔

اس تمہید کے بعد اب میں نظم کا مطلب لکھتا ہوں۔

(۱) کارل مارکس، اُن علمائے معاشیات سے جو سرمایہ دارانہ نظام کی حمایت کرتے ہیں، کہتا ہے کہ تم لوگ جس قدر اپنے علم وفن کی نمائش کرتے ہو، سب بیکار ہے۔ تمہارا علم فرسودہ ہو چکا ہے، لوگوں کی مالی مشکلات کو حل نہیں کر سکتا، اس لیے دُنیا کو اب اسی علم کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

(۲) اس کے علاوہ تمہاری کتابوں میں رکھا ہی کیا ہے؟ تم لوگ دولت کی پیداوار کے نقشے بنا بنا کر صفحات سیاہ کرتے ہو اور "مرَیز و کجدار" کے اصُول کی حمایت کرتے ہو، یعنی محنت کش طبقہ کو اُمیدیں تو بڑی بڑی دلاتے

---

[1] یہ شاعری نہیں ہے بالکل حقیقت ہے۔ اگر کسی کو شک ہو تو وہ دیہات میں جا کر اپنی آنکھوں سے اس تلخ حقیقت کا مشاہدہ کر سکتا ہے ۱۲

ہو لیکن عملاً ان کی بہبود کے لیے کچھ نہیں کرتے، تمہاری یہ "منصوبہ بندیاں" سب کاغذ کے پھول ہیں جن میں رنگ تو ہے لیکن خوشبو بالکل نہیں۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی خانقاہیں، کلیسائیں اور مدرسے یہ سب دھوکہ کی ٹٹیاں ہیں۔ ان کے اندر عقل انسانی، ان سرمایہ داروں کی ہوس دولت کی تکمیل کے لیے عیاری سے کام لے کر، مزدوروں کو غلام بنانے کے طریقے ایجاد کرتی رہتی ہے۔

انقلاب

(دوسری)

اس نظم میں، اقبال نے یہ بتایا ہے کہ زندگی کا سوز و ساز نہ ایشیا میں کہیں موجود ہے، نہ یورپ میں۔ یعنی انسان اپنی زندگی کا مقصد نہ ایشیا میں رہ کر حاصل کر سکتا ہے نہ یورپ میں اس کی وجہ یہ ہے کہ ایشیا میں تو غلامی کی وجہ سے لوگوں کی خودی مردہ ہو چکی ہے اور یورپ میں لادینی اور اشتراکیت کی بدولت ضمیر فنا ہو چکا ہے (ضمیر کا وجود ایمان باللہ پر موقوف ہے) چونکہ بنی آدم اس مہمل طرز زندگی سے تنگ آ چکے ہیں۔ اس لیے اُن کے دلوں میں اس فرسودہ نظام کو تباہ کرنے کا ولولہ پیدا ہو گیا ہے اندریں حالات میرا قیاس یہ ہے کہ جہانِ قدیم کی وفات کا زمانہ قریب آگیا ہے۔

اقبال کی یہ پیشگوئی کچھ تو دوسری جنگ عظیم میں پوری ہو چکی ہے۔ اور

باقی ماندہ آئندہ دو تین سال میں پوری ہو جائے گی۔ کیونکہ وہ دن دُور نہیں جب روس کی مادّہ پرستی اور امریکہ کی زبردستی میں فیصلہ کُن جنگ ہوگی اور یہ دونوں طاغوتی طاقتیں آپس میں لڑ کر فنا ہو جائیں گی۔ یعنی مغربی تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرلے گی۔ اور اس خاکستر سے نئی دنیا پیدا ہوگی جس کی مخلوق، ابلیس کے بجائے، اللہ کی مرضی پر چلے گی کیا خوب کہا ہے اقبال نے :۔

خبر ملی ہے خدایانِ بحر و بر سے مجھے
فرنگ رہگذرِ سیلِ بے پناہ میں ہے

خوشامد

(پہلی)

یہ نظم اقبال نے ۱۹۲۵ء کے آخر میں لکھی تھی، جب قانونِ ہند مجریہ ۱۹۳۵ء کیا نیا نافذ ہوا تھا اور اس کی رو سے اہلِ ہند کو پہلی مرتبہ، صوبہ دار داخلی آزادی یا (پراونشل ایٹانمی) حاصل ہوئی تھی۔ کہتے ہیں کہ :۔

(۱) میں دنیا حاصل کرنے کے طریقوں سے پورے طور پر واقف نہیں ہوں لیکن اربابِ نظر کی صحبت میں کچھ دنوں بیٹھنے کی بدولت مجھے بھی اس کے حصول کا طریقہ معلوم ہوگیا ہے۔

(۲) اور وہ یہ ہے کہ اگر تو عہدہ، خطاب، جاگیر یا ٹھیکہ حاصل کرنا چاہتا ہے تو حکومت رائج الوقت کے وزیروں کی کوٹھیوں کا طواف کر، نیا دستور (قانون) نافذ ہو رہا ہے اور نئے دَور کا آغاز ہے۔

اس وقت دنیا حاصل کرنے کا بہترین موقعہ ہے، اور اس سے فائدہ اُٹھانے کی ایک ہی صورت ہے، اور وہ یہ ہے "کہ تو بھی حکومت کے وزیروں کی خوشامد کر"

(۳) لیکن خوشامد، بذاتِ خود ایک فن (آرٹ) ہے مثلاً اُلّو (OWL) کو اگر آپ اُلّو کہہ کر خطاب کریں گے یا اُس سے کہیں گے کہ جناب آپ تو "اُلّو" ہیں تو وہ ضرور ناراض ہو جائے گا۔ کیونکہ حقیقت ہمیشہ تلخ ہوتی ہے۔ (TRUTH IS ALWAYS BITTER) لہٰذا آپ اپنی گفتگو میں "آرٹ" پیدا کیجیے، یعنی خوشامد کیجیے۔ مگر خوبصورتی کے ساتھ۔ ادب کی موجودہ اصطلاح میں اس بات کو یوں ادا کرتے ہیں کہ "خوشامد بھی ایک فن ہے" یعنی یوں کہیے کہ آپ تورات کے "شہباز" ہیں۔

مناصب

(دوسری)

اس نظم میں اقبال نے ہندوستان کے اُن مسلمانوں کی غیر اسلامی ذہنیت پر ماتم کیا ہے جنہوں نے "بلند مناصب" کے لیے مذہب اور ملّت دونوں سے غدّاری کی کہتے ہیں کہ :۔

(۱) میں اُن مسلمانوں کی ضمیر فروشی پر ماتم کرتا رہتا ہوں جنہوں نے چند روزہ زندگی کے لیے اللہ اور اُس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے غدّاری کر کے انگریزوں سے جاگیریں خطاب یا عہدے حاصل کیے۔

(۲) اے مسلمان! میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تیرے ان عہدوں کو قائم رکھے

اور تو ساری عمر کتوں کے شکار میں مصروف رہے! کیونکہ تو نے ان نعمتوں کو اپنی خودی (ضمیر اور ایمان، جیسی بیش قیمت چیز) انگریز کے ہاتھ بیچ کر خریدا ہے۔ لیکن ایک بات میں تجھ سے ضرور کہوں گا کیونکہ ہر عقل مند آدمی اس کو جانتا ہے اور وہ یہ ہے کہ

(۴) کوئی حکمراں قوم، محکوم قوم کو حکومت میں شریک نہیں کیا کرتی۔ وہ خطاباتؔ دے کر یا عہدے عطا کر کے، صرف، غلاموں کی عقل و خرد خرید لیتی ہے تا کہ اپنے مقاصد کی تکمیل میں استعمال کر سکے۔

یورپ اور یہود

اس نظم میں اقبال نے یہ بتایا ہے کہ مغربی تہذیب بہت جلد فنا ہونے والی ہے، اور چونکہ یہودی قوم، دولت مند بھی ہے اور مذہب دوست بھی ہے اس لیے ممکن ہے کہ کلیسائی نظام اُن کے قبضہ میں آجائے یعنی سیاسی اور مذہبی اقتدار اُنہیں حاصل ہو جائے۔ کہتے ہیں کہ

(۱) یورپ کی حکومتوں کے عہدیدار، نیز وہ لوگ جو وہاں برسرِ اقتدار ہیں، اور تاجر پیشہ لوگ اور عوام سبھی عیش و عشرت میں غرق ہیں شراب زنا اور قمار ان کی زندگی کے اجزائے لاینفک بن گئے ہیں۔ اس

لہ یہی وجہ ہے کہ قائدِ اعظم محمدؐ علی جناح نے ساری عمر کوئی خطاب قبول نہیں کیا اس کا صلہ اللہ نے یہ دیا کہ آج ساری قوم بلکہ جماعتِ مودودی بھی تقسیم ہند سے پہلے انہیں مسٹر جناح لکھتی تھی اب انہیں "قائدِ اعظم" کے لقب سے یاد کرتی ہے۔

کا نتیجہ یہ ہے کہ عیش و عشرت کے باوجود، ان کو اطمینان قلبی حاصل نہیں ہے۔

(۲) یورپ کی فضا، مشینوں کے دھویں سے بالکل تاریک ہو گئی ہے۔ یعنی وہاں کے لوگوں کے دل، مادہ پرستی اور ہوس زر کی وجہ سے بالکل "سیاہ" ہو گئے ہیں۔ روحانیت اور تقویٰ کا کہیں نام و نشان تک نہیں ہے اندریں حالات یہ گناہوں کی بستی، اس لائق نہیں ہے کہ یہاں اللہ کی رحمت نازل ہو اس لیے یورپین تہذیب (جس پر پاکستانی حضرات اور خواتین دونوں مٹے ہوئے ہیں) چند روز کی مہمان معلوم ہوتی ہے۔ عنقریب اس کا خاتمہ ہو جائے گا اور بہت ممکن ہے کہ یورپ کے یہودی چونکہ وہ بے انتہا مالدار ہیں (اور طاقت دراصل مالدار طبقہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے) یورپ میں مذہبی اور سیاسی اقتدار حاصل کر لیں۔

نفسیات غلامی

اس نظم میں اقبال نے یہ بتایا ہے کہ جب کوئی قوم غلام ہو جاتی ہے تو اس قوم کے شعراء، علماء اور حکماء سب کی ذہنیت غلامانہ ہو جاتی ہے اور یہ لوگ ادب، علم اور فلسفہ کے مسائل کی تشریح اس انداز سے کرتے ہیں کہ قوم کے اندر غلامی کے جذبات پختہ تر ہو جائیں۔ کہتے ہیں کہ:-

(۱) غلام قوموں میں بھی شعراء، علماء اور حکماء پیدا ہوتے ہیں۔

(۲) اگرچہ یہ لوگ مختلف طبقات سے تعلق رکھتے ہیں لیکن مقصد ان سبھوں

(۳) کا ایک ہی ہوتا ہے اور وہ یہ کہ شیروں کو بزدلی اور مقابلہ سے فرار

کا سبق پڑھایا جائے تاکہ بہادری اور سرفروشی کا جذبہ پیدا نہ ہو سکے۔

(۴) یہ لوگ علمی اور مذہبی مسائل کی تاویل و تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ غلام اپنی غلامی پر راضی رہ سکیں اور حکمراں طبقہ کے خلاف علَم آزادی بلند نہ کر سکیں۔

بلشویک روس

(پہلی)

(۱) کہتے ہیں کہ کوئی شخص نہیں جانتا کہ یہ نظامِ کائنات کس طریق پر چل رہا ہے کیونکہ مشیتِ ایزدی کے طریقے فہم انسانی سے بالکل بالاتر ہیں۔

(۲) مثلاً وہی روسی عیسائی جو کلیسا کی حفاظت کو اپنے لیے باعثِ نجات سمجھتے تھے، اب خود کلیسائی نظام کو تباہ کر رہے ہیں۔

(۳) اللہ نے، روس کے ان لامذہبوں کے دل میں یہ بات ڈال دی ہے کہ عیسائیوں کے قائم کردہ کلیسائی نظام کو فنا کر دو۔

آج اور کل

(دوسری)

اس چھوٹی سی نظم میں اقبال نے حال اور مستقبل کے ربط کو واضح کیا ہے کہتے ہیں کہ:۔

(۱) جو قوم آئندہ زمانہ میں عروج کے لیے آج تیاری نہیں کرتی وہ کبھی آئندہ زمانہ میں سربلندی حاصل نہیں کر سکتی۔ جو قوم کوشش نہیں کرتی وہ کل کامیاب بھی نہیں ہو سکتی۔

(۲) جو قوم حال کی قدر نہیں کرتی اور موجودہ وقت کو ضائع کر دیتی ہے وہ مستقبل میں برسرِ اقتدار نہیں ہو سکتی اور آئندہ زمانہ میں کوئی ہنگامہ برپا نہیں کر سکتی۔ غرض کسی قوم کے مستقبل کا اندازہ اُس قوم کی موجودہ حالت سے بآسانی کیا جا سکتا ہے۔ جو قوم آج غافل ہے کل ضرور ناکام ہو گی یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم آج کا دن تو سونے میں ضائع کر دیں اور کل میدان جنگ میں کامیاب ہو جائیں۔

مشرق

(پہلی)

اس نظم میں اقبال نے یہ بتایا ہے کہ مشرقی قوموں کو ابھی تک کوئی صحیح رہنما نصیب نہیں ہوا۔ کہتے ہیں کہ:۔

(۱) میرے کلام اور پیغام کی بدولت، عوام کے اندر تو کچھ بیداری پیدا ہو گئی ہے یعنی مغربی اقوام کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہو گیا ہے لیکن عوام کا یہ جذبۂ حریت ابھی تک کسی رہنما کی تلاش کر رہا ہے۔

(۲) مشرقی قوموں کو، مغرب کی غلامی سے آزاد کرنے کی اہلیت مصطفیٰ کمال پاشا میں تھی نہ رضا شاہ میں، اس لیے مشرقی قومیں ابھی تک کسی صحیح رہنما

کی تلاش میں سرگراں ہیں۔

واضح ہو کہ مصطفیٰ کمال نے ترکوں کو، اور رضا شاہ نے ایرانیوں کو مغرب کی غلامی سے آزاد کرنے کی جو کوششیں کیں وہ سب ناقص اور سطحی تھیں ان دونوں حکمرانوں نے غلطی سے یہ سمجھ لیا کہ اگر ہم ترکوں اور ایرانیوں کو مغربی تمدن کے سانچے میں ڈھال دیں تو یہ لوگ آزاد ہو جائیں گے حالانکہ سیاسی غلامی سے نجات پانے کے لیے سب سے پہلے ذہن کو آزاد کرنا ضروری ہے اور ذہنی تربیت کا فرض ان دونوں میں سے کسی نے انجام نہیں دیا۔

(۳) کہتے ہیں کہ میں نے مشرقی قوموں کو بیدار کرنے کے لیے جو کوشش کی ہے، مغربی اقوام کی نگاہ میں یہ بہت بڑا جرم ہے یعنی ان کے زاویۂ نگاہ سے میں نے بہت بڑا قصور کیا ہے جس کی سزا ضرور ملنی چاہیے لیکن ان دشمنانِ دین کو ابھی تک میرے پیغام کی تاثیر کو فنا کرنے کے لیے کوئی ذریعہ یا طریقہ ہاتھ نہیں آیا ہے اس لیے یہ قومیں رات دن اس کوشش میں لگی ہوئی ہیں کہ کوئی ایسی تحریک جاری کریں جس کی بنا پر مسلمانوں کی توجہ، میرے پیغام سے ہٹ کر غیر ضروری اُمور پر مبذول ہو جائے، اور وہ غلامی سے نجات پانے کی کوئی مؤثر کوشش نہ کر سکیں۔

نوٹ:۔ اشتراکی "ترقی پسند" ادیبوں کی اقبال دشمنی کا باعث بھی یہی جذبۂ انتقام ہے۔

سیاستِ افرنگ

(دوسری)

اس چھوٹی سی نظم میں اقبال نے ہمیں بڑے دلپذیر انداز میں یہ بتایا ہے کہ فرنگی سیاست سراسر شیطانی کاروبار ہے۔ اس نظم کا اسلوب بیان اس لیے مؤثر ہو گیا ہے کہ اقبال نے خدا سے خطاب کیا ہے کہتے ہیں کہ

اے خدا! یہ مغربی سیاست بھی خدائی کی مدعی ہے، فرق اتنا ہے کہ تیری پرستش امیر اور غریب دونوں کرتے ہیں، لیکن اس کے پجاری صرف امیر اور رئیس ہیں اور دوسرا فرق یہ ہے کہ تو نے آگ سے صرف ایک ابلیس بنایا لیکن اس سیاست نے خاک سے لاکھوں ابلیس بنا ڈالے مطلب یہ ہے کہ ہر فرنگی سیاستداں، شیطان کا مرید ہے اور اللہ کا منکر ہے۔

خواجگی

(پہلی)

اس نظم میں اقبال نے یہ بتایا ہے کہ دنیا کا رنگ جو آج سے دو ہزار سال پہلے تھا وہی آج ہے جس طرح پہلے آقا اور غلام کا طبقہ موجود تھا، آج بھی موجود ہے۔ جس طرح قدیم زمانہ کے دولت مند روپے کے زور سے انسانوں کو اپنا غلام بناتے تھے اسی طرح آج بھی بناتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ:۔

(۱) دنیا کے طور طریقے آج بھی وہی ہیں جو صدیوں پہلے تھے۔ دنیا کی ظاہری شکل بدل گئی ہے لیکن انسان کی خو بالکل نہیں بدلی۔ مثلاً پہلے زمانہ میں

اگر مذہبی پیشوا، لوگوں کو اپنا غلام بناتے تھے تو موجودہ زمانہ میں یہ "نیک کام" اہلِ سیاست انجام دے رہے ہیں۔

(۲) آج بھی یہی کیفیت ہے کہ یا تو اہلِ سجادہ یعنی مذہبی پیشوا لوگوں پر حکمران ہیں، یا اہلِ سیاست یعنی اربابِ حکومت لوگوں کو اپنا غلام بنائے ہوئے ہیں۔ اور اس میں نہ تو ان کی پیری کو خاص دخل ہے نہ ان کی میری (حکومت) کو۔ قصہ اصل میں یہ ہے کہ عوام الناس ہزاروں سال سے غلامی کے خوگر ہیں۔

(۳) اور جب غلام، خوئے غلامی میں پختہ ہو جاتے ہیں تو پھر خواجگی میں کوئی دشواری باقی نہیں رہتی۔ بنی آدم غلامی کے عادی ہو چکے ہیں، جس شخص میں تھوڑی سی بھی "عقل" ہوتی ہے وہ مذہبی یا سیاسی قیادت کا لبادہ اوڑھ کر عوام کو بآسانی اپنا غلام بنا لیتا ہے۔ کوئی "صالح قیادت" کا جال بچھاتا ہے تو کوئی جناح کے نام سے اپنی دوکان چمکاتا ہے چنانچہ ہماری بڑی بوڑھیاں اقبال کے اسی پیش کردہ نکتہ کو، اس آسان طریق سے بیان کیا کرتی تھیں:۔

دنیا کو ٹھگو مکر سے، روٹی کھاؤ گھی شکر سے

غلاموں کے لیے

(دوسری)

اس نظم میں اقبال نے یہ نکتہ بیان کیا ہے کہ اگر کسی غلام کو آزادی حاصل کرنے کی تمنا ہو تو اس کی صورت یہ ہے کہ اپنے اندر "ذوقِ یقین" پیدا کرے چنانچہ

بانگِ درا میں لکھتے ہیں:۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

اب سوال یہ ہے کہ یہ ذوقِ یقین کیا چیز ہے؟ خود اقبال نے اس موضوع پر اس قدر لکھا ہے کہ ایک مقالہ مرتب ہو سکتا ہے۔ دو لفظوں میں یوں سمجھ لیجئے کہ اس قوم کے افراد اپنے اندر، یہ عزم بالجزم پیدا کر لیں کہ دنیا کی کوئی طاقت ہم کو غلام نہیں رکھ سکتی۔ ہم ضرور بالضرور آزادی حاصل کریں گے۔ دراصل انسان کی قوتِ ارادی ذوقِ یقین کا لازمی نتیجہ ہے کہتے ہیں کہ:۔

(۱) میں نے مشرقی اور مغربی فلسفہ کے مطالعہ سے ایک نکتہ اخذ کیا ہے جو غلاموں کے لیے اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔

(۲) دین، فلسفہ، فقر و درویشی، سلطانی و حکمرانی غرضیکہ زندگی کے ہر شعبہ میں کامیابی کے لیے عقیدہ کی پختگی بہت ضروری ہے۔

اس اصل کی روشنی میں اگر غلام قوم کے افراد آزادی کے طالب ہوں۔ تو انہیں سب سے پہلے اپنے عقائد کو پختہ کر لینا چاہیئے۔ یعنی پہلے یہ یقین پیدا کرنا چاہیئے کہ آزادی ہمارا پیدائشی حق ہے کسی قوم کو حق حاصل نہیں کہ ہمیں غلام بنائے۔ اس لیے ہم ضرور غلامی کی زنجیریں توڑ کر رہیں گے اس محکم یقین کے بعد عملِ پیہم کی مدد سے کامیابی حاصل ہو سکتی ہے واضح ہو کہ قرآن مجید نے یقین محکم کو ایمان اور عمل پیہم کو عمل صالح سے تعبیر کیا ہے۔

(۳) اور جو قوم اپنے عقائد میں، پختگی پیدا نہیں کرتی، اس کی گفتگو میں کسی قسم کی تاثیر نہیں ہوتی اور اس کے اعمال میں کوئی سرگرمی

یا طاقت پیدا نہیں ہو سکتی۔

نوٹ :۔ حضرات صحابہ کرام رضی کے اقوال میں جو تاثیر اور اعمال میں جو سرگرمی پائی جاتی تھی وہ سب عقیدہ کی پختگی کا نتیجہ تھی آج اگر مسلمان یہ عزم کرلیں کہ ہم کشمیر کے مسلمانوں کو آزاد کرا کے رہیں گے تو انشاء اللہ وہ بہت جلد اپنے ارادہ میں کامیاب ہو جائیں گے ہمارے مرض کی دوا نہ لندن میں ہے نہ لیک سکسیس میں بلکہ خود ہمارے اندر موجود ہے۔

اہلِ مصر سے

اس نظم میں اقبال نے مسلمانوں کو یہ بتایا ہے کہ کسی نظامِ زندگی کو رائج کرنے کے لیے محض عقل کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ قوت بھی ضروری ہے اگر قوت نہ ہو تو دستور العمل یا معاہدہ یا آئین کی قیمت ردّی کاغذ کے پرزہ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ کہتے ہیں کہ :۔

(۱) ابوالہول نے، جو کائنات کے قدیم اسرار و رموز سے واقف ہے یہ نکتہ مجھے سمجھایا کہ :۔

(۲) جس چیز سے قوموں کی تقدیر یکدفعتہً بدل جاتی ہے وہ بے بہا چیز، قوت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے اور یہ قوت وہ چیز ہے کہ حکماء کی عقل بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

بقول شخصیکہ ع

بیکار ہے سب فلسفہ بندوق کے آگے

(۳) اگرچہ قوت کی صورت اور نوعیت ہمیشہ بدلتی رہتی ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ قوت کی ضرورت ہر زمانہ میں رہی ہے اور رہے گی۔ یہی قوت (POWER) کبھی حضرت موسیٰ کے عصا کی شکل میں نمودار ہوتی ہے کبھی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تلوار کی صورت میں نمایاں ہوتی ہے۔

قوت کے بغیر آپ بہتر سے بہتر نظامِ حیات کو بھی دنیا میں نافذ نہیں کر سکتے[1]۔ اسی لیے قرآن مجید نے جہاں مومنوں کو بہترین اُمت قرار دیا ہے وہاں ان کی ایک صفت یہ بھی بیان کی ہے کہ ان میں نیکی کا حکم دینے کی طاقت ہو گی اگر یہ طاقت نہ ہو تو پھر مومن، مومن نہیں رہتا بلکہ راہب بن جاتا ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ	اے مسلمانو! تم بہترین قوم ہو جو انسانوں کی
اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ	بھلائی کے لیے پیدا کی گئی ہے اور تمہاری
تَأْمُرُوْنَ	خصوصیت یہ ہے کہ تم بھلائی اور نیکی کا
بِالْمَعْرُوْفِ الخ	حکم کرتے ہو۔

---

[1] پاکستان کا مطالبہ، اقبال نے سب سے پہلے، اور مسلمانانِ ہند نے ان کی تعلیم سے متاثر ہونے کے بعد ۱۹۴۰ء میں اسی بنیاد اور اسی نکتہ پر کیا تھا کہ غیر منقسم ہندوستان میں، شرعی نظامِ حیات کے نفاذ کی کوئی صورت ممکن نہیں ہے کیونکہ اس کے لیے طاقت یا قوت کی ضرورت ہے اور قوت تمام تر اکثریت کے قبضہ میں ہوگی "کافر" جناح اس نکتہ کو سمجھ گیا "مومن" حسین احمد نہ سمجھ سکا۔ شاید اقبال نے اسی بات کو مدِ نظر رکھ کر یہ کہا تھا۔

حقیقت را بہ رندے فاش کردند   کہ ملا کم شناسد رمزِ دیں را!

اب یہ بات ایک معمولی عقل کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ نیکی کا حکم وہی شخص دے سکتا ہے جس میں حکم دینے کی قوت ہو۔

حضرت اکبر الٰہ آبادی نے اسی نکتہ کو اس شعر میں بیان کیا ہے۔

نہو مذہب میں گر، زورِ حکومت
تو وہ کیا ہے نرا اک فلسفہ ہے

میں نے اس کا "فارمولا" بنایا ہے، جو حسبِ ذیل ہے:-

حق مع القوۃ	=	دین یا مذہب
حق بغیر القوۃ	=	فلسفہ یا تصوف
TRUTH PLUS POWER	=	RELIGION
TRUTH MINUS POWER	=	PHILOSOPHY

ابی سینیا

جب ۱۸ / اگست ۱۹۳۵ء کو اخباروں میں یہ خبر شائع ہوئی کہ اٹلی نے بلاوجہ ابی سینیا (ABYSINIA) پر حملہ کر دیا ہے تو علامہ کو بہت افسوس ہوا اور اُنہوں نے اپنے تاثرات قلبی کا اس طرح اظہار کیا۔

(۱) یورپ کی مُردار خور (بلکہ حرام خور) حکومتوں نے، اٹلی کے اس ظالمانہ اقدام کی کوئی مذمت نہیں کی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان شیطانی حکومتوں نے دل میں یہ سوچا ہے کہ جب اطالیہ اس ملک کو فتح کرے گا تو ہم بھی اپنا حصّہ لینے پہنچ جائیں گے۔ لیکن یورپ کے اِن گدوں کو ابھی یہ خبر نہیں ہے کہ ابی سینیا (حبشہ) کی لاش اس قدر زہر آلود ثابت ہوگی کہ جو

کھائے گا وہ مر جائے گا۔

واضح ہو کہ اقبال نے یہ پیشگوئی ۱۹۳۵ء میں کی تھی جبکہ دوسری جنگِ عظیم کے آثار کہیں نمایاں نہیں تھے لیکن ان کی یہ پیشگوئی حرف بحرف پوری ہوگئی۔

ا۔ مسولینی کو، جس نے ایک بیگناہ ملک پر چڑھائی کی تھی سپاہی کی موت نصیب نہیں ہوئی بلکہ وہ ایک کُتّے کی موت مارا گیا۔

ب۔ علاوہ بریں چار سال کے بعد تمام اقوام یورپ جنہوں نے اس ظلم کا تماشا دیکھا تھا اور ظالم کی مذمت سے چشم پوشی کی تھی، قہرِ الٰہی میں گرفتار ہو گئیں۔

(۲) اس میں کوئی شک نہیں کہ تہذیبِ مغرب اپنے انتہائی عروج کو پہنچ گئی ہے لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس نام نہاد تہذیب نے اہلِ یورپ کو شرافت سے بالکل معرا کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان مہذب قوموں نے لوٹ مار اور قتل و غارت کو اپنا ذریعۂ معاش بنا رکھا ہے۔ جس طرح بھیڑیا، بیگناہ بھیڑ بکریوں کی تلاش میں رہتا ہے اُسی طرح یہ اقوام بیگناہوں کا خون بہاتی رہتی ہیں۔

(۳) افسوس! اٹلی نے حبشہ پر حملہ کر کے کلیسا (مسیحیت) کی عزت سر بسر خاک میں ملا دی اور پیرِ کلیسا یعنی پوپ آف روم کو بھی اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ اٹلی کا یہ فعل، انسانیت کی توہین ہے۔

نوٹ:- اقبال نے پوپ سے خطاب کر کے دراصل اس اعتراض کا جواب دیا ہے جو کلیسا اسلام پر کیا کرتی تھی کہ اسلام غارتگری کی تعلیم دیتا ہے (حالانکہ اسلام مسلمانوں کی بداعمالیوں کا ذمہ دار نہیں

ہے؛ علامہ کا مطلب یہ ہے کہ پوپ، اٹلی کے اس ظالمانہ اقدام کی کیا توجیہہ کرے گا؟ یہی نا کہ مسیحیت، عیسائیوں کے افعالِ بد کی ذمہ دار نہیں ہے تو یہی جواب ہم بھی دے سکتے ہیں۔

ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام

اس نظم میں اقبال نے، ایک دلکش انداز میں فرنگی سیاست کو بے نقاب کیا ہے۔ عنوان کا مطلب یہ ہے کہ یورپ کی حکومتیں، بلا استثنا، سب کی سب، شیطان کی مطیع ہیں اور اُسی کی معنوی اولاد ہیں۔ کہتے ہیں کہ

(۱) ابلیس نے اپنے فرزندوں کو یہ حکم دیا ہے کہ ہندوستان کے برہمنوں کو سیاسی مسائل میں اس حد تک اُلجھا دو کہ وہ اپنے مذہب کے اصُول سے بیگانہ ہو جائیں۔

واضح ہو کہ ہندوؤں کے مذہب میں "دیا" (یعنی دوسروں پر مہربانی کرنا) سب سے بڑی نیکی ہے۔ چنانچہ اُن کی بعض مذہبی کتابوں میں یہ مقولہ درج ہے۔ کہ:-

"دیا ہی دھرم ہے" لیکن ابلیسی سیاست نے اُن کو مذہب سے اس درجہ بیگانہ کر دیا ہے کہ آج یہ لوگ ہندوستان میں بے گناہ مسلمانوں کا خون بہا رہے ہیں اور اس غیر انسانی فعل کو اپنے وطن کی سب سے

علامہ مرحوم نے ۱۹۲۶ء میں مجھ سے فرمایا تھا کہ اگر صرف پیشگوئیوں کو کسی شخص کے دعویٰ نبوت کی صداقت کا معیار قرار دیا جا سکتا ہے تو پھر ان لوگوں کو چاہیئے کہ مجھے بھی "ظلی نبی" تسلیم کر لیں۔ ۱۲

بڑی خدمت سمجھتے ہیں۔

(۲) مسلمان اگرچہ فاقہ کش ہے لیکن اس کے باوجود ہر وقت مذہب کے نام پر سر کٹانے کے لیے تیار رہتا ہے۔ اس لیے اس کے دل سے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت بالکل نکال دو۔

(۳) عربوں کو خوبصورت موٹریں، ریشمی کپڑے اور دیگر سامان عیش و عشرت (خصوصاً ہر قسم کے اعلیٰ سگرٹ) کثیر تعداد میں سپلائی کرو اور اُن کے خیالات کو، اپنے سانچہ میں ڈھال دو۔ تاکہ حجاز اور یمن سے اسلام بالکل خارج ہو جائے۔ اور یہ خطہ بھی دوسرا عراق اور مصر بن جائے۔

(۴) اب رہے افغانی، تو ان کا علاج یعنی اُن کی دینی غیرت کو ختم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ یہ لوگ ملاؤں کے کہنے پر چلتے ہیں اس لیے سرحد اور آزاد علاقہ اور افغانستان میں جس قدر علماء ہیں سب کا خاتمہ کر دو۔

(۵) باقی ماندہ مسلمانوں کو ان کی قومی روایات سے بیگانہ کر دو، اس کی صورت یہ ہے کہ ایسا لٹریچر شائع کرو جس کے مطالعہ سے مسلمان نوجوان، اپنی ملّی روایات اور اپنے بزرگوں کے طور طریقوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگیں[1]۔ اور اسی قسم کی کتابیں، ان کے نصاب تعلیم میں داخل کر دو۔

ابلیس اس تلقین کو ایک تشبیہہ کے ذریعہ سے ذہن نشین کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ اگر آہو کو مرغزار ختن سے نکال کر، کسی دوسرے ملک میں رکھا جائے، تو وہ زندہ تو رہے گا لیکن اس کی ناف میں وہ جوہر پیدا نہ ہو سکے گا جس کی وجہ سے وہ ساری دنیا میں مشہور ہے، اور تمام دنیا

[1] نام نہاد "ترقی پسند" ادیب، اس ابلیسی فرمان پر نہایت خلوص کے ساتھ عمل کر رہے ہیں۔ ۱۲

کے آہوؤں پر تفوق رکھتا ہے۔ اسی طرح اگر تم (اہلِ انگلستان و فرانس و اطالیہ وغیرہ) مسلمانوں کو ان کی ملی روایات سے بیگانہ بنادو، تو وہ حیوانات ناطق کی حیثیت سے زندہ تو رہیں گے لیکن ان کے دل میں وہ سوز پیدا نہ ہو سکے گا جس کی بدولت وہ کفر کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ان کا وجود اور عدم دونوں یکساں ہو جائیں گے، بایں معنی کہ وہ تمہارے یعنی میرے قائم کردہ نظام کو درہم برہم نہیں کر سکیں گے، بلکہ صاف لفظوں میں اس "صداقت" کا اعلان کریں گے کہ ۱۳۵۰ سال کا فرسودہ نظام اس ترقی یافتہ دور میں ہمارے لیے کارآمد نہیں ہو سکتا۔

(۶) اقبال کا جُرم یہ ہے کہ وہ مسلمان نوجوانوں کے دل میں اسلام کی "تڑپ پیدا کر رہا ہے اور اُنہیں عشق رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کا درس دے رہا ہے۔ لہٰذا اس کو یہ سزا دو کہ وہ چمن سے نکل جائے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ کمیونسٹ ادیبوں اور شاعروں کو اقبال کی تحقیر اور اس کے کلام اور پیغام کی تردید و تنقیص پر آمادہ کر دو۔

نوٹ:۔ واضح ہو کہ پاکستان کے کیونسٹ ادیب نہایت منظم طریقہ سے ابلیس کے اس مشورہ پر عمل کر رہے ہیں۔ چنانچہ کوئی تو یہ کہتا ہے کہ "اقبال فاشزم کا حامی تھا" مسلمانوں کو تیرہ سو سال کے غیر مہذب زمانہ کی طرف لیجانا چاہتا تھا۔ اور کوئی یہ کہتا ہے "اقبال کا پیغام قوموں کے لیے بمنزلۂ افیون ہے کیونکہ وہ ان کو مذہب اور خدا کا پابند بناتا ہے۔"

مقصد ان تنزل پسندوں کا یہ ہے کہ اقبال پر ایسے ایسے الزامات عائد کرو اور اس کے کلام کو اس رنگ میں پیش کرو کہ مسلمانوں ہی

کو نہیں بلکہ ہر سمجھدار آدمی کو اس سے نفرت ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ کمیونسٹ ادیب، جب اقبال پر کچھ لکھتا ہے، تو جب تک اُس پر رجعت پسندی کا الزام عائد نہیں کر لیتا، اپنے مقالہ کو مکمل نہیں سمجھتا۔ اور ارباب نظر سے یہ حقیقت مخفی نہیں ہے کہ کمیونزم کی لغت میں کسی شخص کی مذمت کے لیے "رجعت پسند" سے شدید تر اور کوئی لفظ نہیں ہے۔ میں اپنے اس دعوے کے ثبوت میں مسٹر عزیز احمد کی تازہ ترین تالیف، موسومہ "اقبال۔ نئی تشکیل" صفحہ ۵۱۷ سے ایک اقتباس پیش کرتا ہوں۔

"جمال الدین افغانی کی زبانی، اقبال نے ملوکیت اور اشتراکیت پر ایک ساتھ حملہ کیا ہے۔ یہ ایسی غلطی ہے جو جمال الدین افغانی سے سرزد ہو سکتی ہے۔ مگر الفاظ تو بہر حال اقبال کے ہیں اور اقبال کو اس مقام پر رجعت پسندی کے الزام سے بری کرنا مشکل ہے۔"

واضح ہو کہ یہ الزام وہ شخص عائد کر رہا ہے جس نے اپنی کتاب میں اشتراکی ادیبوں کے مقابلہ میں کئی مقامات پر اقبال کی حمایت کی ہے لیکن بہر حال چونکہ مصنف خود اشتراکیت بلکہ اشتمالیت کا مقلد ہے اس لیے اقبال پر رجعت پسندی کا الزام عائد کرنے سے وہ خود بھی باز نہ رہ سکا غالباً اس تصریح کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ اقبال کا سب سے بڑا جُرم یہی ہے کہ اس نے ملوکیت کے ساتھ اشتراکیت پر بھی "حملہ" کیا ہے اور یہ جرم مذہب اشتراکیت میں ناقابل معافی ہے۔ اقبال ہی پر کیا منحصر ہے جو مسلمان بھی اشتراکیت پر اعتراض کرے گا وہ ان ترقی پسندوں کی رائے میں "رجعت پسند" قرار پائے گا۔ اور طرفہ تماشہ یہ ہے کہ اس تعصب اور تنگ نظری کے باوجود یہ اشتراکی ادیب اپنے آپ کو "ترقی پسند" سمجھتے ہیں حالانکہ اگر ترقی پسندی اسی کا نام ہے تو

خدا معلوم تنزل پسندی کسے کہتے ہیں۔

جمعیتِ اقوامِ مشرق

(پہلی)

اقبال نے اس نظم میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اگر مسلمانانِ عالم (مسلمانوں کی حکومتیں) متحد ہو جائیں تو دنیا میں انقلاب برپا ہو سکتا ہے کہتے ہیں کہ :۔

(۱) میں نے مانا کہ مغربی اقوام نے سائنس میں بڑی ترقی کر لی ہے اور انسانوں کے علاوہ آج عناصر فطرت بھی اُن کے محکوم ہیں لیکن اگر "فلک پیر" کے خالق کی نگاہ بدل جائے تو ان اقوام کی سطوت و شوکت کا ایک آن میں خاتمہ ہو سکتا ہے۔

(۲) اور ان اقوام نے ایشیائی قوموں کو غلام بنانے کا جو منصوبہ باندھا ہے وہ سب یونہی دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔

(۳) اس کی صورت یہ ہے کہ مسلمان وہ طریقہ اختیار کریں جس کی بنا پر خالقِ کائنات کی نگاہ بدل سکتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ تمام مسلمانانِ عالم متحد ہو جائیں۔ اور جب وہ اپنی حالت کو بدلنے کی کوشش کریں گے تو اللہ تعالیٰ بھی اُن کی مدد فرمائے گا۔ کیونکہ اُس کا قانون (سنۃ اللہ) یہی ہے کہ جب تک کوئی قوم خود اپنی زندگی کی گہرائیوں میں انقلاب پیدا نہیں کرتی۔ اللہ بھی اس قوم کی تائید نہیں فرماتا۔

پس اگر وہ طہران کو عالم مشرق کا جنیوا بنا لیں یعنی جس طرح مغربی اقوام

نے اپنی جمعیت بنائی ہے (اشارہ ہے لیگ آف نیشنز کی طرف جس کا مرکز جنیوا تھا) وہ بھی اپنی جمعیت بنا لیں تو گمان غالب یہی ہے کہ دنیا میں ایک انقلاب برپا ہو سکتا ہے۔ یعنی کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے گی۔

سلطانیِ جاوید

(دوسری)

اس نظم میں اقبال نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ افراد کی سلطنت ہمیشہ قائم نہیں رہتی لیکن ان کی جد وجہد کی داستان، ہر زمانہ میں لوگوں سے خراج تحسین وصول کرتی رہتی ہے مثلاً اشوک نے تمام ہندوستان فتح کر کے ایک عظیم الشان سلطنت قائم کر دی تھی، اگرچہ وہ تو اس کی وفات کے کچھ عرصہ کے بعد ختم ہو گئی لیکن اُس نے بنی آدم کی بہتری کے لیے جو جد وجہد کی تھی، اس کو صفتِ دوام حاصل ہو گئی۔ اسی طرح بطلِ اسلام غازی صلاح الدین ایوبیؒ نے جو سلطنت قائم کی تھی۔ وہ تو مٹ گئی لیکن اسکا کارنامہ ابھی تک زندہ ہے وہ کارنامہ کیا تھا؟ اس کی وہ جد وجہد) جو اُس نے اسلام کی سربلندی کے لیے کی تھی۔ غرض فطرت کو سلطانیِ جاوید پسند نہیں ہے۔ "خارا شکنی" پسند ہے وہ سلطنتوں کو مٹاتی رہتی ہے۔ لیکن جد وجہد کے ثمرات اور کارناموں کو باقی رکھتی ہے۔

(۱) اقبال کہتے ہیں کہ اگرچہ مجھے اللہ نے یہ لیاقت عطا فرمائی ہے کہ میں بات کی تہ کو پہنچ جاتا ہوں جس طرح غواص سمندر کی تہ میں پہنچ کر موتی نکال لاتا ہے۔

(۲) لیکن میں سیاست کی گہرائیوں میں اس لیے غوطہ زن نہیں ہوتا کہ فطرت کی نظر میں سلطنتوں کا قیام کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ سلطنتیں بنتی رہتی ہیں۔ اور بلبلوں کی طرح ٹوٹتی رہتی ہیں پس جو شئے بذات خود پائیدار نہیں اس میں غور و خوض بھی چنداں مفید نہیں۔

جس طرح عقلمند آدمی کی نگاہ میں شعبدوں کی کوئی وقعت نہیں اسی طرح میری نظر میں سلطنتوں کی کوئی قیمت نہیں۔ جس طرح ایک شعبدہ باز تھوڑی دیر کے لیے ہتھیلی پر سرسوں جما کر، ناظرین کو خوش کر دیتا ہے لیکن دراصل اُس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ اسی طرح سلطنتیں بنتی رہتی ہیں اور بگڑتی رہتی ہیں۔

(۳) مثال کے طور پر ملوکیت پرویز پر غور کرو۔ آج دنیا میں پرویز کی سلطنت کا وجود نہیں ہے اور سوائے مورخوں کے کوئی اس کا نام بھی نہیں جانتا۔ لیکن فرہاد کی خارا شکنی (جد و جہد) کا قصہ آج بھی زبان زد خلائق ہے۔

جمہوریت

(پہلی)

اس نظم میں اقبال نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ اگرچہ آج کل دنیا میں ہر شخص جمہوریت کا ثنا خواں ہے اور اس کو بہترین طرز حکومت سمجھتا ہے لیکن دراصل یہ کوئی قابلِ تعریف و تحسین طریق حکومت نہیں ہے کیونکہ اس میں سب سے بڑا اور بنیادی نقص یہ ہے کہ اس طرز حکومت میں انسانوں کی عقل و خرد کی کوئی قیمت نہیں ہے۔

مثلاً عقل کا تقاضا یہ ہے کہ دس عقلمند آدمی ایک ہزار بلکہ ایک لاکھ بیوقوفوں پر فوقیت رکھتے ہیں لیکن اس طرزِ حکومت میں یہ نہیں دیکھا جاتا کہ دس۱۰ عقلمند آدمی کیا کہتے ہیں ؟ بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ نوسٹھ۹۰ آدمی، خواہ اِن میں ایک بھی عقلمند نہ ہو، کیا کہتے ہیں۔ یعنی انسانوں کو شمار کیا جاتا ہے ان کی بات کو وزن نہیں کیا جاتا، اقلیت کی بات یا رائے خواہ کتنی ہی معقول کیوں نہ ہو مردود ہے، اور اُس کے مقابلہ میں اکثریت کی رائے خواہ وہ کتنی ہی غیر معقول کیوں نہ ہو، مقبول ہے۔ جمہوری طرز حکومت میں اس سے بحث نہیں ہوتی کہ حق و صداقت کس طرف ہے، بلکہ وہاں اس بات کو دیکھا جاتا ہے کہ اکثریت کس طرف ہے۔

اقبال کی نظم کا مطلب تو یہاں ختم ہو گیا، اب میں ایک بات کا اور اضافہ کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ جمہوری طرزِ حکومت میں، دراصل حکومت جمہور کی نہیں ہوتی (اگرچہ بظاہر ایسا ہی نظر آتا ہے کہ جمہوری حکومت میں جمہوری حکومت کرتے ہیں، بلکہ اُن گنتی کے چند افراد کی ہوتی ہے جو:۔

(ا) اپنی دولت، عہدہ، اثر و رسوخ، جاگیر یا خاندانی تفوق کی بنا پر، عوام (جمہور) کے ووٹ (رائے) خرید سکیں۔ یا جو

(ب) اپنی عیاری، زمانہ سازی یا چرب زبانی کی بدولت جمہور کو اپنی ہمدردی یا خیر خواہی یا اپنی صالحیت اور روحانیت کا یقین دلا سکیں یہ الفاظِ دگر انہیں "سبز باغ" دکھا سکیں۔ یا جو

(ج) کسی اصول یا اخلاقی ضابطہ کے پابند نہ ہوں مثلاً تقسیم ہند سے پہلے جس پاکستان کے قیام کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا چکے ہوں، اور اس کو مسلمانوں کے لیے "سمِ قاتل" قرار دے چکے ہوں،

قیامِ پاکستان کے بعد، اسی سمِ قاتل کو بے تکلف "آبِ حیات" سمجھنے لگیں اور خدائی فوجدار بن کر اس کی زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے رات دن پوسٹر بازی اور تقریروں میں مصروف رہیں اور محتاجِ اصلاح ہونے کے باوجود، قوم کی اصلاح کے اجارہ دار بن جائیں اور کبھی اس حقیقت کے سمجھنے کی کوشش نہ کریں کہ ؎

او خویشتن گم است کرا رہبری کند

یورپ اور سوریا

(دوسری)

اس نظم میں اقبال نے بنی آدم کی ایک مشہور خصوصیت یعنی احسان فراموشی کو ایک مثال کے ذریعہ سے سمجھایا ہے۔ کہتے ہیں کہ

(۱) ملکِ شام نے فرنگیوں کو ایک نبی (حضرت عیسیٰ) عطا کیا جس نے دُنیا کو پاکیزگی، ہمدردی اور خیر خواہی کا درس دیا۔

(۲) لیکن فرنگیوں نے جب اس ملک پر قبضہ کیا تو ان اصولوں کی ترویج کے بجائے، اہلِ شام کو دنیا کی تین بڑی نعمتیں عطا کیں یعنی شراب، جوا، اور فاحشہ عورتیں۔ بالفاظِ دگر نیکی کا بدلہ بدی سے دیا۔

نوٹ:۔ ملکِ شام ہی پر کیا منحصر ہے ان منحوس فرنگیوں کے قدم جس ملک میں بھی گئے اُنہوں نے انہی نعمتوں کو رائج کیا۔ دُور جانے کی کیا ضرورت ہے پاکستان ہی کو دیکھ لیجئے۔

مسولینی

اس نظم میں اقبال نے مسولینی کے کرکیٹر یا طرزِ عمل یا اس کے وضع کردہ نظامِ حکومت (FASCISM) کی حمایت نہیں کی ہے بلکہ اسکے پردہ میں اسکے مخالفوں کی عیاری کا راز فاش کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ جو مغربی قومیں اس کو موردِ الزام بنا رہی ہیں۔ وہ اُس سے بڑھ کر ظالم ہیں بلکہ اس کو ان پر ایک پہلو سے تفوق حاصل ہے وہ یہ کہ مسولینی اپنی ملوکیت کو جمہوریت کے پردہ میں چھپا کر دنیا کو دھوکہ نہیں دیتا۔ (اگر فاسزم مذموم ہے تو امپیریلزم بھی مذموم ہے)

نوٹ:۔ اس موقع پر مجھے اکبر الہ آبادی کا ایک شعر یاد آگیا جو میرے مطلب کو بڑی خوبی کے ساتھ واضح کر سکتا ہے لکھتے ہیں:۔

اُسے اقرارِ اغوا ہے، یہ اغوا کو چھپاتے ہیں
علیہ اللعن ہے شیطان، لیکن ان سے اچھا ہے

یعنی شیطان اور انگریز دونوں، انسانوں کو راہِ راست سے بھٹکاتے ہیں لیکن شیطان کو انگریزوں پر ایک فضیلت حاصل ہے وہ یہ کہ

اُسے اقرارِ اغوا ہے، یہ اغوا کو چھپاتے ہیں

(۱) مسولینی کہتا ہے کہ یورپ کی جمہوریت نواز قومیں بلاوجہ مجھ سے ناراض ہیں حالانکہ میرا طرزِ عمل اگر مذموم ہے تو اُن کا طرزِ عمل بھی مذموم ہے۔

(۲) تم اور میں، ہم دونوں، ایک ہی تہذیب کے علمبردار ہیں تمہاری سیاست بھی لادین ہے میری سیاست بھی لادین ہے۔ حقیقت ایک ہی ہے صرف طریقِ کار کا فرق ہے۔ دراصل ہم تم دونوں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔

(۳) تم کس منہ سے مجھ پر حبشہ پر حملہ کرنے کا الزام عائد کر سکتے ہو؟ کیا تم نے میری طرح دنیا کی کمزور قوموں کو اپنا غلام نہیں بنایا؟

(۴) کیا تم نے بیگناہ اور کمزور قوموں کے حکمرانوں کو نیست و نابود نہیں کر دیا مثلاً دہلی تو موجود ہے لیکن شاہ دہلی کہاں ہے!

(۵) کیا یہ بھی کوئی انصاف ہے کہ حکومت اٹلی تو زمین کے غیر آباد حصّوں کو آباد کرنے میں اپنا خزانہ خالی کرتی ہے اور تم لوگ بنجر زمینوں سے بھی خراج وصول کر کے اپنے خزانے معمور کرتے رہو! (آل سیزر سے مراد اٹلی کے حکمراں ہیں)

(۶) کیا یہ ایک حقیقتِ ثانیہ نہیں کہ تم نے (اشارہ بجانب انگلستان، فرانس ہالینڈ وغیرہ) غریب صحرا نشینوں (افریقہ کی قوموں) کے گھر بار تباہ کئے تم نے کاشتکاروں کی کھیتیاں تباہ کیں، تم نے کمزور حکومتوں کے تختے اُلٹ دئے، تم نے بیگناہ لوگوں پر بم برسائے۔

(۷) میں تو تمہارے ہی نقش قدم پر چل رہا ہوں۔ تہذیب کے پردہ میں جو غارتگری اور قتلِ انسانی تم نے کل روا رکھا تھا میں آج روا رکھتا ہوں تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ جو کام تم مدتوں سے کرتے رہے ہو وہی اب میں کر رہا ہوں تم امپیریلزم کے حامی ہو میں فاشزم کا وکیل ہوں، لیکن مقصد تو ان دونوں تحریکوں کا ایک ہی ہے۔ بیگناہ قوموں کا خون بہانا اور انہیں اپنا غلام بنانا۔

گلہ

واقعی خوب نظم ہے اور آخری شعر تو پوری نظم کی جان ہے کہتے ہیں کہ:۔

(۱) خدا جانے ہندوستان کا حشر کیا ہوگا اور کبھی اس ملک کو آزادی نصیب ہو گی یا نہیں؟ اب تک یہ ملک، تاج برطانیہ کا سب سے قیمتی گوہر ہے

نوٹ:۔ واضح ہو کہ یہ مصرع دراصل انگریزوں کے اس مقولہ کا ترجمہ ہے۔ "INDIA IS THE BRIGHTEST JEWEL IN THE BRITISH CROWN"

(۲) انگریزوں نے سرمایہ دارانہ نظام قائم کر کے اس ملک کے کاشتکاروں اور مزدوروں کی یہ حالت کر دی ہے کہ وہ قبر کے مُردے معلوم ہوتے ہیں۔

(۳) اُن کی روح اور اُن کا بدن دونوں غیروں کے قبضہ میں ہیں یعنی نہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں اور نہ اپنے اعضائے جسمانی کو اپنی مرضی سے استعمال کر سکتے ہیں اور اُن کی جسمانی محنت کا ثمرہ تو زمیندار وصول کر لیتا ہے۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ان غریبوں کے پاس رہنے کو مکان بھی نہیں ہے اور مکان تو بڑی چیز ہے یہ تو اپنے جسم کے بھی مالک نہیں ہیں۔ الغرض انگریزوں کی غلامی کا نتیجہ یہ نکلا کہ نہ مکان باقی رہا نہ مکین۔

(۴) لیکن ان سب باتوں کے باوجود مجھے یورپ سے گلہ نہیں ہے بلکہ تجھ (ہندوستان کے کاشتکاروں اور مزدوروں اور محنت کش طبقوں) سے گلہ ہے کہ تو، انگریزوں یا اُن کے ایجنٹوں کی غلامی پہ راضی کیوں ہے۔!

واضح ہو کہ اس نظم میں اقبال نے ہم کو انگریزوں کے خلاف بغاوت کرنے کا مشورہ دیا ہے، اور یہ کوئی نیا مشورہ نہیں ہے ۱۸۵۷ء میں بھی ہماری قوم کے علماء نے متفقہ طور پر یہی مشورہ بلکہ فتویٰ دیا تھا کہ

انگریز کی اطاعت حرام ہے، اور میری دعا یہ ہے کہ اللہ وہ دن جلد لائے جب ہم پاکستان کے مسلمان، انگریزوں کے خلاف بغاوت کر سکیں۔

انتداب

واضح ہو کہ اس دلکش طنزیہ نظم میں اقبال نے ہمیں انتداب کی لعنتوں سے آگاہ کیا ہے یعنی انگریز اور دوسری طاغوتی قومیں جب مسلمانوں کے کسی ملک پر قبضہ کرنا چاہتی ہیں تو دنیا میں یہ اعلان کرتی ہیں کہ ہم اس خطہ کو مہذب بنانا چاہتے ہیں اس لیے اس پر اپنی حکمداری (انتداب) قائم کر رہے ہیں یعنی ہمارا مقصد اس ملک پر قبضہ کرنے سے بہت مستحسن ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ یہ شیطانی جماعتیں جس ملک پر قبضہ مخالفانہ کرتی ہیں وہاں ہر قسم کی برائیاں رائج کر دیتی ہیں اور محکوم قوم کو اُن برائیوں میں اس درجہ منہمک کر دیتی ہیں کہ پھر وہ قوم جذبۂ جہاد سے بالکل بیگانہ ہو جاتی ہے۔

مثلاً امریکہ کے طرزِ عمل پر غور کرو۔ عصرِ حاضر کا یہ فرعون حجاز بلکہ عرب پر اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتا ہے تو اُس نے اُس کی صورت یہ نہیں اختیار کی کہ فوجیں بھیج کر قبضہ کر لیتا اور بلاوجہ تمام دنیا کی مخالفت مول لیتا بلکہ وہ سلطان ابن سعود کی وساطت سے، عربوں کو مہذب بنا رہا ہے اور اس تہذیب کی ابتداء خود "جلالۃ الملک" اور اُس کے خاندان سے ہوئی ہے۔ سلطان چونکہ بندۂ زر ہے اس لیے بڑی آسانی سے کفّار کا آلۂ کار بن گیا۔ اور اب اِس "دیندار" وہابی بادشاہ کی بدولت، سرزمینِ حجاز برکاتِ تہذیب و تمدّن سے

بہرہ اندوز ہو رہی ہے اور وہ دن دُور نہیں جب بادیہ نشینوں کا یہ ملک تہذیب و تمدّن کے اعتبار سے مصر شام اور عراق کا ہم پلہ ہو جائے گا۔ اقبال کہتے ہیں کہ

(۱) عصرِ حاضر میں یورپ کی جو قومیں برسرِ اقتدار ہیں، ان کو یہ معلوم کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی کہ کونسا ملک غیر مہذب ہے۔

(۲) اس بات کے معلوم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اگر کسی ملک کے لوگ جُوا نہیں کھیلتے، اور وہاں کی عورتیں اپنے جسم کو غیروں کی للچائی ہوئی نگاہوں سے بچانے کے لیے اسلامی لباس پہنتی ہیں، اور اگر وہاں کے لوگ شراب نوشی کو حرام سمجھتے ہیں۔

(۳) اور کشمکش باطنی کے باوجود، بزرگوں کے طور طریقوں کا احترام کیا جاتا ہے یعنی ملی روایات پر عمل کیا جاتا ہے۔

(۴) اور اگر وہاں کے دیہاتی، بہادر عقلمند اور صاحب حوصلہ ہیں اور اگر اُن کے گاؤں میں "اسکول" قائم نہیں ہیں تو۔

(۵) یورپ کے تمام عقلمندوں کا فیصلہ یہی ہے کہ وہ سرزمین بالکل غیر مہذب ہے۔ اس لیے انسانیت کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اُسے مہذب بنائیں اور اس لیے اس پر اپنا تسلط قائم کریں۔

نوٹ:۔ ایران، مصر، ترکی شام اور عراق کی مسلمان عورتیں تو تہذیب کے تمام مدارج طے کر چکی ہیں (چنانچہ چند سال ہوئے ایک ترکی خاتون کو حُسن کے مقابلہ میں اوّل درجہ کا انعام ملا تھا) لیکن مجھے افسوس ہے کہ دولتِ خداداد پاکستان کی مسلمان عورتیں اس اعتبار سے ابھی بہت پسماندہ ہیں۔ اس لیے میں کل پاکستان انجمن خواتین کراچی سے درخواست کروں گا کہ وہ اسلامی غیرت

کو کام میں لاکر، عورتوں کے اندر حُسن کے مقابلہ میں شرکت کا جذبہ پیدا کریں تاکہ ہمارا ملک بھی ترقی یافتہ ممالک کی صف میں جگہ پا سکے آخر وہ دقیانوسیت اور رجعت پسندی کے یہ دلدوز طعنے کبتک برداشت کرتی رہیں گی؛ ضبط کی بھی کوئی حد ہونی چاہیئے۔ ۱۲۰

لادین سیاست

اس نظم میں اقبال نے یہ بتایا ہے کہ فرنگیوں کی سیاست لادینی اور الحاد پر مبنی ہے اس لیے یہ شیطانی نظام، کسی صورت سے بھی بنی آدم کے حق میں مفید نہیں ہو سکتا۔ اور یہ فساد اس لیے رونما ہوا ہے کہ فرنگیوں نے یہ شیطانی اصُول اختیار کر لیا ہے کہ مذہب کو سیاست سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ کہتے ہیں کہ:

(۱) قرآن اور حدیث کے مطالعہ نے میرے اندر ایسی بصیرت پیدا کر دی ہے کہ میں حق و باطل میں تمیز کر سکتا ہوں۔

(۲) چنانچہ جب میں نے فرنگیوں کی سیاست کا مطالعہ کیا تو مجھ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ ان کی سیاست، اللہ تعالیٰ کے قانون سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی بلکہ شیطانی تعلیمات پر مبنی ہے، اس لیے جو لوگ اس سیاست کو اختیار کرتے ہیں وہ نیکی اور پاکیزگی سے معرا ہو کر حیوان بن جاتے ہیں اور اُن کی طبیعت میں سستی آجاتی ہے اور اُن کا ضمیر مُردہ ہو جاتا ہے۔

(۳) چونکہ مغربی اقوام نے اپنی سیاست کو مذہب سے جُدا کر دیا ہے اسلیئے

اُن کی مثال اُس دیو کی سی ہے جو ہر قسم کی اخلاقی قیود سے آزاد ہو جائے اور ہر وقت انسانوں کو تباہ کرنے پر آمادہ رہے۔

(۴) چنانچہ جب یہ مغربی اقوام کسی ایشیائی ملک پر زیردستی قبضہ کرنا چاہتی ہیں تو پادریوں کو بطور آلۂ کار استعمال کرتی ہیں اور خود حملہ آور ہونے سے پہلے اُن کو، اپنے لشکر کا ہراول (مقدمۃ الجیش) بنا کر مذہب عیسوی کی تبلیغ کے لیے بھیج دیتی ہیں اور یہ لوگ لادینی سیاست کی تبلیغ کر کے ان قوموں کی فتوحات کے لیے راستہ صاف کر دیتی ہیں۔

دامِ تہذیب

اقبال نے اس نظم میں یہ حقیقت واضح کی ہے کہ یورپ کی حکومتوں کا طریق کار یہ ہے کہ وہ ایشیائی ممالک میں ایسی عیاری کے ساتھ اثر و رسُوخ قائم کرتی ہیں کہ نادان قومیں ان کے پھندے میں پھنس جائیں مثلاً انہوں نے عربوں سے یہ کہا کہ ترک تمہارے اوپر ظلم کر رہے ہیں اور اُنہوں نے بلا وجہ تمہیں اپنا غلام بنا رکھا ہے، ہم تمہاری مدد کے لیے تیار ہیں تم ہمارا ساتھ دو ہم تمہیں غیر مہذب ترکوں کے پنجہ سے رہائی بھی دلائیں گے اور مہذب بھی بنائیں گے یعنی تمہارے ملک میں مدرسے اور شفاخانے قائم کریں گے ریلیں بنائیں گے، صنعت و حرفت کو فروغ دیں گے وغیرہ وغیرہ۔ چونکہ عرب بیوقوف تھے اس لیے انگریزوں اور فرانسیسیوں کے جال میں پھنس گئے اور اب اپنی تقدیر کو رو رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ

(۱) مجھے اہل یورپ کی شرافت میں کچھ شک نہیں ہے یہ شریف لوگ

دنیا کی ہر مظلوم قوم کے ہمدرد ہیں۔

(۲) چنانچہ اُنہوں نے جس ملک پر اپنا اقتدار قائم کیا وہاں پاکیزہ خیالات سے دلوں کو منور کرنے کے بجائے۔ بجلی کے قمقموں سے لوگوں کے دماغ روشن کر دیئے۔

(۳) لیکن شام اور فلسطین کے حالِ زار پر مجھے سخت افسوس آتا ہے اور ان کی نجات کی کوئی تدبیر میری سمجھ میں نہیں آتی۔

(۴) انگریزوں نے اُن لوگوں کو "ظالم" ترکوں کے پنجہ سے تو بیشک نجات دلا دی لیکن اب یہ لوگ "تہذیب" کے پھندے میں اس طرح گرفتار ہو گئے ہیں کہ ان کی رہائی کی کوئی اُمید نہیں ہے۔

جن لوگوں نے پہلی جنگِ عظیم کے بعد سے شام، عراق، فلسطین، شرقِ اُردن اور مصر کے حالات کا مطالعہ کیا ہے اُن سے یہ حقیقت مخفی نہیں ہے کہ جب سے یہ ممالک ترکوں کی عملداری سے "آزاد" ہوئے ہیں۔ ہر قسم کی مصیبتوں میں مبتلا ہیں خصوصاً فلسطین کے عرب تو پچیس سال سے خانہ جنگی کی لعنت میں گرفتار ہیں۔ اقبال نے عربوں کی اسی حماقت پر یہ دلخراش تبصرہ کیا ہے کہ ؏

بیچارے ہیں تہذیب کے پھندے میں گرفتار

نصیحت

اس نظم میں اقبال نے مغربی سیاست کے ایک اہم پہلو کو بے نقاب کیا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ پہلے زمانہ میں جو کام تلوار سے لیا جاتا تھا۔ اس زمانہ

تعلیم سے لیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ :-

ایک فرنگی سیاستدان نے اپنے بیٹے سے یہ کہا کہ سطحی باتوں پر توجہ کرنے کے بجائے، حقائق پر غور کر یعنی حکومت کے رموز سمجھ۔

محکوم قوموں پر اپنی حکومت کے مخفی اصول کبھی واضح مت کر، اگر تو اُن کو اپنے طریقِ کار سے آگاہ کر دے گا تو وہ تیرے جال میں ہرگز نہیں پھنس سکیں گے۔

حکومت کے اسرار و رموز ہمیشہ محکوموں سے پوشیدہ رکھے جاتے ہیں۔

اور حکومت کا طریقہ یہ ہے کہ محکوم کو تلوار سے زیر نہیں کیا کرتے۔

بلکہ اِن کے لیے ایسا نصاب تعلیم مدون کرتے ہیں کہ اس کی بدولت اُن کی خودی مردہ ہو جائے اور حریت کے جذبات فنا ہو جائیں اور جب وہ خوئے غلامی میں پختہ ہو جائیں تو پھر ان پر حکومت کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ یہ نصابِ تعلیم دراصل ایک تیزاب ہے اور اس کی خاصیت یہ ہے کہ انسانی خودی تو کیا چیز ہے! سونے کا پہاڑ بھی مٹی کا ڈھیر ہو جائیگا انگریزوں نے اسی نظام و نصابِ تعلیم کی بدولت مسلمانوں کی خودی کو فنا کر دیا۔ چنانچہ سَو سال میں یہ حالت ہو گئی ہے کہ پاکستان بن جانے کے بعد بھی ہماری خودی بدستور مُردہ ہے اور ہماری حکومت، تعلیم تجارت معاشرت معیشت اور تہذیب غرضکہ زندگی کے کسی شعبہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے ہر بات میں وہی انگریزیت جلوہ گر ہے چنانچہ ہم اُردو کے بجائے انگریزی زبان اور قومی لباس کی بجائے انگریزی لباس اور مسجد کے بجائے کلب کو عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ہماری عورتوں کا حال مردوں سے بدتر ہے۔

واضح ہو کہ جو بات اقبال نے پانچ شعروں میں واضح کی ہے مرحوم اکبر الہ آبادی نے صرف ایک شعر میں بیان کر دی ہے اور سچ یہ ہے کہ معنویت اور تاثیر کے لحاظ سے ان کا یہ ایک شعر، اقبال کی پوری نظم سے کم نہیں ہے۔

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی!

ایک بحری قزاق اور سکندر

اس نظم میں اقبال نے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ ملوکیت اور قزاقی روش میں صرف نام کا فرق ہے ورنہ اصل دونوں ایک ہیں۔

سکندر نے ایک بحری ڈاکو سے کہا کہ تیری رہزنی اور لوٹ مار سے بحری مسافر بہت عاجز اور پریشان ہیں اس لیے میں تجھے یا قید میں رکھوں گا یا قتل کر دوں گا اس جرم کی سزا بہر حال دوں گا۔

یہ بات سن کر اس دانشمند ڈاکو نے سکندر سے یہ کہا کہ مجھے یہ تیری بات سن کر بہت رنج ہوا کیونکہ تو نے یہ بات کہہ کر اپنے پیشہ اور اپنے ہم پیشہ لوگوں کی سخت توہین اور رسوائی کی ہے۔ کیا تو اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ تیرا پیشہ بھی تو میری طرح لوٹ مار اور قزاقی اور سفاکی اور خونریزی اور قتل وغارت ہی ہے۔ فرق اگر ہے تو صرف اتنا کہ میں دریا میں لوٹ مار کرتا ہوں تو خشکی میں قتل وغارت کرتا ہے۔

جمعیتِ اقوام

اقبال نے اس نظم میں اس جمعیۃ اقوام کی حالتِ زار کا نقشہ کھینچا ہے جو پہلی جنگِ عظیم کے بعد یورپ کے کفن چوروں نے اپنے فائدہ کے لیے قائم کی تھی اسی جنیوا والی لیگ آف نیشنز کے متعلق اقبال نے پیامِ مشرق اور ضربِ کلیم میں کئی نظمیں لکھی ہیں۔

جس زمانہ میں اقبال نے یہ نظم لکھی تھی، جمعیۃ مذکورہ اپنی بے ایمانی اور ناانصافی کی وجہ سے ساری مشرقی دنیا میں بدنام ہو چکی تھی اور اس کا بھرم بالکل کھل چکا تھا اسی لیے اقبال نے یہ قیاس ظاہر کیا کہ عنقریب یہ لیگ ختم ہو جائیگی چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد ایسا ہی ظہور میں آیا۔

کالج کے نوجوانوں کی اطلاع کے لیے یہ صراحت ضروری ہے کہ لیگ آف نیشنز کا طرزِ عمل ایسا ہی شریفانہ اور عادلانہ تھا جیسا آج کل کی یو۔ این او (U.N.O) یعنی تنظیم اقوام متحدہ کا ہے جو لیگ آنجہانی کی سچی اور اصلی جانشین ہے۔ چنانچہ مسئلہ کشمیر میں اس تنظیم کی انصاف دوستی ہر کہ ومہ پر آشکارا ہو چکی ہے۔

(۱) جمعیۃ اقوام اب عنقریب ختم ہونے والی ہے اور وہ دن دور نہیں ہے جب ہم یہ خبر پڑھیں گے کہ اس کا خاتمہ ہو گیا۔

(۲) اس کی موت تو قطعی ہے لیکن "پیرانِ کلیسا" اس کے حق میں بڑے دردِ دل کے ساتھ دعائیں کر رہے ہیں کہ ابھی یہ کچھ دنوں اور جیتی رہے تقدیر سے یہاں مراد ہے خدائی فیصلہ یا خاتمہ مبرم یعنی قطعی، یقینی جو ٹل نہ سکے، تقدیر کی دو قسمیں ہیں تقدیر مبرم اور تقدیر معلق۔

پیران کلیسا بھی اقبال کی خاص اصطلاح ہے۔ اس سے مراد ہیں وہ ارباب سیاست جو اپنے سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لیے مذہب کی حمایت کرتے ہیں۔

پیرانِ کلیسا کے لغوی معنی تو اُن پادریوں کے ہیں جو رومی یا پروٹسٹانٹ کلیسا میں بلند مناصب پر فائز ہوں۔ مثلاً بطریق یا اسقف اعظم لیکن اقبال کی مُراد، ان مذہبی پیشواؤں سے نہیں ہوا کرتی۔

نوٹ:- میں نے اس شرح میں لفظوں اور اصطلاحوں کی تشریح بہت کم کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کام میں نے فرہنگ اقبال کے لیے مخصوص کر دیا ہے۔ ۱۲

(۳) اگرچہ اس کا خاتمہ تو یقینی ہے لیکن یہ ممکن ہے کہ فرنگی اقوام کی یہ "داشتہ" یا "خادمہ" ابلیس کے تعویذ سے کچھ روز سنبھل جائے یعنی ان عیار فرنگی اقوام کی شیطانی چالوں اور فریب کاریوں کی بدولت کچھ دنوں اور قائم رہے۔

نوٹ:- اس جمعیۃ اقوام سے علامہ کو جس قدر نفرت تھی اس کا اندازہ اس شعر سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ انہوں نے اس کے لیے داشتہ کا لفظ استعمال کیا ہے جو اپنی رکاکت کی وجہ سے اُن کے شایانِ شان نہیں ہے میرا مطلب یہ ہے کہ یہ لفظ جوش ملیح آبادی اور اسی وضع قماش کے دوسرے تنزل پسندوں کی شاعری میں تو بالکل جائز اور موزوں ہے لیکن اقبال کے یہاں اس کا استعمال ذوق سلیم پر گراں گزرتا ہے۔ مگر کیا کیا جائے، جمعیت مذکورہ کی حقیقی حیثیت (یا اس زمانہ میں یو، این، او کی حقیقی حیثیت) کو واضح کرنے کے لیے اس سے بہتر

اور کوئی لفظ سمجھ میں نہیں آتا۔

دوسرے مصرع میں "ابلیس کے تعویذ" سے یہ حقیقت واضح ہو سکتی ہے کہ علامہ مرحوم مغربی حکومتوں اور اُن کے سیاست دانوں کو سراسر ابلیس کے غیر تنخواہ یاب گماشتے یقین کرتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ابلیس کے ان سیاسی فرزندوں کی تردید میں اپنا پورا زورِ قلم صرف کر دیا ہے۔ جزاہ اللہ تعالیٰ،

شام و فلسطین

اس نظم میں اقبال نے فرنگی سیاست کو بے نقاب کیا ہے:-

(۱) کہتے ہیں کہ حکومتِ فرانس نے، حکومت برطانیہ سے ساز باز کر کے شام پر اپنا تسلط قائم کیا اور وہاں تہذیب مغرب کی تمام بُرائیاں (خصوصاً شراب نوشی) عام کر دی۔

(۲) شامیوں کے اخلاق تباہ کرنے کے ساتھ ساتھ دونوں حکومتوں نے فلسطین کے یہودیوں کو در پردہ عربوں کے خلاف بغاوت کرنے پر آمادہ کیا اور عذر یہ تراشا کہ فلسطین میں چونکہ یہودی ایک زمانہ میں حکمراں رہ چکے ہیں اس لیے یہ اُن کا آبائی اور قومی وطن ہے اور یہاں انہی کو حکمراں ہونا چاہیے اقبال یہ کہتے ہیں کہ اگر فرزندانِ ابلیس کی یہ دلیل صحیح تسلیم کر لی جائے تو پھر ہسپانیہ عربوں کو ملنا چاہیے کیونکہ اُن کے آباؤ اجداد بھی اس ملک میں سات سو سال تک حکومت کر چکے ہیں۔

(۳) اقبال کہتے ہیں کہ شام اور فلسطین پر فرانس اور برطانیہ کے قبضہ کا مقصد یہ نہیں کہ وہ ان ملکوں سے کوئی تجارتی فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں بلکہ عربوں

کی وحدت کو پارہ پارہ کرنا چاہتے ہیں، تاکہ یہ قوم ہمیشہ ان کی دست نگر رہے۔

سیاسی پیشوا

اس نظم میں اقبال نے سچے سیاسی پیشوا (مسلمان سیاستداں) کی شناخت بتائی ہے۔ کہتے ہیں کہ

موجودہ سیاسی لیڈر خواہ مشرقی ہوں یا مغربی، رہنمائی کے اہل نہیں ہیں کیونکہ ان کا زاویۂ نگاہ سراسر مادہ پرستانہ ہے۔ ان کے خیالات بالکل پست ہیں اور صرف دنیاوی منفعت پر مرکوز رہتے ہیں۔

(۲) یہ لوگ ہمیشہ ادنیٰ ادنیٰ باتوں کی طرف متوجہ رہتے ہیں۔ مثلاً فلاں ملک کے تیل کے چشمے قبضہ میں آجائیں، فلاں ملک کی خام اشیاء کا اجارہ حاصل ہو جائے وغیرہ۔ اسی لیے ان کی کمند (تدابیر) مکڑی کے جالے کی طرح کمزور ہوتی ہے اور اسی لیے ان کی پالیسی (POLICY) آج کچھ ہے کل کچھ ہے۔

(۳) مبارک ہے وہ قوم جس کا لیڈر (امام) فرشتوں کا سا پاکیزہ تخیل اور بلند جذبات رکھتا ہو۔

واضح ہو کہ انسان کی شخصیت میں تین قوتیں (FACULTIES) پائی جاتی ہیں۔ شعور (تخیل)، احساس (جذبات) اور ارادہ (عمل)۔ اقبال نے اس شعر میں تخیل اور جذبات کا ذکر کیا ہے۔ تیسری قوت کا ذکر نہیں کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر کسی انسان میں صحیح شعور اور اس کے مناسب حال، جذبۂ عمل پیدا ہو جائے یا موجود ہو تو پھر عمل لازمی طور سے سرزد ہو گا۔

عمل جس کا نام ہے وہ نفسیاتی اعتبار سے، اوّل الذکر دو چیزوں کے پوری قوت کے ساتھ موجود ہو جانے پر موقوف ہے۔ مسلمان قوم آج عمل سے محروم ہے۔ اس کی وجہ یہی تو ہے کہ قوم پوری قوم، صحیح اسلامی شعور اور صحیح مناسب حال اسلامی جذبات سے محروم ہے جب قوم میں نہ شعور ہو نہ جذبہ تو اس سے عمل کا صدور نفسیاتی طور پر ناممکن ہے عمل صالح (جہاد) تو شعور اور احساس پر منحصر ہے

آؤ! دنیا کے سب سے بڑے اور کامیاب ترین پیشوا کے طرز عمل کا مطالعہ کریں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے سب سے پہلے عربوں کے اندر صحیح اسلامی شعور پیدا کیا یعنی اُنہیں یہ بتایا کہ اللہ ایک ہے اس کے علاوہ تم پر اس کائنات میں کوئی طاقت نہ تو حکمراں ہے اور نہ ہو سکتی ہے کیونکہ اس کے علاوہ کائنات میں جو کچھ ہے وہ دو حال سے خالی نہیں ہے یا وہ تم جیسی ہے یا تم سے کمتر ہے جو تم جیسی ہے وہ تم پر کیوں حکمراں ہو؟ تم خود اس پر کیوں حکمراں نہ ہو؟ چونکہ یہ صورت عقلاً مذموم ہے اس لیے کہ اس سے فتنہ پیدا ہوگا، لہٰذا تم اور وہ مساوی ہو گئے نہ وہ تم پر حکومت کرے نہ تم اُس پر حکومت کرو۔

اب رہی وہ چیز جو تم سے کمتر ہے۔ اُسے عقلاً تم پر حکمرانی کا حق نہیں بلکہ تم کو اس پر حکمرانی کا حق ہے۔ خلاصہ اس بحث کا یہ نکلا کہ جو تمہارے برابر ہے وہ خود تمہاری نوع ہے یعنی سب انسان برابر ہیں۔ اس لیے کوئی انسان کسی انسان پر حکمراں نہیں ہو سکتا۔ یعنی کوئی کسی کا غلام نہیں ہے۔ انسان کے علاوہ جو کچھ ہے حیوانات وحوش وطیور، نباتات جمادات یہ سب تم سے کمتر ہیں اس لیے عقلاً تمہارے خادم اور مطیع ہیں پس ثابت ہو گیا کہ اگر کسی کو انسان پر حکمرانی کا حق پہنچتا ہے تو وہ اللہ ہے اس لیے لا الٰہ الا اللہ ایک مذہبی حقیقت ہی نہیں بلکہ ایک منطقی صداقت بھی ہے اور کائنات میں اس سے بڑی کوئی

صداقت نہیں ہے۔ اور اسلام اسی حقیقت کبریٰ کا علمبردار ہے۔

جب یہ صداقت عربوں کے دل میں اُتر گئی تو نفسیاتی اصطلاح میں اُن کے اندر صحیح شعور پیدا ہو گیا اور اقبال نے اس شعر میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

رہے گا تو ہی جہاں میں یگانہ و یکتا
اُتر گیا جو ترے دل میں لَا شَرِیْکَ لَہٗ

جب صحیح شعور پیدا ہو گیا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کے اندر صحیح جذبہ (EMOTION) پیدا کیا، اور اُس کے لیے ان کے قلوب میں اس حقیقت کو جاگزیں کیا کہ دیکھو محبت کرنا ایک فطری جذبہ ہے لیکن محبت کے لائق وہی ہستی ہے جسے فنا نہ ہو، جس میں کوئی عیب نہ ہو کیونکہ اگر عیب ہے تو وہ کامل نہیں۔ اور جو کامل نہیں اُس سے وفا کی امید نہیں ہو سکتی (خدا معلوم کس وقت بیوفائی کر بیٹھے) جو تمہاری محبت کا صلہ دے سکے (انسان خود محتاج ہے وہ نہیں کیا دے سکتا ہے) جو تمہاری دستگیری کر سکے اور ایسی ہستی صرف اللہ ہی کی ہے پس تم اللہ کو اپنا محبوب بناؤ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ اور اس سے محبت کا طریقہ یہ ہے کہ میری اتباع کرو اور چونکہ اتباع کے لیے محبت شرط ہے اس لیے مجھ سے محبت کرو میری محبت تمہیں اللہ سے ملا دے گی مقصود تو وہی ہے لیکن میں اُس تک پہنچنے کے لیے واسطہ ہوں۔ میرے بغیر تم اُس تک نہیں پہنچ سکو گے۔

جب صحابہ کرامؓ نے اس دلنواز تعلیم کو قبول کیا تو اُن کے اندر وہ چیز پیدا ہو گئی جسے اقبال، عشق رسولؐ سے تعبیر کرتے ہیں اور اس جاہل اور کم سواد شارح اقبال کی رائے میں یہی چیز اقبال کے سارے فلسفہ کا خلاصہ

ہے۔ یا اُن کی شاعری کا محور ہے۔

قصہ مختصر جب صحابہؓ کے اندر صحیح شعور کے بعد، صحیح جذبہ پیدا ہو گیا تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ممتحن کی حیثیت اختیار کی اور ۱۳ سال تک جو کچھ پڑھا پڑھایا تھا اس کا یعنی شعور اور جذبہ کی واقفیت کا امتحان لیا تاکہ معلوم ہو سکے کہ میری تعلیم موثر ہو گئی ہے یا ابھی کچھ کسر باقی ہے، تاریخ اسلام نے اس عظیم الشان امتحان کو ہجرت کے دلفریب نام سے تعبیر کیا ہے۔

الغرض جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھ لیا کہ قوم میں صحیح شعور اور صحیح (مناسب حال) جذبہ پیدا ہو گیا ہے تو ۲ھ میں عمل صالح (جہاد) کرنے کا حکم دے دیا اور دنیا اس اولین عمل صالح کو جنگِ بدر کے نام سے یاد کرتی ہے۔

واضح ہو کہ شعور اور جذبہ پیدا کرنے میں تو پندرہ سال کی طویل مدت صرف ہوئی لیکن جب یہ دونوں چیزیں پیدا ہو گئیں تو پھر عمل کرنے کے لیے نہ کسی مدت کی ضرورت لاحق ہوئی نہ کوشش کی۔ صرف اجازت ملنے کی دیر تھی۔ جونہی اجازت ملی، عمل ظہور میں آگیا۔ یعنی ادھر یہ آیت نازل ہوئی۔ اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا ط وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرُ ہ (۲۲ : ۳۹)

جن لوگوں (مسلمانوں) سے کافر برسر پیکار ہو گئے ہیں، ان کو اب اجازت دی جاتی ہے کہ وہ جہاد کریں کیونکہ کافروں نے پیش قدمی کر کے ان پر ظلم کیا ہے اور اب عقلاً مسلمانوں پر مدافعت فرض ہو گئی ہے اور ہم کفار کو مطلع کیے دیتے ہیں کہ اللہ ان کی مدد کرنے پر یقیناً قادر ہے" اُدھر مسلمانوں نے عمل

کرنا شروع کر دیا۔

میرا مقصود اس تفصیل سے یہ دکھانا ہے کہ بنیادی چیز شعور اور جذبہ ہے جب یہ دونوں چیزیں پیدا ہو جاتی ہیں، عمل صالح خود بخود سرزد ہوتا ہے۔ اسکو ایک مثال سے مزید واضح کرتا ہوں۔ زید کی بیوی بیمار ہے، بکر نے اس سے کہا کہ اس کے مرض کی دوا، خالد کے پاس ہے، جو کلکتہ میں رہتا ہے۔ گویا صحیح شعور (علم) پیدا ہو گیا۔ بیوی نے کہا اگر تمہیں واقعی مجھ سے محبت ہے تو جس طرح ہو سکے وہ دوا حاصل کرو۔ بیوی کے اس قول نے صحیح جذبہ پیدا کر دیا۔ اب زید کو عمل (زحمت سفر برداشت) کرنے میں ہرگز دیر نہیں لگ سکتی۔ وہ فوراً کلکتہ روانہ ہو جائے گا۔

نفسیات غلامی

اس نظم میں اقبال نے غلاموں کی نفسیاتی کیفیت کو واضح کیا ہے کہ غلامی کی بدولت اُن کی نگاہ میں ایسی کجی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ شیر کو لومڑی سمجھنے لگتے ہیں، اور عیب کو ہنر یقین کرنے لگتے ہیں کہتے ہیں کہ

(۱) قوموں کی بیماریوں کے اسباب بہت پیچیدہ اور مخفی ہوتے ہیں یعنی کسی قوم کے زوال اور اعلیٰ محکومی کے اسباب کا سمجھنا کوئی آسان بات نہیں ہے اگر ان کی تفصیل کی جائے تو بلا مبالغہ ایک طومار مرتب ہو جائے گا۔ میں اس کا

(بقیہ صفحہ گذشتہ) ۱؎ اللہ تعالیٰ نے مدد کا وعدہ اُسوقت فرمایا جب مسلمانوں نے حصولِ نصرت کی شرائط (ایمان اور محبت رسول) بدرجۂ اتم پوری کر دیں آج پاکستان کے مسلمان اگر ان شرطوں کو پورا کر دیں تو اللہ بھی یقیناً ان کی مدد فرمائے گا۔ ۱۲

خلاصہ ایک فقرہ میں بیان کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ

(۲) غلامی سے قوم کی ذہنیت اس درجہ مسخ ہو جاتی ہے کہ وہ سونے کو پیتل اور پیتل کو سونا سمجھنے لگتی ہے۔ اس کو یعنی اس قوم کے علماء اور مشائخ اور ائمہ کو شیروں کے دین یعنی اسلام میں لومڑیوں کی عیاری (غلامی کی تعلیم) کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔

(۳) چنانچہ اس قوم میں جو شخص مصلح اور امام الزماں ہونے کا مدعی ہوتا ہے وہ بھی اُس کو غلامی ہی کی تلقین کرتا ہے اور انگریزوں کی وفاداری کا درس دیتا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اگر یہ شخص جو حکومت کی خوشنودی حاصل کرنے کا آرزومند ہے، الہام اور مکالمات الٰہیہ کا دعویٰ بھی کرے، تو اس کے سب دعاوی اور الہامات، قوم کے حق میں لعنت کا سبب بن جاتے ہیں کیونکہ اسلام اور غلامی ایک دوسرے کی ضد میں جو شخص مسلمانوں کو غیر اللہ کی غلامی کا سبق پڑھاتا ہے وہ خود دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ ۱۲

غلاموں کی نماز

۱۹۳۵ء کے آغاز میں ترکی وفد متعلقہ ہلالِ احمر لاہور آیا تھا اور حضرت علامہ مرحوم سے ملاقات کے بعد اس کے ارکان نے، مرحوم سے درخواست کی کہ شاہی مسجد کے جلسہ میں جو بعد نماز منعقد ہوگا ضرور شرکت فرمائیں۔ اختتامِ جلسہ کے بعد رئیس الوفد نے مرحوم سے، امام کے طولِ قرأۃ و سجدہ پر اپنے تعجب کا اظہار کیا اقبال چونکہ بہت ذکی الحس تھے اسلئے اُنہوں

نے نظم کی صورت میں اپنے تاثرات کا اظہار کر دیا۔ کہتے ہیں کہ

(۱) نماز سے فارغ ہونے کے بعد، ترکِ مجاہد نے مجھ سے کہا کہ تمہارے امام اس قدر طویل سجدے کیوں کرتے ہیں!

(۲) بات یہ ہے کہ ترک تو مجاہد ہوتے ہیں انہیں کیا خبر کہ غلامی کی نماز کیسی ہوتی ہے!

(۳) آزاد قوموں کے افراد کو اپنی آزادی برقرار رکھنے کے لیے ہر وقت مصروفِ عمل رہنا پڑتا ہے یعنی وہ جہاد کی تیاری میں مصروف رہتے ہیں۔

(۴) لیکن غلاموں کو، غلامی کے علاوہ دنیا میں اور کوئی کام نہیں ہوتا۔ لہٰذا غلاموں کے لیے یا اُن کی نظر میں، زمانہ یا روز و شب ساکن رہتا ہے۔ کیونکہ زمانہ تو مقدار حرکت کا نام ہے۔ اور غلاموں میں حرکت (عمل) ہوتی نہیں تو اُن کی نظر میں زمانہ بھی ساکن ہو جاتا ہے۔

(۵) اگر ہندوستان کے مسلمان، طویل سجدہ کرتے ہیں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ طویل سجدوں کے علاوہ اور ان غریبوں کو کام بھی کیا ہے ؟ نہ قواعد پریڈ سے کوئی تعلق ہے نہ اپنے گھوڑے کی نگہداشت سے کوئی علاقہ ہے نہ اپنے ہتھیاروں کی صفائی کی ضرورت ہے نہ رات کو سرحدوں کی حفاظت کا کام ہے۔ نہ جسمانی ورزش کی ضرورت ہے۔ نہ مسلمانوں کے گھروں پر جا کر انہیں جہاد کی ترغیب دینے کی ضرورت ہے۔ غلامی کی نعمت نے مسلمانوں کو ان تمام زحمتوں سے مامون اور بری الذمہ کر دیا ہے۔

(۶) اللہ تعالیٰ ہندوستان کے ائمہ مساجد کو وہ سجدہ نصیب کرے جس میں ملت کی زندگی کا پیام ہے یعنی جس کی بدولت ملت زندہ ہو جائے

نوٹ:۔ اللہ تعالیٰ نے اقبال کی دعا قبول فرمائی اور ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کے چھ کروڑ مسلمانوں کو ایک خطہ اس برِصغیر میں ایسا عنایت کر دیا جس میں یہ لوگ جہاد کے لیے تیاری کر کے، ابلیس کے فرزندِ اکبر کی غلامی سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔ اب جو لوگ برسرِ اقتدار ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ ملت کو اسی طرح گرویدۂ جہاد (JEHAD MINDED) بنائیں جس طرح اُنہوں نے تقسیم سے پہلے دن رات ایک کر کے گاؤں گاؤں پھر کے، اسی ملتِ مرحومہ کو گرویدۂ لیگ (LEAGUE MINDED) بنایا تھا۔

یوں تو میلہ بھی، نمائش بھی، دلآرام بھی ہے\
یہ تو سب کچھ ہے، بتاؤ کہیں اسلام بھی ہے

(سلیم)

فلسطینی عرب کے

اس نظم میں اقبال نے عربوں کو، ساحرانِ فرنگ کے طلسم سے رہائی حاصل کرنے کا طریقہ بتایا ہے۔ جن لوگوں نے کلام اقبال کا مطالعہ کیا ہے اُن سے یہ حقیقت مخفی نہیں کہ علامہ کے دل میں ملت اسلامیہ کی بہبود کا کس قدر درد تھا۔ وہ رات دن فلسطینی عربوں کے غم میں گھلتے رہتے تھے اور یہ نظم اُن کے خلوص اور محبت کی جو اُنہیں اس قوم کے ساتھ تھی، بڑی حد تک عکاسی کر سکتی ہے۔ واضح ہو کہ مجھ سے علامہ مرحوم نے خود ایک مرتبہ یہ فرمایا تھا کہ "مجھے عربوں سے غیر معمولی محبت ہے کیونکہ یہ لوگ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک نسبت رکھتے ہیں۔ عربی بولتے ہیں اور زبان جس میں

حضور صلی اللہ علیہ وسلم تکلم فرماتے تھے" کہتے ہیں کہ :۔

(۱) اے فلسطین کے عرب! میں جانتا ہوں کہ تیرے وجود میں ابھی تک وہی آتش موجود ہے جس کے سوز سے زمانہ (دُنیائے کفر) ابھی تک فارغ نہیں ہوا ہے یعنی کفارِ فرنگ ہنوز مطمئن نہیں ہوئے ہیں کہ ہم نے عربوں کو زیر کرلیا ہے وہ ابھی تک اُس آگ کو جو صلاح الدین ایوبی بلکہ حضرت خالد ابن ولید رضؓ نے بھڑکائی تھی، بجھانے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں "سوز" سے اقبال کی مراد وہ جذبۂ جہاد ہے جو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات سے پیدا ہوا تھا۔ اور اکبر الہ آبادی نے اپنے اس مشہور شعر میں اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ شعر اس نظم میں ہے جس میں ایک انگریز لڑکی مسلمان قوم سے اپنی نفرت کا سبب بیان کرتی ہے، چنانچہ کہتی ہے۔

مطمئن ہو کوئی کیونکر کہ یہ ہیں نیک نہاد
ہے ہنوز ان کی رگوں میں اثرِ حکمِ جہاد

اللہ اکبر! اکبر الہ آبادی نے ایک شعر میں انگریز کی پوری ذہنیت اُسی قوم کی ایک لڑکی کی زبان سے واضح کردی ہے۔!

(۲) لیکن اے فلسطینی عرب! میں تجھے ایک مشورہ دیتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ تیرے مرض کی دوا نہ جنیوا (لیگ آف نیشنز) میں ہے نہ لندن (حکومتِ برطانیہ) میں

اے میرے بھولے مجاہد! فرنگ (اقوام یورپ) کی رگِ جاں تو خود یہودیوں کے پنجہ میں ہے، وہ بھلا کیسے اور کیونکر تیری مدد کرسکتے ہیں۔

(۳) اس لیے تو مجھ سے رہائی کی ترکیب سُن! غلامی سے نجات کا طریقہ صرف ایک ہی ہے۔ ابھی تک دوسرا طریقہ ایجاد نہیں ہوا اور وہ یہ ہے کہ مسلمان

(۱) پہلے خودی کی پرورش کرے یعنی اُسے نقطۂ کمال تک پہنچائے۔

(۲) پھر اس کے اظہار کی لذت کا احساس پیدا کرے۔

بالفاظِ دگر پہلے شعور خودی پیدا کرے پھر جذبۂ نمود خودی۔ ان دو باتوں کے بعد عمل یا جہاد خود بخود سرزد ہوگا اور اس شدت کے ساتھ کہ اس کے سامنے پہاڑ بھی قائم نہیں رہ سکتا۔ یہ شعور کہ میرے سامنے غیر اللہ کی کوئی حقیقت نہیں ہے، انسان کو "سیل بے پناہ" بنا دیتا ہے۔

نوٹ :۔ کاش پاکستان کے اربابِ اقتدار، اقتصادی پروگرام کیساتھ ساتھ، پاکستانی مسلمانوں کی خودی کی پرورش کا بھی کوئی پروگرام مُدوّن فرمائیں تاکہ قوم حصولِ مقصد کی طرف پہلا قدم تو بڑھا سکے!

اقبال نے کہنے کی حد تک سب کچھ کہہ دیا ہے، اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اُن کے ارشادات پر عمل کریں اور میں اپنے یقین کی پوری طاقت کے ساتھ اس حقیقت کا اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ جب تک اربابِ حکومت خود عمل کرنا شروع نہیں کریں گے، عوام میں عمل کا جذبہ اور داعیہ پیدا ہی نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ بچپن ہی میں، میرے بزرگوں (والدین) نے یہ حقیقت میرے دل پر نقش کردی تھی کہ "جابیا راجہ" ویسی پرجا، لہٰذا یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ راجہ تو ہوٹلوں میں مُغنیانِ فرنگ کے کمالات رقص کی داد دے اور پرجا مسجدوں میں جاکر خودی کی تربیت کرے۔

مشرق و مغرب

(پہلی)

اس نظم میں اقبال نے یہ بتایا ہے کہ مشرقی اور مغربی دونوں ملکوں کی قومیں اس وقت روحانیت، تقویٰ اور پاکیزگی سے محروم ہیں اس لیے قدرتی طور پر مختلف اخلاقی امراض میں مبتلا ہیں۔

مشرقی ممالک میں اس محرومی (مرض) کا سبب سیاسی اور ذہنی غلامی ہے یعنی ایشیائی قومیں سیاسی طور سے تو فرنگی اقوام کی غلام ہیں اور ذہنی اعتبار سے جاہل صوفیوں اور تنگ نظر ملاؤں کی غلام ہیں اس غلامی نے ان کے اخلاق کو تباہ کر دیا ہے خلاصہ یہ کہ غلام قوم کا دل مردہ ہوجاتا ہے یعنی خودی مُردہ ہوجاتی ہے۔

اب رہے مغربی ممالک، تو یہاں کی قوموں کے مرض کا سبب جمہوری نظام ہے یہ نظام بظاہر بہت دلفریب ہے۔ لیکن اس کے اندر بہت سی خرابیاں مضمر ہیں مثلاً جمہوریت میں ہر دولت مند آدمی یہ چاہتا ہے کہ مجھے زیادہ سے زیادہ، اقتدار حاصل ہوجائے اس غرض سے وہ اپنی پارٹی بناتا ہے اور اس طرح متعدد پارٹیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ اب ان پارٹیوں میں حصول اقتدار کے لیے رقابت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے ہر پارٹی اپنی مخالف پارٹی کو ہر ممکن طریق سے نیچا دکھانے کی کوشش کرتی ہے اور جائز اور ناجائز، حق اور ناحق، سچ اور جھوٹ کی تمیز مٹا دیتی ہے۔

اس کے علاوہ، ہر پارٹی ووٹ حاصل کرنے کے لیے، ہر ناجائز طریقہ کو بلا تامل اختیار کر لیتی ہے۔ اس طرح لالچ اور دھمکی جھوٹ اور عیاری

کا بازار گرم ہوجاتا ہے۔ اندریں حالات خدا اور ضمیر شرافت اور آدمیت اصول اور انصاف غرضکہ ہر نیکی اور اچھائی سے یکسر دُوری ہوجاتی ہے۔ اور انسان اپنی خواہش کا غلام بن جاتا ہے جمہوری نظام میں کوئی شخص، جو اقتدار کا خواہشمند ہے یہ نہیں دیکھتا کہ، خدا کا فرمان کیا ہے۔ بلکہ صرف ایک چیز مدِّ نظر ہوتی ہے وہ یہ کہ زیادہ سے زیادہ ووٹ کس طرح حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

ان دونوں باتوں کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ضمیر مُردہ ہوجاتا ہے اگر مشرق میں بنی آدم دیگر اقوام کے غلام ہیں تو مغرب میں بنی آدم ہوس اقتدار کے غلام ہیں یعنی غلامی دونوں جگہ موجود ہے اور اسی کو اقبال نے قلب و نظر کی رنجوری سے تعبیر کیا ہے۔

اگرچہ اقبال نے اس مرض کا علاج اس نظم میں بیان نہیں کیا لیکن اُن کے کلام کا مطالعہ کرنے والوں سے یہ حقیقت مخفی نہیں کہ اُنھوں نے اس کا شافی علاج متعدد مقامات میں بتا دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ سب قومیں انسانوں کی غلامی کی بجائے اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی اختیار کر لیں۔ پس ہر مسلمان کا فرضِ اوّلین یہ ہے کہ وہ دنیا سے ملوکیت کو ختم کرنے کی کوشش کرے کیونکہ ملوکیت اور خدا پرستی دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کے علاوہ اور کوئی شخص بنی آدم پر حکمراں نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا جب تک ملوکیت باقی ہے اصلاح کی کوئی صورت ممکن نہیں ہے۔

نفسیاتِ حاکمی

(دوسری)

اس نظم میں اقبال نے حکمران قوم کی ذہنیت یا پالیسی کی وضاحت کی ہے کہ جب حکمران قوم یہ دیکھتی ہے کہ محکوم قوم کے اندر بے چینی پیدا ہو چکی ہے اور ایجی ٹیشن کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے تو وہ کمال عیاری سے کام لے کر اصلاحات کا کھلونا ہاتھ میں دے دیتی ہے اور اصلاحات (REFORMS) کی ترقی یافتہ صورت درجۂ نوآبادیات (DOMINION STATUS) کہلاتی ہے۔ یہ درجہ، غلامی ہی کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے۔ چنانچہ مصر کو دیکھ لیجیے، بظاہر یہ ملک آزاد ہے۔ یہاں بادشاہ بھی ہے اس کا قصر بھی ہے، پارلیمان بھی ہے مجلس وزرا بھی ہے۔ غرضکہ بظاہر سب کچھ ہے لیکن دراصل "وہی ڈھاک کے تین پات" والا مضمون ہے۔ یعنی انگریز بہادر جس طرح ۱۹۱۵ء میں اس ملک پر حکمراں تھا اُسی طرح آج ۱۹۵۱ء میں بھی اُسی کا تسلط ہے۔

(۱) کہتے ہیں کہ یہ اصطلاحات، داخلی آزادی یا درجۂ نوآبادیات بظاہر تو مہربانی ہے لیکن درپردہ صیّاد کی بے مہری کا نشان ہے میرا احتجاج افسوس کہ میرے کام کچھ بھی نہ آیا۔

(۲) مجھے قفس سے تو باہر نکالا نہیں (جو میں چاہتا ہوں) ہاں اُس میں کچھ مرجھائے ہوئے پھول بیشک رکھ دیئے تاکہ میں اس کو گلشن سمجھ کر چیخ پکار سے باز آجاؤں۔ اور اپنے نفس کو یہ فریب دے سکوں کہ مجھے حقیقی آزادی نصیب ہو گئی ۱۲

بابِ ششم

محرابِ گل افغان کے افکار

تمہید اس باب میں اقبالؔ نے محراب گل افغان کی زبان سے اپنے افکار اور خیالات ظاہر کئے ہیں۔ یہ ایک فرضی نام ہے۔ اور اس کی ضرورت انہیں اس لیے محسوس ہوئی کہ اُنہوں نے بعض نظموں میں اسلوب بیان ایسا اختیار کیا ہے کہ اس فرضی نام کے بغیر، کلام میں تاثیر پیدا نہیں ہو سکتی۔ مثلاً پہلی نظم میں وہ سرحد کے کوہستان سے خطاب کرتے ہیں۔ اور یہ اسلوب بیان اس امر کا متقاضی ہے کہ متکلم خود وہیں کا باشندہ ہو۔

دراصل بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے دل میں ملّت کا درد اس درجہ تھا کہ میں بذریعہ الفاظ بیان نہیں کر سکتا۔ وہ ساری عمر ملّتِ اسلامیہ کے درد میں تڑپتے رہے۔ یہ مبالغہ نہیں ہے بالکل حقیقت ہے میں نے ۱۹۲۴ء سے لے کر ۱۹۳۸ء تک چودہ سال اُن کی صحبت میں گذارے۔ اور میں شہادت دے سکتا ہوں کہ میں نے خود بارہا اُنہیں ملّت کی بربادی کے غم میں بچوں کی طرح روتے دیکھا ہے۔ اور اس درد ملت کا راز یہ ہے کہ وہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے بےحد محبت کرتے تھے۔ اس لیے حضورؐ کی قوم کی تباہی اُن سے برداشت نہیں ہو سکتی تھی۔

وہ یہ سمجھتے تھے کہ اگر افغان بیدار ہو جائیں گے تو شاید ایشیا میں اسلام اور مسلمانوں کی سر بلندی کا کچھ انتظام ہو جائے گا اس لیے انہوں نے ساری عمر افغانوں کی خودی کو بیدار کرنے کی کوشش کی۔ ۱۹۳۳ء میں افغانستان جانے سے کچھ دنوں پہلے، میرے ایک اعتراض کے جواب میں اُنہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ

"تم جذباتی ہو، اس لیے نادر شاہ سے ناراض ہو۔ یہ دیکھو کہ بچہ سقہ کو ختم کرکے اُس نے کتنی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ میں جلبِ منفعت کے لیے نہیں جا رہا ہوں، مجھے محض اسلامی اخوت کا جذبہ کھینچے لیے جا رہا ہے کیا عجب کہ میں اس قوم کی بیداری میں کوئی حصّہ لے سکوں۔"

مرحوم نے ایک مرتبہ مجھ سے کہا تھا کہ

"ہندوستان کے مسلمان تو کئی سو سال سے غلامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں انگریز کا مقابلہ اگر کر سکتے ہیں تو وہ مسلمان کر سکتے ہیں، جو پشاور اور کابل کے درمیانی علاقہ میں رہتے ہیں، کاش! کوئی اللہ کا بندہ ان کوہستانی شیروں کو بیدار کر سکے۔"

ان نظموں میں اقبالؔ نے درپردہ مسلمانوں کو اس حقیقت سے بھی آگاہ کیا ہے کہ کوہستانی، صحرائی یا بدوی زندگی، خودی کی تربیت کے لیے بہت موزوں ہے۔ اور میں اس باب میں اقبال سے بالکل متفق ہوں کم از کم کراچی لاہور، ملتان اور راولپنڈی وغیرہ کی اخلاقی فضا تو پرورش خودی کے لیے بالکل موزوں نہیں ہے۔ ان شہروں میں کالج، اسکول، بورڈنگ ہوٹل، کیفے، کافی ہاؤس (RACE) کلب اور سینما الامان! الحفیظ!

یہ تعلیم گاہیں، اور تفریح گاہیں نہیں ہیں، بلکہ وہ مقامات ہیں، جہاں مسلمان

لڑکوں اور لڑکیوں کی اسلامی روح بغیر کارد و خنجر، ذبح کی جاتی ہے اور بڑی بیدردی کے ساتھ ذبح کی جاتی ہے۔ اور جب تک موجودہ نظام کو تبدیل نہ کیا جائے اصلاحِ حال کی کوئی صورت نہیں ہے۔

—— (۱) ——

اس نظم میں محراب گل اپنے کوہستانی وطن سے خطاب کرتا ہے کہ:۔

(۱) اے میرے وطن! مجھے تجھ سے بحد اُلفت ہے۔ میں تجھے کسی قیمت پر غیروں کے حوالہ نہیں کر سکتا۔ میری تمام خاندانی روایات تیری چٹانوں سے وابستہ ہیں، اور ان میں میرے بزرگوں کی ہڈیاں مدفون ہیں۔

واضح ہو کہ اس شعر سے اس محبت کا اظہار ہوتا ہے جو ہر شخص کو اپنے وطن سے قدرتی طور پر ہوتی ہے۔ اس جگہ یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اقبال تو یہ کہتے ہیں ؎

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

پھر وہ افغانوں کو اپنے کوہستانی وطن سے محبت کرنے کی تلقین کیوں کرتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وطن کے دو معنی ہیں:۔

(۱) وطن بمعنی وطنیت یعنی ایک سیاسی تصور، جس کی رو سے ایک شخص صرف اپنے وطن سے محبت کرتا ہے اور دوسرے ملکوں یا قوموں سے نفرت کرتا ہے، اور اپنے وطن کو وہ درجہ دیتا ہے جو اسلام نے اللہ کو دیا ہے۔ اس معنی میں وطن کی محبت اقبال کے یہاں مذموم ہے۔

(۲) وطن بمعنی وہ ملک جہاں ایک شخص پیدا ہوا ہو، اور اُس سے قدرتی طور پر محبت ہوتی ہے۔ یہ محبت اقبال کے یہاں محمود ہے اور اسی اعتبار سے شیخ سعدی نے یہ رباعی لکھی تھی جو زبان زد خاص و عام ہے۔

حُبِّ وطن از ملکِ سلیماں خوشتر　　خارِ وطن از سنبل و ریحاں خوشتر
یوسف کہ بمصر پادشاہی میکرد　　میگفت گدا بودنِ کنعاں خوشتر

اقبال نے جو یہ کہا ہے کہ ؎

مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

یہ قول، وطن سے محبت کے خلاف نہیں ہے بلکہ نظریہ وطنیت کے خلاف ہے۔ یعنی اقبال وطن پرستوں سے یہ کہتے ہیں کہ جو مرتبہ تم اپنے مخصوص وطن کو دیتے ہو، وہی درجہ ہم ساری دنیا کو دیتے ہیں تم اپنی ساری ہمدردی ایک مخصوص خطّہ ارضی سے وابستہ کرتے ہو، لیکن ہم اپنی ہمدردی ساری دنیا سے وابستہ کرتے ہیں۔ کیونکہ ہم جس اللہ پر ایمان لائے ہیں وہ صرف اٹلی یا انگلستان یا جرمنی یا فرانس کا رب نہیں ہے بلکہ رب العالمین ہے۔ ساری کائنات کا پرورش کرنیوالا ہے اس لیے ہم اس کے پرستار ہونیکی حیثیت سے مجبور ہیں کہ کسی قوم سے نفرت نکریں۔ کسی سے دشمنی نہ کریں، سب انسانوں کو اپنا بھائی سمجھیں، سب کی خیر خواہی کریں۔

اب رہا اپنا وطن، اُس سے محبت کرنا بالکل قدرتی بات ہے۔ اور اگر کوئی دشمن ہم پر حملہ آور ہو تو ہم اپنے وطن کی حفاظت میں اپنے خون کا آخری قطرہ بہا دیں گے، لیکن تم وطن پرستوں کی طرح ہم اپنے وطن کو اپنا معبود نہیں سمجھتے، مثلاً اگر ہمیں اپنے وطن میں اللہ کا نام لینے کی اجازت نہ ہو یا ہم وہاں اسلامی زندگی بسر نہ کر سکیں تو پھر ہم اپنے وطن سے، بخوشی ہجرت کر کے دوسری جگہ چلے جائیں گے جہاں ہم اللہ کا نام لے سکیں۔ وطن کی محبت ہمیں ترک اسلام پر آمادہ نہیں کر سکتی۔ اگر ہمارے سامنے یہ دو صورتیں ہوں کہ، یا اسلام ترک کرو، یا وطن ترک کرو۔ تو ہم بلا تامّل دوسری صورت اختیار کریں گے۔ یہ ہے مفہوم اس مصرع کا:۔

"مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا"

(۲) اے میرے کوہستان! تیری سب سے بڑی خوبی یہ ہے، کہ تو قدیم زمانہ سے باز، شاہین، چرغ اور دوسرے شکاری پرندوں کا مسکن ہے اور بلبل کے نغموں اور گلاب اور لالہ کے پھولوں سے پاک ہے۔ بظاہر یہ شعر بہت آسان ہے۔ اس میں کوئی لفظ مشکل نہیں ہے لیکن اقبال نے رمز و ایما سے کام لے کر اس میں بڑے شاندار معانی پوشیدہ کر دیے ہیں۔

شاہین تو ایک مشہور و معروف شکاری پرندہ ہے، اور اقبال کا محبوب ہے کیونکہ وہ اُن خصوصیات کا حامل ہے جو وہ اپنی قوم کے نوجوانوں میں پیدا کرنا چاہتے تھے۔ لیکن چرغ غیر معروف ہے۔ واضح ہو کہ یہ شکاری پرندہ جسامت میں شاہین سے بڑا اور باز کے برابر ہوتا ہے۔ اور جس طرح ہر شکاری پرندہ میں ایک خصوصیت ہوتی ہے اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ زبردست پرندہ چیل جیسی طاقتور اور چالاک ہستی کا شکار کرتا ہے' جو خود دوسروں کا شکار کرتی ہے۔ چرغ کی چونچ اس قدر طاقتور ہوتی ہے کہ وہ اس کی مدد سے چیل کی گردن کی ہڈی توڑ دیتا ہے۔ اور اپنے سے بڑے پرندے کو اپنی چونچ میں اس طرح لٹکائے اڑتا ہے، جس طرح چیل، چوہے کو۔

چرغ اور چیل کی لڑائی بلا مبالغہ دنیا کے دلکش ترین مناظر میں سے ہے یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص اس منظر کو مدۃ العمر فراموش کر سکے۔ اگرچہ اس دلکشی کا اظہار لفظوں سے کسی طرح ممکن نہیں، تاہم میں اس جنگ کا تھوڑا سا حال ضرور بیان کروں گا تاکہ ناظرین پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے کہ اقبال نے چرغ کا تذکرہ بلا وجہ نہیں کیا۔

ب

۴۰ ج چیل ا

د

قاعدہ یہ ہے کہ جنگل میں پہنچ کر، چرغ کی آنکھوں سے ٹوپی اُتار کر اُسے اشارہ سے کوئی چیل دکھا دیتے ہیں، تو وہ مقام الف سے چڑھائی شروع کرتا ہے۔ عموماً الف اور ب کا فاصلہ ایک ہزار فٹ سے کم نہیں ہوتا۔ یہ اس لیے کہ چیل اگر فوراً آگاہ ہو جائے تو چرغ کی چڑھائی کا لطف جاتا رہے تھوڑی دیر کے بعد چیل جس کی آنکھ بہت تیز ہوتی ہے، بلکہ تیزی میں ضرب المثل ہوتی ہے چرغ کو دیکھ لیتی ہے اور اونچی ہونے لگتی ہے۔ چرغ بھی ساتھ ساتھ اُونچا ہوتا ہے۔ اور اپنی جسمانی طاقت، اور بازوؤں کی بے پناہ قوت کی بدولت، جب چیل نقطۂ جیم پر پہنچتی ہے تو وہ نقطۂ ب پر پہنچ جاتا ہے۔ یعنی چیل سے ۱۵ تا ۲۰ فٹ بلند تر۔ یہاں سے وہ کُندے تول کر چیل پر گرتا ہے (ٹھیک جس طرح آج کل تیراک اوپر سے حوض میں گرتا ہے۔) چیل کن انکھیوں سے دیکھتی رہتی ہے اور جس وقت چرغ، اُس سے ایک فٹ کے فاصلہ پر رہ جاتا ہے، نہایت پھرتی کے ساتھ کاواکاٹ دیتی ہے جسے شکاریوں کی اصلاح میں ڈاج (DODGE) دینا کہتے ہیں۔ چرغ اس سُرعت کے ساتھ آتا ہے کہ وہ نقطۂ دال تک ڈوب جاتا ہے۔ اور چیل، فوراً اور اُونچی ہو جاتی ہے۔ اب چرغ مقام دال سے کمال سرعت کے ساتھ پلٹ کر، بخطِ مستقیم پھر چیل کا تعاقب کرتا ہے۔ اور اس صعود یعنی بالکل سیدھی چڑھائی میں، اپنی جسمانی طاقت، حوصلہ، بازوؤں کی قوت، اور

سرگرمی (بلکہ اقبال کی اصطلاح میں پرِّ دمی) کا وہ مظاہرہ کرتا ہے کہ دنیا کا کوئی پرندہ اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتا۔

الغرض وہ دوبارہ، چیل سے ۱۵-۲۰ فٹ بلند ہوتا ہے۔ واضح ہو کہ چیل اب اُس مقام پر نہیں ہے، بلکہ کچھ فاصلہ پر ہوتی ہے۔ جسے میں نے نقطۂ ہ سے واضح کیا ہے اور پھر پہلا سین (منظر) دوبارہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ تماشائی لوگ ایسے از خود رفتہ ہو جاتے ہیں کہ اس موقع پر خود تماشا بن جاتے ہیں۔ میں نے بعض اوقات چرغ کو بیسؔ مرتبہ اسی طرح چیل پر گرتے دیکھا ہے۔ اور بعض اوقات میں تین تین میل تک جنگل میں بھاگتا چلا گیا ہوں، تاکہ یہ منظر نگاہوں سے اوجھل نہ ہو جائے۔

انجام کار ایک دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ چیل، چرغ کی زد میں آجاتی ہے اور وہ اُس کی گردن پکڑ کر ایک ہی جھٹکے میں اسے آدھ مُوا کر دیتا ہے۔ اور پنجے کے بجائے چونچ ہی میں لیے ہوئے زمین پر اُترتا ہے۔

تماشائیوں کا یعنی شکاریوں کا ہجوم بے تحاشا اس کے پاس جا پہنچتا ہے۔ اور بازدار (جس نے اس کو سدھایا ہے) چیل اس کے پنجے سے نکال کر، مُرغ کا سینہ یاران اس کو کھانے کے لیے دیتا ہے۔ جب تک میں نے چرغ کو ڈوب کر دوبارہ چڑھتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، اقبال کا یہ مصرع میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ ع

"پرِّ دم ہے اگر تو، تو نہیں خطرۂ اُفتاد"

اب ہم اس شعر کے مفہوم پر غور کرتے ہیں۔ اقبال نے کوہستان کی دو خوبیاں بیان کی ہیں۔

(۱) یہ علاقہ، شاہین اور چرغ کا مسکن ہے۔

(۲) یہاں گل (گلاب) لالہ اور بلبل نہیں ہوتا۔

اور اقبال یہی دو خوبیاں اپنی قوم کے نوجوانوں میں دیکھنی چاہتے تھے وہ چاہتے تھے کہ قوم کے نوجوان اپنے اندر شاہینی صفات پیدا کریں۔ اور آرائش جسمانی اور رقص و موسیقی سے اجتناب کریں۔ کیونکہ ان باتوں سے نسوانی صفات پیدا ہوتی ہیں اور جد و جہد کا جذبہ سرد ہو جاتا ہے۔

جب محراب گل، اپنے کوہستانی وطن کی یہ خوبیاں بیان کرتا ہے تو وہ درپردہ قوم کو یہ پیغام دیتا ہے کہ شاہین اور چرغ کی طرح اپنے بازوؤں میں طاقت پیدا کرو۔ اور بلبلوں کی طرح رنگ و بو پر فریفتہ مت ہو۔

یہ باتیں چونکہ صحرائی زندگی میں پیدا ہوتی ہیں۔ اس لیے اقبال اس طرزِ زندگی کو، شہری زندگی پر ترجیح دیتے ہیں۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کی زندگیوں کے مطالعہ سے بھی یہی حقیقت واضح ہوتی ہے کہ سیرت کی تشکیل، اس خطہ میں ہو سکتی ہے جو نغمۂ بلبل سے پاک ہو۔ اسی چیز کو اقبال نے اس مصرع میں بیان کیا ہے:۔ ؎

ہوائے دشت و شعیب و شبانیٔ شب و روز

(۳) اے میرے کوہستانی وطن! تو مجھے اس قدر عزیز ہے کہ تیرے خم و پیچ میری نگاہ میں بہشت بریں ہیں۔ تیری خاک میری نگاہ میں عنبر کی طرح قیمتی اور خوشبودار ہے۔ اور اس میں تو کوئی شک نہیں کہ تیرا پانی نہایت چمکدار اور شفاف ہے۔

(۴) جس طرح باز، کبھی تیتر اور کبوتر کی غلامی نہیں کر سکتا، اسی طرح میں کبھی انگریز کی غلامی نہیں کر سکتا۔ اور ایسا کر بھی کیسے سکتا ہوں! بیشک مجھے "خان بہادر" کا خطاب بھی مل جائے گا، اور موٹر بھی میرے پاس ہوگی

لیکن میرا ضمیر (کائنات میں سب سے قیمتی چیز، خدا کی سب سے بڑی نعمت) مُردہ ہو جائیگا۔ اور جب ضمیر مُردہ ہو گیا تو انسان اور گدھے یا گھوڑے میں کوئی فرق نہیں رہتا، یعنی ضمیر کے مُردہ ہو جانے کے بعد پھر حضرتِ انسان کے پاس وہ چیز کونسی ہے جس کی بدولت اُسے حیوان پر تفوق یا برتری حاصل ہو سکتی ہے! محراب گل کی رائے میں غلامی سے انسان پر موت طاری ہو جاتی ہے، صرف "حیوان" باقی رہ جاتا ہے اور اس حیوان اور دیگر حیوانات میں کوئی فرق نہیں ہے۔

(۵) محراب گل اپنی شان فقر سے خطاب کر کے کہتا ہے کہ اگر میں انگریز کی غلامی اختیار کر لوں، تو آج میری ظاہری حالت میں انقلاب پیدا ہو سکتا ہے۔ جب وہ پشاور، یا کوئٹہ، میں دربار منعقد کرے گا تو دوسرے غلاموں کے ساتھ مجھے بھی شرکت کی دعوت آئے گی۔ اور خلعتِ فاخرہ عنایت ہوگا۔ لیکن میں اس خلعت پر جو ضمیر فروشی کے بعد حاصل ہو، اپنی پھٹی ہوئی شلوار کو ترجیح دیتا ہوں، اور حقیقت یہ ہے، کہ محراب گل کا فیصلہ صحیح ہے۔

(۲)

(۱) اس نظم میں اقبال نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے، اُسی وقت سے مختلف اقوام میں رقابت کا بازار گرم ہے۔ کیونکہ رقابت کا جذبہ، افراد کی فطرت میں داخل ہے۔ اور دنیا میں پہلی خونریزی (اشارہ ہے ہابیل کے بیگناہ مقتول ہونے کی طرف) اسی جذبۂ رقابت یا حسد کا نتیجہ تھی۔ اور یہ سلسلہ اسی طرح تاقیامت جاری رہے گا۔ اندریں حالات اگر ہمارے اندر، بدقسمتی سے یہ غلط عقیدہ راسخ ہو جائے کہ ہم "فلکِ پیر" یعنی کارکنان قضا و قدر کی نگاہوں میں محبوب

ہیں اس لیے ہم کو دوسری قومیں نقصان نہیں پہنچا سکیں گی، تو یہ ہمارے حق میں بہت مضر ثابت ہوگا۔ کیونکہ اگر ہم یہ یقین کرلیں کہ ہم "اللہ میاں کے لاڈلے" ہیں، اور ہمیں کوئی زیر نہیں کرسکتا تو لامحالہ کچھ عرصہ کے بعد ہم جدوجہد اور تنازع للبقاء سے بیگانہ ہوجائیں گے۔ اور یہ بیگانگی ہمارے حق میں بلامبالغہ پیام موت ثابت ہوگی۔

سب سے پہلے یہ عقیدہ بنی اسرائیل میں پیدا ہوا، اُنھوں نے دعویٰ کرنا شروع کیا کہ ہم خداوند کے لاڈلے بیٹے ہیں۔ ہمیں نہ اس دنیا میں کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے، نہ اُس دنیا میں، لیکن اس عقیدہ کا نتیجہ دُنیا نے بہت جلد دیکھ لیا، کہ یہود ساری دنیا میں ذلیل وخوار ہیں اس کے بعد مسلمانوں میں بھی یہ عقیدہ پیدا ہوگیا، اور اس کا نتیجہ آج بیسویں صدی میں ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ تفصیل کی ضرورت نہیں۔ صرف ایک فقرہ میں ہماری حالت بیان کی جاسکتی ہے کہ آج کوئی قوم ہم سے زیادہ ذلیل وخوار نہیں ہے۔

برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

(۲) پس جب یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ

(ا) اقوام عالم میں رقابت کا جذبہ، فطری طور پر موجود ہے۔

(ب) خدا کی نظر میں سب قومیں یکساں ہیں۔ کوئی قوم اس کی محبوب (FAVOURITE) نہیں ہے جو قوم بھی اس کے قوانین کی پابندی کرے گی، وہ دنیا میں سربلندی حاصل کرے گی۔

تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ "خودی میں ڈوب جائیں"۔ (ڈوبنے سے اقبال کی مراد ہے، پہلے اپنی مخفی طاقتوں کا شعور حاصل کرنا، پھر اُن طاقتوں کو بروئے کار لانا) یعنی اپنی خودی کی تربیت کرکے اُسے نقطۂ کمال

تک پہنچا دیں۔ اور اس حقیقت کو مدِنظر رکھیں، کہ اس سلسلہ میں اگر دشواریاں، مصیبتیں، پریشانیاں اور تکالیف پیش آئیں تو ہرگز کبیدہ خاطر نہ ہوں، کیونکہ ہر زخم، در پردہ اہتمام رفو ہے۔ یعنی خودی ہمیشہ آزمائشوں اور مصیبتوں کی بھٹی میں پڑکر کندن بنتی ہے۔ کیونکہ میل کچیل کے صاف کرنے کا اس کے سوا اور کوئی طریقہ نہیں ہے۔

(۳) اے مسلمان! تو یورپ کی قوموں کی ظاہری شان و شوکت سے ہرگز مرعوب نہ ہونا۔ اگر تو اس صداقت کو اپنے دل و دماغ کی گہرائیوں میں اُتار دے کہ جس طرح تخلیق اور ربوبیت کائنات میں کوئی ہستی اللہ کی شریک نہیں ہے اُسی طرح حکومت اور فرمانروائی میں بھی کوئی شخص اُس ایزدِ متعال کا شریک وسہیم نہیں ہے۔ تو میں تجھے یقین دلاتا ہوں کہ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت (مثلاً امریکہ یا روس) تجھ کو زیر نہیں کرسکیں گی۔

واضح ہو کہ ایک عرصہ سے مسلمانوں کی نکبت اور زبوں حالی کا سب سے بڑا سبب یہی ہے کہ وہ اس حقیقت کبریٰ اور صداقت عظمیٰ سے بالکل بیگانہ ہوگئے ہیں۔ کہ لَا شَرِیْکَ لَہٗ کا مطلب صرف یہی نہیں کہ ذات کے اعتبار سے اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے۔ بلکہ صفات، عبادت اور اطاعت کے لحاظ سے بھی کوئی ہستی اس کی شریک یا مدِمقابل یا ہمسر نہیں ہے۔

مسلمان، مدتوں سے، اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ شرک، جس سے بڑا کوئی گناہ نہیں (بفحوائے آیت قرآنی اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ بیشک اللہ اس جرم یا گناہ کو کبھی معاف نہیں کرے گا کہ کوئی انسان کسی کو اس کا شریک قرار دے۔" صرف اسبات کا نام ہے کہ کوئی شخص اللہ کے

علاوہ کسی اور ہستی کو بھی، اس کا ہمسر یا شریک تسلیم کرے۔ حالانکہ شرک کا مفہوم اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔

واضح ہو کہ شرک کی چار قسمیں ہیں:۔

(ا) **شرک فی الذات**:۔ جس کی تشریح اوپر بیان ہو چکی ہے اس کی رو سے مجوسی جو دو خداؤں کو مانتے ہیں، اور نصاریٰ جو تین خداؤں کو تسلیم کرتے ہیں، اور ہنود جو بقول رگ وید ۳۳ خداؤں پر ایمان لاتے ہیں، سب مشرکوں کی فہرست میں داخل ہیں۔

(ب) **شرک فی الصفات**:۔ یہ ہے کہ ایک شخص خدا کو تو ایک مانتا ہے لیکن اس کی صفات میں دوسروں کو بھی شریک کرتا ہے۔ مثلاً اللہ کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ بیماروں کو اچھا کرتا ہے، اور مصیبتوں کو دور کرتا ہے، اور مشکل کشا ہے، حاجت روا ہے، دستگیر ہے۔ بلاؤں کو دفع کرتا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اب اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھے کہ زید، یا فلاں شخص میں یہ قدرت ہے کہ وہ بذاتِ خود، بیماروں کو صحت دے سکتا ہے۔ زندگی بخش سکتا ہے۔ اور مصائب کے وقت انسانوں کی دستگیری کر سکتا ہے، یا مشکل کشائی کر سکتا ہے۔ تو اگرچہ عرفِ عام میں وہ مشرک نہیں ہے، لیکن قرآنی تعلیمات کی رو سے وہ بھی مشرک ہے ٹھیک اسی طرح، جس طرح شرک فی الذات کا معتقد۔

(ج) **شرک فی العبادۃ**:۔ یہ ہے کہ انسان کسی دوسری ہستی کی توقیر یا تعظیم اسی رنگ میں کرے، جس رنگ میں وہ اللہ کی توقیر یا تعظیم کرتا ہے۔ یا جس طرح اللہ کو سجدہ کرتے ہیں، غیر اللہ کو سجدہ کرنے لگے[1]

---

[1] حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ نے اسی لیے دربارِ عام میں، زن مرید (باقی بر صفحہ ۴۰۱ پر)

(د) **شرک فی الحکم**:۔ یہ ہے کہ کوئی مسلمان، اللہ کے قانون کے علاوہ کسی انسان یا غیر اللہ کے بنائے ہوئے قانون کی اطاعت کرے، چنانچہ قرآن حکیم میں صاف ارشاد ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ	اور جو کوئی حکم نہ کرے اُس کے موافق جو اللہ نے اُتارا، سو وہی لوگ ہیں کافر

(سورۂ مائدہ رکوع ۷)

یعنی مسلمان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ میں، ہر معاملہ میں اور ہر بات میں قرآن حکیم کے فیصلہ کے علاوہ اور کسی کتاب یا ضابطہ، یا قانون کے فیصلہ کے سامنے سرِ تسلیم خم نہیں کر سکتا۔

افسوس کہ مسلمانوں نے ملوکیت کی لعنت میں مبتلا ہو جانے کی بدولت، شرک کی اس چوتھی قسم کو اپنے عقائد سے خارج کر دیا اور اس کی ذمہ داری بلاشبہ اُن امراء، علمائے سوء اور مشائخ سوء پر عائد ہوتی ہے، جنہوں نے اپنے ذاتی مفاد کی خاطر ملوکیت کے سامنے، سرِ تسلیم خم کر دیا۔ چنانچہ اُن کے اس غیر اسلامی طرزِ عمل کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان رفتہ رفتہ اس حقیقت سے بالکل بیگانہ ہو گئے کہ سلاطین کے نافذ کردہ قوانین کی اطاعت بھی شرک ہے۔

میں اپنے یقین کی پوری قوت کے ساتھ اس حقیقت کا اعلان کرتا ہوں کہ آج تمام دنیا کے مسلمانوں کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ اُن کو اس حقیقتِ کبریٰ سے پھر آگاہ کیا جائے کہ جس آئین کی بنیاد، قرآن اور سنت نبوی پر نہ ہو، اس کی اطاعت قطعاً ناجائز ہے۔

(بقیہ صفحہ ۴۰۰) جہانگیر ابن اکبر مرتد کو سجدہ نہیں کیا تھا، کیونکہ، یہ فعل سراسر مشرکانہ ہے۔ ۱۲

(۳)

اس نظم میں اقبالؔ نے محراب گل کی زبان سے دعا کا فلسفہ بیان کیا ہے۔ اور اس کے ضمن میں اس حقیقت کو دلنشین انداز میں بیان کیا ہے کہ دعا کے ساتھ ساتھ جدوجہد بھی ضروری ہے۔

واضح ہو کہ اسلام ایسا دین یا دستورِ حیات ہے، جو نہ انسان کو محض دُعا پر بھروسہ کرنے کی تلقین کرتا ہے، اور نہ محض ذاتی جدوجہد پر اعتماد کرنا سکھاتا ہے۔ بلکہ وہ ان دونوں ضروری باتوں میں ہم آہنگی پیدا کر دیتا ہے۔ یعنی دُعا بھی کرو اور جدوجہد سے بھی غافل نہ ہو۔

دعا یعنی اللہ کو پکارنا، بمعنی اینکہ اُس سے اپنی حاجت یا ضرورت کو پورا کرنے کی التجا کرنا، یہ فعل دینِ اسلام کی روح ہے۔ بلکہ نفس مذہب کا دارومدار دعا ہی پر ہے۔ دعا ثبوت ہے اس بات کا بندہ اپنی عاجزی، بیچارگی، درماندگی، اور کمزوری کا اقرار کر رہا ہے۔ اور اللہ کو اس کائنات کا خالق، رازق، مالک اور حاکم تسلیم کر رہا ہے۔ اس دوگونہ اعتراف سے انسانی روح کا اللہ کی ذات سے ایک ورا ءالفہم طریق پر رابطہ (COMMUNION) یا رشتہ یا علاقہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور چونکہ انسان کی پیدائش سے مقصد بھی یہی ہے۔ اس لیے میں نے دعا کو مذہب کی روح سے تعبیر کیا ہے۔ اور میری کیا حقیقت ہے؟ یہ نکتہ میں نے حضور سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد مبارک سے اخذ کیا ہے۔ جو یہ ہے۔ الدّعاءُ مخ العبادۃ۔ یعنی دعا عبادت کا مغز ہے۔

بعض لوگ اپنی کوتاہ بینی سے یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جب ہماری دعاؤں سے قضاء (مشیّتِ ایزدی) یا نظام کائنات نہیں بدل سکتی تو پھر دُعا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یا اس کا کیا فائدہ ہے؟ جب ہماری دعاؤں سے اللہ

کے فیصلوں میں تبدیلی نہیں ہو سکتی تو ہم اس "فعل عبث" کا ارتکاب بھی کیوں کریں؟

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ دُعا کی غرض و غایت یہ نہیں ہے کہ تم مشیتِ ایزدی میں مداخلت کر دیا خدا سے یہ درخواست کرو کہ وہ دنیا کا نظام تمہاری خواہش کے مطابق چلائے۔ بلکہ دعا سے مقصد یہ ہے کہ:۔

(۱) بندہ کے دل میں ہر وقت اپنی بندگی کا احساس پیدا ہوتا رہے۔
(۲) بندہ ہر وقت اپنے خالق اور معبود سے رابطہ استوار کرتا رہے۔
(۳) بندہ اپنے آپ کو فاعل یا مؤثرِ حقیقی نہ سمجھنے لگے۔

واضح ہو کہ دنیا میں ہر قسم کی بیدینی اور خرابی کا سرچشمہ یہی غلط عقیدہ تو ہے کہ انسان، اپنے آپ کو فاعل یا مؤثرِ حقیقی سمجھتا ہے۔ لیکن دعا کرنے سے انسان کے اندر نہ کبھی تکبّر پیدا ہو سکتا ہے اور نہ وہ صراطِ مستقیم سے بھٹک سکتا ہے

(۴) بندہ دعا کے ذریعہ سے ذکرِ الٰہی کا خوگر ہو جاتا ہے۔ اور اللہ کو یاد کرنا اور یاد کرتے رہنا، یہ سب سے بڑی نیکی ہے۔ جس سے بڑی کوئی نیکی نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن مجید صاف لفظوں میں ارشاد فرماتا ہے وَلَذِکرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ کا ذکر سب عبادتوں، اور نیکیوں سے بڑھ کر ہے۔

اب ہم نظم کا مطلب لکھتے ہیں۔

(۱) کہتے ہیں کہ یہ تو بیشک ممکن نہیں ہے کہ تیری دعاؤں سے اللہ اپنے فیصلوں کو بدل دے۔ یعنی ہو گا تو وہی جو وہ چاہتا ہے مثلاً زید ایک شریف آدمی ہے، وہ ہندہ سے نکاح کا طالب ہے۔ اس لیے دعا کرتا ہے۔ اب اگر اُس کی یہ آرزو، مشیتِ ایزدی کے مطابق نہیں ہے تو اُس کی یہ دُعا

بھی قبول نہیں ہوگی۔ لیکن دعا مواظبت[1] کرتے سے، یہ ضرور ممکن ہے کہ خود تیرے اندر انقلاب پیدا ہو جائے۔ وہ یہ کہ تو اپنا رابطہ اللہ سے اُستوار کرے۔ اور یوں تیرے اندر اُس کے قوانین کی اطاعت کا جذبہ پیدا جائے۔

اگر ایسا ہو جائے، اور ایسا ہو جانا ممکن ہے، تو یہ حقیقت ضرور تجھ پر منکشف ہوگی کہ اگر ایک طرف اللہ نے کائنات کا انتظام اپنے دستِ قدرت میں رکھا ہے، تو دوسری طرف ہمیں جد وجہد کا بھی حکم دیا ہے۔ یعنی ہم سے اللہ نے صاف، لفظوں میں فرما دیا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ، یعنی اللہ نے یہ قانون بنا دیا ہے کہ وہ کسی قوم کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں کرتا جب تک وہ قوم پہلے خود اپنے ضمیر کی گہرائی میں تبدیلی نہ کرے۔ جب ہم اس قانون پر غور کریں گے تو یقیناً ہمارے اندر صحیح اسلامی شعور پیدا ہو جائے گا، اور قرآن مجید میں جس قدر قوانین بیان کئے گئے ہیں، اُن کا مقصد صحیح شعور پیدا کرنا ہی تو ہے۔ اور ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، کہ انقلاب کا وقوع شعور پر موقوف ہے۔

قرآن حکیم شعور میں انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ اور جب کسی فرد یا قوم کے شعور میں انقلاب پیدا ہو جاتا ہے، تو وہ قوم اپنی خودی میں انقلاب پیدا کر سکتی ہے اور جب کسی قوم کی خودی میں انقلاب پیدا ہو جاتا ہے تو پھر وہ قوم دنیا میں انقلاب پیدا کر دیتی ہے۔

اقبال نے جاوید نامہ میں قرآن حکیم کی اس صفت کو ان اشعار میں بیان کیا ہے

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت، جاں دیگر شود جاں چو دیگر شد، جہاں دیگر شود

---

[1] استغفار: ۱۲۰

واضح ہو کہ قرآن حکیم، آسمان کے نیچے، انقلاب کا سب سے بڑا، پروگرام ہے لیکن ہم مسلمانوں کی جہالت کے باعث اس زمانہ میں یہ انقلابی منشور، یہ زندگی کا پیغام، محض گنڈوں اور تعویذوں کا خزانہ بن کر رہ گیا ہے۔!

مطلب یہ ہے کہ اے مسلمان! اگر تو سچے معنوں میں مسلمان بن جائے تو عجب نہیں ہے کہ یہ چار سُو بدل جائے یعنی یہی دنیا جس میں آج تو کسی جگہ عزت کی زندگی بسر نہیں کر سکتا، یہی دنیا جس میں کوئی قوم تجھ سے خائف نہیں ہے۔ اسی دنیا میں تو سر بلند ہو سکتا ہے اور اقوامِ عالم، تجھ سے مرعوب ہو سکتی ہیں۔

نوٹ:۔ اسی لیے میں گذشتہ بیس سال سے اپنی قوم کو بڑے خلوص کے ساتھ یہ مشورہ دے رہا ہوں، کہ اگر سر بلندی کامیابی اور حکمرانی کی آرزو ہے تو افراد قوم، اپنی خودی میں انقلاب پیدا کریں، اس کے بغیر خارجی دنیا میں کوئی انقلاب پیدا نہیں ہو سکتا۔

"یہی وجہ ہے کہ انگریز کی نگاہ کرم کے صدقہ میں پاکستان بن جانے کے باوجود مسلمانوں کی زندگی میں کوئی انقلاب پیدا نہ ہو سکا، اور نہ ہو سکتا ہے جو عُریانی فحاشی اور عیاشی، قیام پاکستان سے پہلے سندھ اور پنجاب میں پائی جاتی تھی، وہی بلکہ اُس سے بڑھ کر آج پائی جاتی ہے۔ کیا اب بھی مسلمانوں کو اس قانون کی صداقت میں کوئی شک وشبہ باقی ہے۔ کہ "زندگی اپنے حوالی میں کوئی انقلاب پیدا نہیں کر سکتی، جب تک اپنے ضمیر کی گہرائیوں میں انقلاب پیدا نہ کرے۔"

(دیباچہ پیام مشرق ص ۹)

(۳) اے مسلمان! اگر تو، قرآن حکیم کے مقرر کردہ خطوط پر، اپنی خودی میں انقلاب پیدا کرے گا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ اگرچہ شراب بھی وہی رہے گی اور

اس کی سرمستی بھی وہی رہے گی لیکن ساقی کا طریقہ اور مے نوشی کا انداز بدل جائے گا۔

یعنی یہ دنیا بھی وہی رہے گی، اور اُس کے علائق بھی وہی رہیں گے اور اس میں قوانین نافذ ہیں وہ بھی وہی رہیں گے، یعنی یہ نہیں ہوگا کہ انقلاب کے بعد پانی پیاس بجھانا چھوڑ دے گا، لیکن تیرے ساتھ اللہ کا طرزِ عمل بدل جائے گا۔

یعنی آج، اللہ کی نظرِ کرم، تجھ پر نہیں ہے، غیروں پر ہے، پھر یہ صورت بدل جائے گی، ساقی کی نگاہِ کرم تجھ پر بھی ہوگی۔

(۴) اس شعر کے دو مطالب ہیں :۔

پہلا مطلب یہ ہے کہ تو عموماً خدا سے یہ دعا مانگتا ہے کہ اے اللہ! میری فلاں فلاں آرزوئیں پوری ہو جائیں۔ مثلاً مجھے دولت عطا کر، یا حکومت میں کوئی بڑا عہدہ عطا کر، یا مجھے شہرت اور دنیاوی جاہ و منزلت عطا کر وغیرہ، لیکن میں تیرے حق میں یہ دعا کرتا ہوں کہ خدا کرے تیری یہ آرزوئیں بدل جائیں، اور تو خدا سے یہ دعا مانگا کرے کہ اے اللہ! مجھے دین کی خدمت کی توفیق عطا فرما، قرآن و حدیث کی اشاعت کی توفیق عطا فرما۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ، میری دعا یہ ہے کہ تو اس طرح اللہ کی محبت میں فنا ہو جائے کہ اپنی تمام آرزوؤں کو اس کی مرضی کے تابع کر دے، یعنی کوئی آرزو باقی نہ رہے، صرف یہ آرزو رہ جائے کہ اے اللہ میں صرف تیری رضا کا طالب ہوں اور جو کچھ تو میرے لیے پسند کرے، اُسی کو اپنے لیے پسند کرتا ہوں، یہ وہ مقام ہے جس سے بلند تر اور کوئی مقام نہیں ہے۔ اسی کو مقامِ تسلیم و رضا بھی کہتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر بندۂ مومن، مشیتِ ایزدی سے کامل ہم آہنگی پیدا کر لیتا ہے اقبال

نے اس مقام کو اپنے کلام میں کئی جگہ بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ صرف ایک شعر اس جگہ نقل کرتا ہوں ؎

چوں فنا اندر رضائے حق شود!
بندۂ مومن قضائے حق شود!

یعنی جب مومن، قرآن مجید کی اس آیت شریفہ پر عامل ہو جاتا ہے :۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ :۔

اے میرے پیارے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ اعلان فرما دیں کہ میری نماز اور جملہ مراسمِ دینی اور میری زندگی اور میری موت (میرا جینا، اور میرا مرنا) سب اللہ ہی کے لیے ہے۔ جو پروردگار ہے سارے جہان کا۔

یعنی وہ اپنے آپ کو پورے طور سے اللہ کی مرضی کا تابع بنا دیتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی مرضی اور اللہ کی مرضی میں ایک ورا الفہم مطابقت اور یگانگت پیدا ہو جاتی ہے جس طرح اگر لوہے کو آگ میں ڈال دیں تو اس میں اور آگ میں ہم رنگی پیدا ہو جاتی ہے اور اس ہمرنگی اور ہم آہنگی کی بدولت، وہ خود "قضائے حق" بن جاتا ہے۔ یعنی وہ وہی کرتا ہے جو خدا چاہتا ہے، اور خدا وہی حکم نافذ کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔

اسی نکتہ کو اقبال کے مرشد عارف رومیؒ نے یوں بیان کیا ہے :۔

در رضائیش مرضی حق گم شود
ایں سخن کے باورِ مردم شود

یعنی عام لوگ اس بات پر کیسے یقین لا سکتے ہیں کہ جب مومن پہلے اپنی مرضی، اللہ کی مرضی میں گم کر دیتا ہے، یعنی اپنے آپ کو "صِبْغَۃَ اللّٰہِ" یا اللہ کے رنگ میں رنگین کر لیتا ہے، تو پھر، مرضئ حق، اس بندۂ مومن کی رضا

میں گم ہو جاتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ

پنجۂ او پنجۂ حق می شود
ماہ از انگشتِ او، شق می شود

اس کا ہاتھ، بلا تمثیل، اللہ کا ہاتھ ہو جاتا ہے۔ اور اُس کی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی انگلی میں یہ طاقت پیدا ہو جاتی ہے کہ اس کے ایک اشارہ سے چاند کے دو ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ اگر کسی کو ان اشعار کا مطلب سمجھنے میں الجھن پیدا ہو تو وہ قرآن مجید کی اس آیت کو پڑھ لے۔

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ۔ اور اے میرے محبوب (صلی اللہ علیہ وسلم) جب جنگِ بدر میں آپؐ نے زمین سے کنکریاں اُٹھا کر کفار کی طرف پھینکی تھیں، تو در اصل آپؐ نے نہیں بلکہ خود اللہ نے پھینکی تھیں۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ۔

—— (۴) ——

اس نظم میں اقبال نے یہ نکتہ واضح کیا ہے کہ ملک اور حکومت یہ سب فانی ہیں یعنی آج زید دنیا کو اپنی ملک سمجھتا ہے، اور اس پر حکمراں ہے۔ کل بکر اور پرسوں خالد در اصل ملک اور حکومت دونوں اللہ کے قبضہ میں ہیں۔ وہ جسے چاہتا ہے، ملک عطا کرتا ہے۔ اور جس سے چاہتا ہے، ملک اور حکومت، دونوں چھین لیتا ہے۔ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَن تَشَاءُ وَتَنزِعُ الْمُلْكَ مِمَّن تَشَاءُ تو جسے چاہتا ہے، ملک عطا کرتا ہے، اور جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے۔

(۱) محراب گل کہتا ہے کہ کائنات میں غور کرو، تو یہ حقیقت منکشف ہو جائیگی کہ یہاں کسی شئے کو ثبات و قرار نہیں ہے۔ آسمان، سورج، چاند، تارے سب مسافر ہیں۔ اور ہر دم سفر میں ہیں، بالفاظ دگر ؎

ہر شئے مسافر، ہر چیز راہی!
کیا چاند تارے، کیا مرغ و ماہی!

(۲) دنیا کی تاریخ پر غور کرو، کیسے کیسے نامور بادشاہ گذر چکے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ مشرق سے لے کر مغرب تک انہی کے نام کا سکہ چلتا تھا، لیکن آج صرف اِن کا نام تاریخ میں باقی رہ گیا ہے۔ مثلاً سکندر کو دیکھو! یونان سے جو تسخیر ممالک کے لیے نکلا تو پنجاب تک سارے ممالک فتح کر لیے۔ لیکن چند روز کی علالت کے بعد راہی ملک عدم ہو گیا۔

(۳) نادر شاہ ایرانی کی فتوحات پر نظر کرو۔ کہاں طہران کہاں دلی لیکن ایک معمولی سپاہی نے اپنی تلوار کے ایک ہی وار سے اس کا قصہ تمام کر دیا۔

(۴) حقیقت یہ ہے کہ سکندر اور نادر، اور ان کے علاوہ بہت سے نامور سلاطین، اپنی اپنی نوبت بجا کر، دنیا سے چلے گئے ان میں سے کوئی بھی آج باقی نہیں ہے۔ ہاں افغان قوم باقی ہے۔ اور یہ قوم جس ملک میں رہتی ہے وہ بھی بدستور موجود ہے۔ بات در اصل یہ ہے کہ یہ دنیا نہ تیری ملک ہے، نہ میری "اَلْحُكْمُ لِلّٰهِ وَالْمُلْكُ لِلّٰهِ" حکومت اللہ ہی کی ہے اور یہ دُنیا اُسی کی مِلک ہے۔ ملک بھی اُسی کا ہے حکومت بھی اُسی کی ہے، انسان اُسی کے حکم سے، چند روز کے لیے حکمراں بن جاتا ہے۔ لیکن غلطی سے اپنے آپ کو مالک اور حکمراں سمجھ لیتا ہے۔

(۵) انسان، اگر اپنے ہی جیسے انسان کی غلامی پر کمر بستہ ہو جاتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ پہلے اپنی مادی خواہشات کا غلام بنتا ہے اور اس کے بعد اُن کی تسکین کے لیے انسانوں کی غلامی کرتا ہے۔

خواہش سے حاجت پیدا ہوتی ہے اور حاجت انسان کو غلامی پر آمادہ کر دیتی

ہے۔ یہ حاجت وہ بُری بلا ہے کہ انسان تو انسان ہے، شیروں کو بھی لومڑی بنا دیتی ہے۔

انچہ شیراں راکند روبہ مزاج!
احتیاج است احتیاج است احتیاج

(۶) لیکن، اگر، انسان، اپنی خواہشات کو اپنا غلام بنا لے، یعنی اپنی خودی سے آگاہ ہو جائے تو پھر وہ اللہ کے سوا، کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہیں کرے گا، اور یہ شان استغنا اُسے سلاطین کا ہم پلہ بنا دے گی۔

(۷) یاد رکھو! قوموں کی بگڑی ہوئی تقدیر صرف وہ مردِ درویش بنا سکتا ہے، یعنی صرف وہ مردِ مومن قوموں کو سربلندی عطا کر سکتا ہے جو کسی بادشاہ کے سامنے جا کر دستِ سوال دراز نہ کرے۔ بلکہ بادشاہ اگر اُسے کوئی عہدہ پیش کرے تو بھی قبول نہ کرے۔

چنانچہ بزرگانِ دین کی زندگیوں پر غور کرنے سے اس شعر کی صداقت عیاں ہو سکتی ہے۔ مثلاً سلاطین دہلی نے ہر چند کوشش کی، کہ حضرت محبوب الٰہی سلطان نظام الدین اولیاءؒ دربار میں تشریف لائیں۔ لیکن حضرت خود، کسی بادشاہ کے دربار میں تو کیا جاتے، کسی بادشاہ کو بھی اپنے دربار میں حاضر ہونے کی اجازت نہیں دی۔

سلطان قطب الدین مبارک خلجی نے اپنے وزیر کو حکم دیا، کہ "کل نظام الدین کو دربار میں حاضر کیا جائے۔" وزیر نے آنجناب کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ اگر آپ بخوشی حاضر نہ ہوئے تو میں آپ کو گرفتار کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دوں گا آپ نے قاصد سے فرمایا کہ "دیکھا جائے گا، کل تو ہونے دو۔"

رات کو بارہ بجے کے قریب آپ، ایک خاص حالت میں خانقاہ کے صحن

میں چہل قدمی فرما رہے تھے، اور یہ شعر وردِ زبان تھا۔

اے روبہک چرا نہ نشستی بجائے خویش
باشیر پنجہ کردی، و دیدی سزائے خویش

یہی وقت تھا جب سلطان کے محبوب غلام خسرو نے اُس بدبخت کو قتل کر کے لوگوں کے لیے سامانِ عبرت مہیا کر دیا۔

(۵)

اس نظم میں اقبالؔ نے یہ بتایا ہے کہ انگریزوں نے جو کالج اور اسکول ہندوستان میں قائم کیے ہیں، یہ محض فریب نظر ہیں۔ ان کا مقصد، انسانوں کو زیورِ علم و عمل سے آراستہ کرنا نہیں ہے بلکہ حکومت کے دفاتر کے لیے کلرک تیار کرنا، اور دل اور دماغ دونوں کو مُردہ کر دینا، تاکہ "آرزو" اوّل تو پیدا ہی نہ ہو، اور اگر ہو جائے تو زندہ نہ رہ سکے۔

(۱) محرابِ گُل کہتا ہے کہ اے مسلمان! آنکھیں کھول کر دیکھ! "یہ کالج اور اسکول یہ اُن کی شاندار عمارتیں! یہ وسیع کھیل کے میدان، یہ مخلوط تعلیم! یہ انٹر کالجیٹ"۔ قسم کی سرگرمیاں! یہ اولمپک ٹورنامنٹ! یہ مباحثہ کی مجلسیں یہ ٹرافیاں، یہ انعامات! یہ گاؤن (GOWNS) یہ ڈگریاں، بظاہر یہ باتیں بہت دلخوش کُن ہیں۔ لیکن تجھے ہر لحظہ، اسلامی حمیت اور دینی غیرت سے دُور کر رہی ہیں۔ یہ ایسا عیش ہے، جس سے ہر لحظہ غم میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

(۲) تو سمجھتا ہے کہ قوم زیورِ علم سے آراستہ ہو رہی ہے لیکن یہ "علم" جو کالجوں کے "درو دیوار" سے حاصل ہوتا ہے، علم نہیں ہے، بلکہ مسلمان کے حق میں زہر کا حکم رکھتا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ اس غیر اسلامی علم سے اسکی خودی مُردہ

ہو جاتی ہے، اس کا ضمیر مردہ ہو جاتا ہے۔ اور اس ڈگری کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا نکلتا ہے کہ وہ جوان جو اپنے آباؤ اجداد کی طرح (جیسے وہ ۱۸۵۷ء میں نکلے تھے، سر سے کفن باندھ کر میدان جنگ میں اپنی شجاعت کے جوہر دکھاتا، دفتروں میں فائلوں سے سر کھپاتا رہتا ہے، تاکہ "دو مٹھی جو،" ہاتھ آسکیں۔

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے
قبض کی روح تری دیکے تجھے فکرِ معاش

(۳) اے نادان مسلمان! انگریزوں نے مقصدِ حیات سے بیگانہ بنانے کے لیے تجھ کو ادبیات (عالیہ) اور فلسفہ کی خاردار جھاڑیوں میں اُلجھا دیا ہے۔ بیشک ادب اور فلسفہ اچھی چیز ہے، لیکن یہ چیزیں مقصود بالذات نہیں ہیں، بلکہ مقصود بالعرض ہیں۔ لہٰذا اگر تو ان علوم کو، جو مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ خود مقصد بنالے گا، تو تیرا مقصد تو حاصل نہیں ہوگا، لیکن انگریز کا مقصد حاصل ہو جائے گا۔

اے مسلمان! تیرا مقصدِ حیات، فلسفہ نہیں ہے بلکہ جہاد فی سبیل اللہ ہے یہ ہے وہ کام جس کے لیے تجھے اللہ نے پیدا کیا ہے۔ پس تو اپنے اندر جہاد کا جذبہ پیدا کر، اور اس جذبہ کے حصول کے لیے تگ ودو (کوشش) کر مسلمان کے لیے یہ بات قابل فخر نہیں کہ وہ اعلیٰ درجہ کا موسیقی داں ہو، یا شاعر ہو، یا مصور ہو، بلکہ یہ کہ وہ اعلیٰ درجہ کا مجاہد ہو، صف شکن ہو، شہسوار ہو، یعنی مردِ غازی ہو۔

(۴) ہنرمند کے دونوں معنی ہو سکتے ہیں۔
(ا) صاحبِ فن، مثلاً سائنسدان یا حکیم،
(ب) صاحبِ کمال، مثلاً مجاہد یا غازی،

محراب گل کہتا ہے کہ صاحبِ کمال، فطرت کے قوانین پر بھی غالب آجاتا ہے مثلاً پانی کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ نشیب کی طرف بہتا ہے، لیکن انجینئر اپنے کمال فن ہے اُسے اُونچائی کی طرف بہا سکتا ہے۔ الغرض کمال فن کی بدولت، انسان رات کو دن بنا سکتا ہے۔

(۵) اور جو شخص کسی فن میں کامل ہوتا ہے، وہ حیرت انگیز کارنامے دنیا کو دکھا سکتا ہے۔ مثلاً وہ کراچی میں بیٹھ کر لندن والوں سے گفتگو کر سکتا ہے محراب گل کہنا یہ چاہتا ہے کہ انگریزوں نے مسلمانوں (محکوموں) کے لیے جو نصاب تعلیم مدّون کیا ہے، اس کی غرض صرف، دفتروں کے لیے کلرک تیار کرنا تھی۔ نہ کہ اُن کے اندر تحقیق وانکشاف کی صلاحیت پیدا کرنا، اسلئے اگر مسلمان ترقی کرنا چاہتا ہے، تو اسے اپنا نظامِ تعلیم خود مدّون کرنا چاہیئے جو اُس کی ذاتی صلاحیتوں کو بیدار کر سکے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اُس میں اللہ کے لیے مر مٹنے کا جذبہ پیدا کر سکے کیونکہ مسلمان اگر مجاہد نہیں تو کچھ بھی نہیں۔

تو سرفروش نہیں ہے اگر، تو کچھ بھی نہیں،

(۶)

اس نظم میں اقبالؔ نے، ایجاد، تقلید، اور تجدید، ان تین باتوں پر اظہار خیالات کیا ہے۔ فرماتے ہیں :-

(ا) یہ دنیا، کوئی ساکن یا مکمل (تکمیل یافتہ) شئے نہیں ہے، بلکہ ایک متحرک اور ترقی پذیر، حقیقت ہے ہا اور کمال کی طرف حرکت کر رہی ہے۔

چنانچہ اسی خیال کو اقبال نے یوں ادا کیا ہے :-

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید　　　کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

الغرض دنیا، عالم ایجاد ہے، یہاں ہر لحظہ نئی نئی چیزیں عالم وجود میں آتی رہتی ہیں ہر وقت تخلیق اور ایجاد میں مصروف ہے اسی طرف قرآن کلیم اشارہ فرماتا ہے :-

"کُلَّ یَوۡمٍ هُوَ فِیۡ شَاۡنٍ"، یعنی اللہ ہر لحظہ اپنی قدرت کی جلوہ گری میں مصروف ہے۔" (سورہ رحمٰن ع ۲)

چونکہ اس کائنات میں، حرکت، تخلیق، اور ایجاد کا اصول کارفرما ہے، اس لیے قدرتی طور پر، جو شخص ان صفات سہ گانہ کا مظہر ہوگا، یعنی جس شخص کی ذات سے ان خوبیوں کا اظہار ہوگا، وہ اس دنیا میں بنی آدم کی نظروں میں محبوب اور محترم ہوگا۔ اور ہر زمانہ میں، ہر جگہ اہل زمانہ، اس کی عزت، اتباع، اور تقلید کرتے ہیں۔ مثلاً گلیلیو، کیپلر، نیوٹن، مادام کیوری، مارکونی وغیرہم یہ وہ لوگ ہیں۔ جن کو عالمگیر عزت حاصل ہے اور قیامت تک ان کا نام زندہ رہے گا

(۲) پس اے مسلمان! جب یہ مسلم ہے کہ عزت صاحب ایجاد کے لیے مخصوص ہے تو پھر تو بھی صاحب ایجاد بن۔ آخر تو غیروں کا مقلد کیوں بنا ہوا ہے! اس کی کیا وجہ ہے کہ گذشتہ تین سو سال میں، دنیا میں جس قدر ایجادات ہوئی ہیں، وہ سب کی سب، بلا استثنا غیر مسلموں کی مرہون منت ہیں ؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ تو نے کورانہ تقلید کی بدولت اپنی خودی کو ناکارہ کر دیا اے مسلمان! اپنی خودی کی حفاظت کر کیونکہ یہ تو انمول موتی ہے۔

نوٹ :- یہاں حفظِ تقلید تشریح طلب ہے۔ کیونکہ اس کے کم ازکم دو مختلف مفہوم ہیں :-

(ا) تقلید، قلادہ سے مشتق ہے، جس کے لغوی معنی ہیں وہ کالر، جو کسی

حیوان، مثلاً کتے کے گلے میں پڑا ہوا ہو۔ اس لیے تقلید کے معنی ہو گئے کسی کی اطاعت کرنا بلا چوں وچرا، یعنی آنکھ بند کر کے کسی کی پیروی کرنا، اور بطورِ خود تحقیق و اجتہاد سے بھی محترز رہنا۔ مثلاً فلسفہ ارسطو کی تقلید کے معنی یہ ہیں کہ ارسطو نے جو کچھ لکھ دیا ہے، اُس پر بلا چون وچرا ایمان رکھا جائے اور اُس کی حمایت کی جائے۔

(ب) تقلید، فقہا کی اصطلاح بھی ہے۔ اور فقہی اصطلاح میں اس سے مراد ہے فقہی مسائل میں ائمہ اربعہ (امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ اور امام حنبلؒ) میں سے کسی ایک امام کی پیروی کرنا، چنانچہ اس کی ضد "غیر مقلد" کے معنی یہ نہیں کہ وہ شخص جو محقق یا مجتہد ہے، بلکہ وہ شخص جو ان ائمہ اربعہ میں سے کسی کی پیروی نہیں کرتا، بلکہ براہ راست حدیث پر عمل کرتا ہے۔

چونکہ میں اس وقت شعر کا مطلب لکھ رہا ہوں، اس لیے "تقلید" کی ہزار سالہ تاریخ سے قطع نظر کرتا ہوں اور صرف تیسری نوع کا تذکرہ کرنے پر اکتفا کرتا ہوں، تاکہ یہ بحث مکمل طور پر سامنے آجائے۔

(ج) تقلید کی تیسری قسم، صوفیانہ تقلید ہے۔ یعنی مرشد کے احکام کی بلا چون وچرا تعمیل کرنا۔ چنانچہ لسان الغیب فرماتے ہیں ؎

بمۓ سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

پہلی بات یہ واضح کرنی چاہتا ہوں کہ مطلق تقلید سے کسی انسان کو مفر نہیں ہے۔ ہر شخص مقلد ہے۔ دوسروں کا، یا اپنے بزرگوں کا، یا اسلاف کا، یا آباؤ اجداد کا، یا سوسائٹی کا معاشرہ کا، یا ماحول کا، کسی نہ کسی رنگ میں حد یہ ہے کہ اگر کوئی شخص یہ اعلان کرے کہ "میں کسی کا مقلد نہیں ہوں"، تو وہ اُس حماقت کا مرتکب ہو جائے گا، جسے منطق میں "اجتماع ضدین" کہتے ہیں بالفاظ دگر

جب وہ شخص یہ الفاظ زبان پر لائیگا تو اُسی وقت انہی الفاظ کی بدولت وہ اپنے قول (زعم باطل) کی تردید بھی کردے گا کیونکہ اگر وہ درحقیقت کسی کا مقلد نہیں ہے تو پھر "اردو" کیوں بولتا ہے؟ اس بات کا اعلان کرنے کے لیے اُسے اپنی زبان ایجاد کرنی لازم ہے۔ لیکن اگر وہ ایسا نہیں کرتا، تو یہ اعلان بھی اُسے زیب نہیں دیتا کیونکہ اُس نے یقیناً اپنے والدین، اور اپنی سوسائٹی کی تقلید کی۔ کم ازکم اس زبان کے سیکھنے میں جس کے ذریعہ سے وہ اپنے خیالات کا اظہار کررہا ہے۔

دوسری بات وضاحت طلب یہ ہے کہ اقبال نے جہاں جہاں اپنے کلام میں تقلید کی مذمت کی ہے وہاں اُن کی مراد فقہی تقلید نہیں ہے بلکہ کورانہ تقلید ہے۔ یعنی کسی فلسفیانہ اسکول یا اپنے خاندان یا ماحول یا آباء واجداد یا کسی قوم کے رسوم، لباس یا عقائد، اور خیالات کی تقلید۔ بلاشبہ فقہی تقلید سے تو عامۃ المسلمین کو کسی طرح مفر نہیں ہے۔ کیونکہ فقہی مسائل میں تحقیق کرنا ہر شخص کا کام نہیں ہوسکتا۔ جو لوگ ائمۂ فقہ کی تقلید نہیں کرتے وہ بھی مقلد ہیں۔ یعنی اگر وہ امام ابوحنیفہؒ کی تقلید نہیں کرتے، تو امام بخاریؒ کی تقلید کرتے ہیں۔ اور جو لوگ نہ ائمۂ فقہ کے مقلد ہیں، اور نہ ائمۂ حدیث کے مقلد ہیں، وہ ان ائمۂ کے علاوہ کسی اور کے مقلد ہیں۔ وجہ اُس کی پہلے لکھ چکا ہوں کہ یہ عقلاً ناممکن ہے کہ ہر شخص مجتہد بن جائے۔ ٹھیک جس طرح یہ ناممکن ہے کہ دنیا میں ہر شخص انجنیئر یا ڈاکٹر بن جائے۔ یا شاعر یا مصور بنجائے علاوہ بریں، اقبال مسلمانوں کو ترک تقلید بمعنی فقہی تقلید کا مشورہ یوں بھی نہیں دے سکتے تھے کہ وہ خود ساری عمر فقہی مسائل میں امام ابوحنیفہؒ کی تقلید کرتے رہے۔ پس جو شخص خود مقلد ہو، وہ دوسروں کو ترک تقلید کی تلقین

کس طرح کرسکتا ہے؟

اب رہی تقلید کی تیسری قسم یعنی مرشد کی تقلید۔ تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے آپ کسی جسمانی مرض میں مبتلا ہوں اور اس کے ازالہ کے لیے کسی طبیب کی تقلید کریں، یعنی جو طریقہ علاج وہ آپ کے لیے تجویز کرے، اس پر بلا چون وچرا عمل کریں۔

واضح ہو کہ مرشد بھی طبیب ہی ہوتا ہے۔ جو آپ کے قلبی امراض کا ازالہ کرتا ہے اور اُس کی تقلید کا مطلب بھی یہی ہے کہ جو نسخہ وہ آپ کیلئے تجویز کرے اُس پر بلا چون وچرا عمل کریں۔

ہاں یہ آپ کو اختیار ہے کہ طبیب کے انتخاب میں آپ کسی کی تقلید نہ کریں، بلکہ اپنی عقل سے کام لیں، اور خوب غور وفکر اور تحقیق کے بعد کسی کو اپنا معالج منتخب کریں۔ اور یہ مشورہ ہے جو دنیائے اسلام کے نامور طبیب روحانی یعنی مولانا رومؒ نے دیا ہے۔

اے بسا ابلیس، آدم روئے ہست
پس بہ ہر دستے نباید داد دست

یعنی دنیا میں بہت سے ابلیس، انسانوں کی شکل میں موجود ہیں، اس لیے روحانی مریض کو بلاتحقیق، ہر مدعی اصلاح کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دینا مناسب نہیں ہے۔

پس خلاصۂ کلام یہ ہے کہ فقہی تقلید بھی ضروری ہے اور شیخ (مرشد) کی تقلید بھی ضروری ہے۔ اقبال نے تقلید کی ان دونوں قسموں کی ضرورت سے انکار نہیں کیا، اور نہ کرسکتے تھے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر کوئی مریض، کسی طبیب کی تقلید کرنا نہیں چاہتا تو وہ پہلے علم طب حاصل کرے، پھر خود تشخیص

اور تجویز کرسکتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اپنے دیوانی یا فوجداری مقدمہ میں کسی وکیل کی تقلید کرنا پسند نہیں کرتا، تو وہ پہلے خود قانون کا امتحان پاس کرے اس کے بعد خود اپنے مقدمہ کی پیروی کرسکتا ہے۔ لیکن تجربہ یہ بتاتا ہے کہ خود وکیل کسی مقدمہ میں ماخوذ ہو جائے، یا کوئی طبیب خود بیمار ہو جائے تو وہ وکیل، دوسرا وکیل مقرر کرتا ہے، یا وہ طبیب دوسرے طبیب سے رجوع کرتا ہے۔ اور اگر ہر شخص کے لیے طب یا قانون پڑھنا ممکن نہیں تو پھر تقلید سے بھی مفر نہیں۔ اسی پر آپ فقہی تقلید یا شیخ کی تقلید کو قیاس کرسکتے ہیں۔

اقبال نے جس تقلید کی مذمت کی ہے وہ پہلی قسم کی تقلید ہے اب میں خود انہی کے اشعار سے اپنے دعوے پر دلیل پیش کرتا ہوں:۔

واضح ہو کہ اقبال نے اپنے کلام میں تقلید کی مذمت بھی کی ہے اور تحسین بھی کی ہے۔ اس تضاد کو رفع کرنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ وہی ہے جو میں نے اوپر بیان کی ہے۔ ایک جگہ تقلید کی مذمت میں لکھتے ہیں:۔

اگر تقلید بودے شیوۂ نیک
پیمبرؐ ھم رہِ اجداد رفتے

یہاں جس تقلید کی مذمت کی ہے، وہ فقہی تقلید نہیں ہے بلکہ وہی کورانہ تقلید ہے، جس کی تفصیل اوپر مذکور ہو چکی ہے کہ اپنے بزرگوں کے طریقوں کی پیروی کی جائے، بلا سوچے، سمجھے، آنکھ بند کرکے۔

دوسری جگہ تقلید کی تحسین کرتے ہیں:۔

زاجتہادِ عالمانِ کم نظر
اقتدار بر رفتگاں محفوظ تر!

یعنی موجودہ زمانے کے کوتاہ عقل علماء کے اجتہادات پر عمل کرنے سے

سلف صالحین یا ائمہ فقہ کی تقلید زیادہ مناسب ہے۔

مسلمانوں کو جس تقلید نے نقصان پہنچایا، یا اقبال نے جس تقلید کی مذمت کی ہے، وہ فقہی تقلید نہیں بلکہ کورانہ تقلید ہے۔ یعنی آباء و اجداد کی تقلید یا پرانے مراسم خاندانی کی تقلید، یا دنیاوی علوم میں متقدمین علماء اور حکماء کی تقلید، مثلاً ملا نظام الدین سہالوی مرحوم نے ڈھائی سو سال ہوئے، عربی مدارس کے لیے ایک نصابِ تعلیم مدوّن کیا تھا، جو اُس زمانہ کے لیے بالکل مناسب تھا، لیکن ہمارے مسلمان علماء ابھی تک اُسی نصاب کو پڑھ رہے ہیں، اور اس میں تبدیلی کرنے کو "گناہِ کبیرہ" سمجھتے ہیں۔

ہمارے زمانہ میں مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے سب سے پہلے اس کورانہ تقلید کے خلاف آواز اُٹھائی، اور لکھنؤ میں ایک مدرسہ موسومہ ندوۃ العلماء قائم کیا جس میں عربی اور دینی علوم کے ساتھ ساتھ عصری علوم بھی پڑھائے جاتے ہیں۔

الغرض اقبال کا مطلب یہ ہے کہ کورانہ تقلید سے اپنی خودی کو ناکارہ مت کر، تمدن، معاشرت، معیشت، سائنس، فلسفہ، معاشیات، اور دیگر علوم و فنون میں اپنی عقل خداداد سے کام لے اور جس طرح مغربی اقوام دن رات تحقیق اور تجربہ میں مشغول ہیں تو بھی ان میں منہمک ہو کر اپنی خودی کی قوتوں کو بیدار کر، اور ترقی کے میدان میں مغربی اقوام کے دوش بدوش کام کر اور اپنے لیے زندہ قوموں میں جگہ حاصل کر۔

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ فرمایا تھا "انتم اعلم بامور دنیاکم" یعنی اپنے دنیاوی معاملات کو تم خود بہتر سمجھتے ہو، تو اس میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ تم دین کے مسائل میں بیشک میری تقلید کرو، لیکن زراعت، تجارت، آہنگری، خیاطی، اور دوسرے تمام دنیاوی

معاملات میں اپنی عقل سے کام لے سکتے ہو۔

اُمید ہے کہ اس تفصیل سے ناظرینِ اقبال کے مفہوم کو بخوبی سمجھ سکیں گے۔

(۳) اس شعر میں اقبال نے "تجدید" کا لفظ استعمال کیا ہے اس کی بھی قدرے تشریح ضروری ہے۔ واضح ہو کہ تجدید اور اجتہاد میں فرق ہے۔ اجتہاد تقلید کی ضد ہے۔ یعنی کسی مسئلہ میں اپنی عقل سے کام لے کر استخراج یا استنباط کرنا، مثلاً قرآن مجید میں شراب کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ لیکن چرس، افیون گانجہ یا بھنگ کا ذکر نہیں ہے۔ اب ایک شخص یہ دریافت کرتا ہے کہ چرس پینا جائز ہے یا نہیں؟ تو مجتہد، قرآن کی نص میں مناطِ حکم تلاش کرتا ہے، اور ذاتی غور و فکر سے جسے قرآن نے "تدبر" سے تعبیر کیا ہے، یہ معلوم کرتا ہے کہ شراب کی حرمت کا سبب، سکر ہے پس وہ ایک کلیہ بناتا ہے کہ "کُلُّ مُسکِرٍ حَرَامٌ"۔ یعنی ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔ اور چونکہ چرس یا بھنگ بھی نشہ لاتی ہے، اس لیے یہ بھی حرام ہے، اس استنباط کو اجتہاد کہتے ہیں۔

تجدید، کے لغوی معنی ہیں نیا کرنا، یعنی کسی چیز کو اُس کی اصلی اور حقیقی شکل عطا کرنا، لیکن اصطلاح میں تجدید کہتے ہیں، دین اسلام کو اُن غلط خیالات رسوم عقائد، اور افکار سے پاک کر کے، جو مسلمانوں کی غلطی یا جہالت سے دین میں داخل ہو گئے ہیں دوبارہ اس کی حقیقی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کرنا اور جو ایسا کرتا ہے اُسے "مجدّد" کہتے ہیں۔

اقبال کہتے ہیں کہ جو قوم دنیاوی لذتوں میں منہمک ہو کر، آخرت سے بیگانہ ہو گئی ہو، بیشک اس کے لیے، یعنی اس کے خیالات کی اصلاح کے لیے مجدّد کا وجود بہت ضروری ہے۔

(۴) لیکن مشرقی ممالک، مثلاً ترکی، ایران، افغانستان، ہندوستان میں جو "تجدید" کا شور برپا ہے، اس کی تہ میں خلوص کارفرما نظر نہیں آتا۔ یعنی ان ملکوں میں جو مجدّد پیدا ہو رہے ہیں، اُن کا مقصد نیک نہیں۔ (کیونکہ وہ اس منصب کی اہلیت نہیں رکھتے) ان لوگوں کی تجدید کے جو کارنامے سامنے آرہے ہیں اُن کو دیکھ کر میں اس نتیجہ پر پہنچنے کے لیے مجبور ہوں کہ یہ مجدّدِ دین، مسلمانوں کو تجدیدِ دین کے پردہ میں فرنگی قوموں کی کورانہ تقلید یعنی غلامی کا سبق دے رہے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ

(ا) ترکی میں مصطفےٰ کمال نے تجدید دین کا عَلَم بلند کیا۔ لیکن چونکہ وہ دین اسلام کی حقیقت سے بیگانہ تھا، لہٰذا اُس نے ترکوں میں (اسلامی رنگ پیدا کرنے کے بجائے، مغربی رنگ پیدا کر دیا مثلاً عربی کی جگہ لاطینی رسم الخط رائج کر دیا، ترکی لباس کی جگہ فرنگی لباس رائج کر دیا۔ پردہ کی جگہ عُریانی کو فیشن بنا دیا۔ انتہا یہ ہے کہ اسلامی آئین کی جگہ ضابطہ سوئس (SWISSCODE) نافذ کر دیا۔ اب اہلِ نظر خود انصاف کر سکتے ہیں کہ یہ تجدید ہوئی یا تخریب! مسلمان آزاد ہوئے یا اور بھی غلام ہو گئے!

(ب) یہی کارنامہ ایران میں رضا شاہ پہلوی نے انجام دیا۔

(ج) اسی قسم کی "اصلاح" امان اللہ خاں نے افغانستان میں کی۔

(د) ہندوستان میں ایک "مجدّدِ اعظم" پیدا ہوا، جس نے صاف لفظوں میں مسلمانوں کو اس بات کی تلقین کی کہ:۔

اے دوستو! جہاد کا اب چھوڑ دو خیال
دیں کے لیے حرام ہے اب جنگ اور قتال

حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام "مجدّدِ دین" اُس دین کی حقیقت سے بیگانہ

تھے، جس کی تجدید کا فرض اُنھوں نے انجام دیا۔ نتیجہ اس "کارِ خیر" کا جو نکلا وہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ یعنی ان قوموں کی غلامی کی زنجیریں اور بھی مضبوط ہو گئیں۔

—— (۷) ——

اس نظم میں اقبال نے افغانوں کو انقلاب کا پیغام دیا ہے۔ افغانستان کے باشندوں سے تو میں واقف نہیں ہوں، لیکن سرحد، یعنی آزاد علاقہ کے افغانوں کی ذہنیت سے قدرے آگاہی ضرور حاصل ہے۔ اور میں اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں، کہ ان لوگوں میں وہ جوہر ضرور موجود ہے جس کی صحیح تربیت، اگر ہو جائے تو یہ لوگ انقلاب پیدا کر سکتے ہیں۔ مثلاً

(ا) ان لوگوں میں دینی حمیت اور غیرت نسبتاً زیادہ پائی جاتی ہے۔

(ب) ان لوگوں میں جہاد کا جذبہ بھی نسبتاً زیادہ پایا جاتا ہے۔

(ج) ان لوگوں کو انگریز، اور انگریزیت، دونوں سے شدید نفرت ہے۔

(د) یہ لوگ فطرتاً بہادر بھی ہیں، اور جفاکش بھی ہیں۔

اقبال مجھ سے بدرجہا زیادہ، ان لوگوں کی ان خصوصیات سے آگاہ تھے اس لیے اُنھوں نے، اس نظم میں براہ راست اُنہیں مخاطب کیا ہے۔

پہلا بند: اے سرحد کے مُسلمان! اپنے گردوپیش کی دنیا پر نظر کر، دیکھ تو سہی ہر طرف انقلاب برپا ہے۔ ترکی میں انقلاب رونما ہو گیا۔ شام میں بھی بڑی تبدیلی رونما ہو گئی۔ یہی حال ہندوستان کا ہے۔ (اور اب تو پاکستان بھی عالمِ وجود میں آچکا ہے) اے سرحد کے غیور پٹھان! اللہ نے تیرے اندر بڑی بڑی صلاحیتیں ودیعت فرما دی ہیں۔ تیرا فرض یہ ہے کہ تو اُن صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر دنیا میں اسلام کو سربلند کرے۔

"اپنی خودی پہچان" کا مطلب اقبال کی اصطلاح میں یہ ہے کہ اے غافل افغان! اسلامی خطوط پر اپنی خودی کی تربیت کر، تاکہ تو ایشیا میں تمام قوموں کا سردار بن جائے۔

علامہ مرحوم نے ایک دفعہ مجھ سے فرمایا تھا کہ "اگر سرحد کے پٹھانوں میں کوئی شخص صحیح اسلامی شعور پیدا کردے تو یہ لوگ اسلام کو دوبارہ سربلند کر سکتے ہیں۔ ساری دشواری یہ ہے کہ اُنہیں اپنی طاقتوں کا علم ہی نہیں ہے۔

دوسرا بند:- اے سرحد کے غیور مسلمانو! اللہ نے تمہیں جسمانی طاقت بھی عطا فرمائی ہے۔ حوصلہ بھی عطا کیا ہے۔ اور جنگ وجدل کا شوق بھی۔ پس اگر تم اسلام (کھیت) کی آبیاری نہ کرو، تو پھر تمہاری مسلمانی کس کام کی؟ اور اسلام کو تم سے کیا فائدہ پہنچا؟

تیسرا بند:- تم تو سمندر ہو، پھر کیا سبب کہ کفار کے مقابلہ میں تمہاری تلواریں علم نہیں ہوتیں؟ تم کفر کے خلاف صف آرا کیوں نہیں ہوتے؟ تم تو طوفان ہو، پھر کیا سبب کہ کفر تمہارے سامنے ابھی تک قائم ہے؟ کہیں طوفان کے سامنے خس وخاشاک قائم رہ سکتا ہے؟

چوتھا بند:- یاد رکھو! حقیقی عظمت اور سربلندی یہ ہے کہ انسان بادشاہوں کے دربار میں جاکر ضمیر فروشی کے بجائے، اپنی قوتِ بازو سے اپنا رزق پیدا کرے، یا اُس سلطان سے وہ دہقان بدرجہا بہتر ہے جو اپنی خودی کی تربیت کرکے اپنے آپ کو اسلام کی خدمت کے لائق بنا سکے، جو سلطان اپنی خودی سے غافل ہے، اُس سُلطان سے وہ فقیر بہتر ہے۔ جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع سے اپنی خودی کو کامل کر لیا ہے۔

پانچواں بند:- اے سرحد کے مسلمان! یہ سچ ہے کہ تیرے علاقہ میں علم و

حکمت کا چرچا نہیں ہے، اور تو بھی عالم نہیں ہے۔ لیکن یہ تیری بے علمی ہندوستان کے اکثر علمار کے علم و فضل سے بہتر ہے، کیونکہ آج وہ زمانہ ہے کہ

"عالم فاضل بیچ رہے ہیں اپنا دین ایمان"

نوٹ :۔ اس مصرع میں اشارہ ہے اُن علمار کی طرف جنھوں نے محض روپے کی خاطر، انگریزوں کے ناپاک مقاصد کی تائید کی اور مسلمان ہو کر اسلام سے غداری کی ۔ مثالیں تو سیکڑوں ہیں صرف ایک واقعہ لکھتا ہوں جب ۱۹۴۲ء میں، انگریزوں نے ایران پر قبضہ کیا تھا، تو ان فرزندانِ ابلیس کے طرزِ عمل کو اہلِ ایران کے حق میں مفید ثابت کرنے کے لیے پنجاب سے کئی "مولوی" ایران گئے تھے، اور جس ضمیر فروش نے اُن کے اخراجات برداشت کئے تھے اُس کو "نواب" کا طوقِ لعنت مرحمت ہوا تھا۔

(۸)

اس چھوٹی سی نظم میں اقبال نے اپنے محبوب شکاری پرند شہباز "FAL CON" کی دو سب سے بڑی خوبیاں بیان کی ہیں۔ پرواز اور نظر۔ اور جن لوگوں نے کلامِ اقبال کا مطالعہ کیا ہے، اُن سے یہ حقیقت مخفی نہیں ہے۔ کہ اقبال یہی دو خوبیاں اپنی قوم کے نوجوانوں میں دیکھنی چاہتے تھے۔ انہی دو خوبیوں کو انھوں نے بہ تبدیل الفاظ اس مصرع میں بیان کیا ہے :۔

چیتے کا جگر چاہیئے، شاہین کا تجسس

یعنی قوم کے نوجوانوں کو اپنے اندر یہ دو صفات پیدا کرنی لازم ہیں۔

(ا) پرواز، جسمانی طاقت، ہمت، حوصلہ اور شجاعت پر موقوف ہے۔ اسی کو اقبال نے، چیتے کے جگر سے تعبیر کیا ہے۔

(ب) نظر، اور تجسس کا باہمی رشتہ بالکل واضح ہے۔ شکار کی تلاش صرف

نظر پر موقوف ہے۔ چینا یا باز، اگر اندھا ہو جائے تو اس کی زندگی بالکل بیکار ہو جائے گی۔

اقبال کو شاہین اور باز سے جو اس قدر محبت تھی، اُس کا سبب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ یہ پرند، اُن صفات کے مظہر ہیں، جو اقبال کو بیحد محبوب تھیں۔ کیا مجھے اپنی قوم کو یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ اسلام، مومن کے اندر، پرواز اور نظر ہی تو پیدا کر دیتا ہے :تاکہ وہ کائنات کو مسخر کر کے اس میں "حکم حق" جاری کر سکے اگر غور سے دیکھا جائے تو باز اور مومن کی زندگی میں بڑی مماثلت نظر آتی ہے۔

(ا) باز تمام پرندوں کا بادشاہ ہوتا ہے، مومن تمام انسانوں پر حکمراں ہوتا ہے

(ب) باز، کبھی پستی یا نشیب میں قیام نہیں کرتا۔ مومن بھی کبھی پستی یا ذلت میں زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ چنانچہ سلطان ٹیپو شہید کی زندگی اس اصُول پر شاہد ہے۔

(ج) باز، آشیانہ نہیں بناتا، مومن بھی دنیا سے دل نہیں لگاتا۔

(د) باز، مُردار نہیں کھاتا، مومن بھی حرام چیز کو نہیں چھوتا۔

(ہ) باز کی نگاہ بہت تیز ہوتی ہے، مومن بھی نورِ ایمانی کی بدولت ان چیزوں کو دیکھ سکتا ہے، جو کافر کی نگاہ سے پوشیدہ رہتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اقبال نے اکثر اپنی نظموں میں باز اور شاہین کا تذکرہ کیا ہے اور ان کی صفات کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اگر پرواز اور نظر کی بدولت شہباز اور شاہین تمام پرندوں کے سردار بن سکتے ہیں، تو یہ صفات قوم کے نوجوان کو بھی دنیا میں سروری عطا کر سکتی ہیں۔

محراب گل، شہباز سے کہتا ہے کہ

(ا) کوا، جو خود بدصورت ہے، اپنی ظاہر بینی کی وجہ سے تیرے پیروں کو "بدنما" کہتا ہے۔ اور چمگادڑ، جو خود روشنی کی تاب نہیں لا سکتی، اور ذکی اندھی ہوتی ہے، تجھ کو کور چشمی کا طعنہ دیتی ہے۔ اور کہتی ہے کہ تو بے ہنر ہے۔

(ا) واضح ہو کہ باز کے پر، دیکھنے میں دلکش نہیں ہوتے، عموماً خاکی یا مٹیالے رنگ کے ہوتے ہیں۔ چونکہ کوا، حقیقت بیں نہیں ہوتا (اس لیے کہ ہو نہیں سکتا) بدیں وجہ وہ باز کے پروں پر اعتراض کرتا ہے۔ یہاں جو نکتہ پوشیدہ ہے، وہ یہ ہے کہ باز کے پیروں کا خوبی کا انحصار، طاؤس کے پروں کی طرح مختلف رنگوں کی آمیزش پر نہیں ہوتا۔ بلکہ اُن کا حسن و جمال اُس طاقتِ پرواز پر مبنی ہوتا ہے، جو اس کے بازو میں پوشید ہوتی ہے۔

اسی طرح مومن کا حال ہے، ظاہر پرست دنیا کے ظاہر بیں لوگ، مردِ مومن کو اس کے معمولی کھدر کے لباس کی بنا پر حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں[۲] حالانکہ اُس کا حسن اُس کی سیرت اور روحانی طاقت میں پوشیدہ ہوتا ہے۔

(ب) چمگادڑ کی آنکھ اس قسم کی ہوتی ہے کہ اُسے دن میں کچھ نظر نہیں آتا، اسی لیے سعدیؒ نے لکھا ہے:-

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم!
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ!

---

[۱] میں نے باز کی، یعنی اس کے بازوؤں کی طاقت کا بچشم خود مشاہدہ کیا ہے۔ ایک دفعہ جبکہ ہم حسب معمول شام کے وقت شکار میں مصروف تھے، ہمارے باز کا شکار،.... کاٹھیاواڑی مرچوں کے کھیت میں چھُپ گیا۔ یہاں کی مرچوں کے پودے کمر کمر ہوتے ہیں، باز اپنی معمولی سُرعت کے ساتھ اس کے تعاقب میں آیا، اور جب بائیں طرف کو مڑ کر کھیت میں داخل ہوا، تو اُس کا بازو ایک مرچ کے پودے سے ٹکرایا، باز (باقی برص ۴۲۷)

(ج) اقبال نے باز پر اعتراض کرنے کے لیے کوّے اور چمگادڑ کو منتخب کیا ہے اس میں نکتہ یہ ہے کہ یہ دونوں خود حقیر، اور ذلیل اور مجموعۂ عیوب ہوتے ہیں۔ یعنی باز پر وہی اعتراض کرتا ہے، جو خود کوتاہ بیں اور بدصورت ہوتا ہے۔

(د) ان پرندوں نے باز میں جو دو عیب نکالے ہیں وہی دراصل اس کی دو سب سے بڑی خوبیاں ہیں، لیکن کوّا اور چمگادڑ چونکہ پست فطرت، اور کور ذوق ہیں اس لیے ذوق حسن و زیبائی، سے یکسر محروم ہیں۔

اسی طرح مردِ مومن پر، وہی شخص زبان طعن دراز کرتا ہے، جو خود پست فطرت اور کور ذوق ہوتا ہے، اور انہی باتوں پر اعتراض کرتا ہے۔ جو درحقیقت مومن، یا انسانیت کے لیے سرمایۂ افتخار ہوتی ہیں۔ مثلاً مومن کا ظاہر اور باطن دونوں یکساں ہوتے ہیں، لیکن یہی خلوص اور صداقت آج مہذب دنیا میں سب سے بڑا عیب ہے۔ کیونکہ اس زمانہ میں عقلمند وہ ہے، جو انتہائی عیّار، مکار، منافق اور زمانہ ساز ہو، ان "صفات" کو موجودہ سیاسی اصطلاح میں ڈپلومیسی (DIPLOMACY) کہتے ہیں۔

(۲) لیکن اے شہباز! تو ان بیوقوفوں کے اعتراضات سے غمگین یا کبیدہ خاطر نہ

(بقیہ صفحہ گذشتہ) تو بندوق کی گولی کی طرح گذر گیا، لیکن پودے کا بالائی حصہ دو فٹ سے زیادہ اس طرح تنہ سے جُدا ہو کر گر پڑا، جیسے کسی نے چھُری سے کاٹ دیا ہو۔ ۱۲

[۲] جب قادسیہ کی جنگ سے پہلے، اسلامی فوج کا ایک سپاہی، جو معمولی لباس میں تھا۔ رستم سپہ سالارِ ایران کے خیمہ میں داخل ہوا تو اس کے معمولی لباس کی وجہ سے ایرانی افسرانِ فوج نے اُس مردِ مومن کو حقارت کی نظر سے دیکھا تھا۔ وہ اُس کے بازو کی طاقت کو نہ دیکھ سکے جس نے کسریٰ کی حکومت کا تختہ الٹ کر رکھ دیا۔ ۱۲

ہونا، کیونکہ یہ دونوں (کوّا اور چمگادڑ) صحرا کے پرندوں میں وہی حیثیت رکھتے ہیں جو ہندو سماج میں اچھوتوں کو حاصل ہے۔ یہ وہ کوتاہ بیں اور تنگ نظر ہیں جو فضائے نیلگوں کی وسعت اور پہنائی سے بالکل بے خبر ہیں۔ جس طرح کوئیں کا مینڈک، سمندر کی وسعت کا تصور نہیں کر سکتا، اسی طرح کوّا، جس کی دوڑ درخت سے منڈیر، اور منڈیر سے صحن مکان تک ہے۔ یا چمگادڑ جو دن بھر غاروں میں چھپا رہتا ہے، اُس مسافت کا تصور نہیں کر سکتے، جو شکار کی تلاش میں ہر روز تجھ کو طے کرنی پڑتی ہے۔

(۳) ان بیچاروں کو اُس طائر کے احوال اور مقامات کا کیسے علم ہو سکتا ہے، جو بحالتِ پرواز شکار کی تلاش میں سراپا نگاہ، اور سراسر نظر (تجسس کی انتہا کا اظہار مقصود ہے) بن جاتا ہے۔

نوٹ :۔ احوال اور مقامات، تصوف کی اصطلاحیں ہیں۔

(۱) حال سے وہ کیفیت مُراد ہے جو قوتِ ارادی کے استعمال سے مومن کی روح میں پختگی کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ مثلاً ایک مسلمان عموماً ہر روز نماز پڑھتا ہے، لیکن کسی دن ناغہ بھی کر دیتا ہے تو تصوف کی اصطلاح میں وہ نمازی نہیں ہے، یا ایک آدمی عموماً سچ بولتا ہے، لیکن کبھی کبھی جھوٹ بھی بول دیتا ہے، تو وہ راست گو نہیں ہے۔ کیونکہ نماز اور راستی ان کے لیے ابھی تک "حال" نہیں بن سکی۔

(۲) مقام سے مراد وہ روحانی مرتبہ ہے، جو مومن اپنی ہمت اور اپنے اختیار کو کام میں لاکر، اتباعِ شریعت کی بدولت حاصل کرتا ہے۔ واضح ہو کہ اسلامی تصوف میں ہمت (WILL POWER) اور اختیار (FREEDOM) ان دو قوتوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اور ناظرین شاید حیران ہوں گے

کہ اسلامی تصوف کے خلاف سب سے بڑا اعتراض یہی کیا جاتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو پست ہمتی اور بے عملی کا درس دیتا ہے، حالانکہ اُس کی بنیاد ہی ہمت اور اختیار پر ہے۔ اسلامی تصوف کا نقطۂ آغاز ہی یہ دو اصُول موضوعہ (POSTULATES) ہیں کہ :۔

(۱) ہر انسان اپنی قوت ارادی کو ترقی دے سکتا ہے۔ اور اپنے ارادہ کی بدولت، ناممکن کو ممکن کر سکتا ہے۔

(۲) ہر انسان کو ترقی کرنے اور مقام خلافت تک پہنچنے کی آزادی حاصل ہے۔ وہ مجبور نہیں ہے بلکہ اس معاملہ میں مختار ہے، یعنی اگر وہ ہمت سے کام لے تو مرتبہ خلافت اللہیہ حاصل کر سکتا ہے۔

دراصل اسلامی تصوف پر جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں، وہ جاہل مسلمان صوفیوں کی غیر اسلامی زندگی اور تعلیمات کی بناء پر وارد ہوتے ہیں۔

نوٹ :۔ آخری مصرع میں اقبال نے باز کی دو خوبیاں بیان کی ہیں۔ پرواز اور نظر۔ یعنی کوّے اور چمگادڑ کی تردید کی ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں اُن کی جہالت اور حماقت پر مبنی ہے۔

(۱) بظاہر باز کے پر خوشنما نہیں ہوتے، لیکن اُن کی خوشنمائی درِ پرواز ظاہر کرتی ہے۔ باز کے پروں کی خوشنمائی، طاقت پر مبنی ہے۔ اسی طرح مومن کا حسن، اُس کی قوتِ بازو پر موقوف ہے۔

(۲) بظاہر باز کی آنکھ دلکش نہیں ہوتی (جیسے چشم غزال دلکش ہوتی ہے) لیکن جب وہ فضائے آسمانی میں، شکار کی تلاش کے وقت، پرواز کرتا ہے تو اُس وقت اُس کی آنکھ میں بلا کی طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔

اسی طرح جس وقت مومن، کفن باندھ کر میدان میں نکلتا ہے تو اُس کی پوری

شخصیت، نظر بن جاتی ہے۔ یعنی اُس وقت اس کی روح صرف ایک نقطہ پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ اور وہ یہ ہوتا ہے کہ جہاں تک کفر کے آثار نظر آئیں، اُنہیں مٹا دے وہ سراپا نگاہ بن جاتا ہے۔ تاکہ اسلام کے دشمنوں کو، خواہ وہ غار میں پوشیدہ ہوں، یا دوستی کی نقاب اوڑھے ہوئے ہوں، یا منافقت کے لباس میں ملبوس ہوں، غرضیکہ جہاں بھی ہوں۔ دیکھ سکے پہچان سکے اور قتل کر سکے۔

مجھے اعتراف ہے کہ اس تشریح کے باوجود میں اس مصرع کا مفہوم واضح نہ کر سکا۔ "روح ہے جس کی دمِ پرواز، سرتاپا نظر"

نوٹ :۔ اقبالؔ نے اس نظم کے پردہ میں مسلمان قوم کے نوجوانوں کو شہبازی کا طریقہ سکھایا ہے، چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں :۔

ع کہ میں نے فاش کر ڈالا طریقہ شاہبازی کا

میری ایمانداری کے ساتھ یہ رائے ہے کہ مرحوم نے تو اپنا فرض ادا کر دیا کہ مذہب شہبازی کے اصول مدّون کر دیئے۔ اب یہ فرض حکومت کا ہے کہ وہ ایسے ادارے قائم کرے، جہاں مسلمان نوجوانوں کو شاہین اور شہباز کے مسلک پر گامزن ہونے کی تلقین کی جا سکے۔ یعنی شاہینی اصولوں پر اُن کی تربیت ہو سکے۔ اصلی چیز تربیت ہے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں کامل تیرہ سال تک قوم کی تربیت ہی تو کی تھی جس کی بدولت مٹھی بھر مسلمانوں نے قلیل عرصہ میں قیصرؔ اور کسریٰؔ کی سلطنتوں کا خاتمہ کر دیا، اور ایک نئی دنیا پیدا کر دی۔

اگر آج پاکستان کے مسلمان نوجوان لڑکے قیسؔ اور فرہادؔ کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں، اور نوجوان مسلمان لڑکیاں شکنتلاؔ بن کر ناظرین سے خراجِ تحسین حاصل کر رہی ہیں۔ بالفاظ دگر دونوں اپنی متاعِ عزیز کو برباد کر رہے

ہیں۔ تو اس کی ذمہ داری ان ناتجربہ کار نوجوانوں پر نہیں ہے، بلکہ اُن بڑے بوڑھوں پر ہے جو اُنہیں اس قسم کی "اعلیٰ تعلیم" دلوا رہے ہیں۔

(۹)

اس غزل میں اقبالؔ نے بعض حقائق و معارف، شعر کے دلکش لباس میں پیش کیے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ

(۱) عشق :۔ اور اقبال کے یہاں رومیؒ کی طرح، عشق سے عشقِ حقیقی ہی مراد ہے۔ اپنی سرشت (NATURE) کے لحاظ سے عاشق کو، بلندی اور پاکیزگی کی طرف لے جاتا ہے۔

واضح ہو کہ مرشدی رومیؒ نے عشق کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ ایک وہ جو مادّی اشیاء سے ہوتا ہے۔ خواہ وہ عورت ہو یا دولت ہو یا زمین ہو، یہ عشق، عشق نہیں ہے، بلکہ "ننگ"، یعنی انسانی خودی کی تذلیل کا باعث ہے چنانچہ فرماتے ہیں ؎

عشقہائے کز پئے رنگے بود
عشق نبود، عاقبت ننگے بود!

دوسرا عشق وہ ہے، جو اللہ سے کیا جاتا ہے۔ اور چونکہ اللہ باقی ہے اس لیے اس کا عشق، عاشق کو بھی غیر فانی بنا دیتا ہے۔ رومیؒ کی نگاہ میں یہی حقیقی عشق ہے۔ اور اسی لیے صوفیا، اللہ کو معشوقِ حقیقی کہتے ہیں۔

اس عشق (حقیقی) کی یہ خاصیت بلکہ طبینت ہے کہ عاشق کو مادّیات اور نفسانی خواہشات سے بالاتر کر دیتا ہے۔ اور عشقِ مجازی اس کی ضد ہے اسلئے وہ نفسانی خواہشات میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اور وہ اُسی وقت تک رہتا ہے جب تک حسن و جمال باقی رہتا ہے۔ اسی لیے اقبال نے اُسے ہوس سے تعبیر

کیا ہے۔

عشقؔ اور ہوسؔ دونوں میں جو فرق ہے، اُسے علامہ نے شہباز اور مگس کی تشبیہ سے واضح کیا ہے۔ یوں تو دونوں اُڑ سکتے ہیں، اور اُڑتے ہیں۔ لیکن دونوں کی نوعیتِ پرواز میں بھی فرق ہے۔ اور غایتِ پرواز میں بھی۔ یعنی

(ا) مکھی کی پرواز میں وہ شدت پیدا نہیں ہو سکتی جو شہباز کی پرواز میں ہوتی ہے۔ اسی طرح بوالہوس کی محبت، اور عاشق کی محبت میں فرق ہوتا ہے۔

(ب) مکھی، ناپاک، کثیف، اور گندہ چیزوں کی طرف جاتی ہے لیکن شہباز ہمیشہ زندہ شکار کی طرف جاتا ہے۔ اسی طرح بوالہوس کا میلان طبع کثافت کی طرف ہوتا ہے۔ اور عاشق صادق کا جذبہ پاکیزہ اور ارفع ہوتا ہے۔

(۲) اس شعر کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ پہلا مطلب یہ ہے کہ جو حکمراں عقلمند ہوتے ہیں، وہ محکوم قوم کو ایسے "سبز باغ" دکھا سکتے ہیں کہ وہ آزادی کے جذبہ (نشیمن) کو مذموم سمجھنے لگتے ہیں۔ اور غلامی (قفس) کو اپنے حق میں محمود تصور کرنے لگتے ہیں۔ چنانچہ میں نے اپنی طالب علمی کے زمانہ میں آج سے چالیس پینتالیس سال پہلے، ہندوستان کے بعض مشہور اُدبا کے مضامین پڑھے تھے، جن کا عنوان تھا "برکات سلطنت انگلشیہ" ناظرین اس عنوان کو مدِ نظر رکھ کر اقبال کے اس شعر کے مفہوم سے کسی قدر آگاہ ہو سکتے ہیں۔ یہ عنوان زبان حال سے کہہ رہا ہے کہ لکھنے والا غلامی کو آزادی سے بہتر سمجھتا ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ انسان، پابندی (قفس) سے بھاگتا ہے، آزاد رہنا چاہتا ہے، لیکن اگر کسی شخص میں روحانی کمال موجود ہو تو لوگ اپنی آزادی کو خیرباد کہہ کر اُس کی غلامی کو بخوشی قبول کر لیتے ہیں۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ جب حضرت سید احمد صاحب رائے بریلویؒ، دلی تشریف لائے تو مولانا اسمٰعیل شہیدؒ اُن کے ایسے گرویدہ ہو گئے کہ پھر مدۃ العمر قدموں سے جُدا نہ ہوئے۔

(۳) جس شخص کے دل میں عشقِ الٰہی کی بدولت جہاد فی سبیل اللہ کا ارادہ پیدا ہو جائے، اور وہ سر کٹانے کے لیے آمادہ ہو جائے تو وہ "بانگِ رحیل" یعنی اعلان جہاد کا انتظار نہیں کیا کرتا، وہ مجسّم اعلانِ جہاد بن جاتا ہے۔ وہ اس کا منتظر نہیں ہوتا، کہ دوسرا شخص اُس کو ترغیب دے۔ بلکہ وہ خود جہاد کرتا ہے۔ دیکھو! سمندر کی موجوں میں ساحل سے ٹکرانے کا جذبہ چونکہ باطنی طور سے موجود ہوتا ہے، اس لیے وہ کسی خارجی تحریک کا انتظار نہیں کرتیں۔ اُٹھنا اُبھرنا، حرکت، سیلان، اور آگے بڑھنا اور ٹکرانا یہ موج کی ذات میں داخل ہے، اس لیے وہ کسی دوسرے کی تحریک کی محتاج نہیں ہے۔

(۴) اگرچہ کالج اور یونیورسٹی کا طالب علم بظاہر زندہ نظر آتا ہے، چلتا پھرتا ہے، پڑھتا ہے، امتحان پاس کرتا ہے۔ لیکن دراصل مُردہ ہے، کیوں اس لیے کہ اس کے دماغ میں جو خیالات اور دل میں جو جذبات موجزن ہیں وہ اس کے ذاتی نہیں ہیں، بلکہ فرنگی کے عطا کردہ ہیں۔ اور جو شخص ذہنی اعتبار سے غلام ہے، دوسرے کا دست نگر ہے وہ دراصل مردہ ہے جس طرح مُردہ نہ اپنے آپ کو فائدہ پہنچا سکتا ہے نہ دوسروں کو اسی طرح

غلام نہ خود ترقی کر سکتا ہے، نہ قوم کے لیے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

نوٹ:۔ اقبال نے موجودہ نظامِ تعلیم کی خرابیوں پر جو کچھ لکھا ہے، اگر اُسے جمع کیا جائے تو بجائے خود ایک کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ اس لیے میں اس موضوع پر عنقریب جداگانہ کتاب لکھوں گا۔

(۵) اے مسلمان! اگر تو اپنے دل کو زندہ کرنا، یعنی حقیقی معنیٰ میں مومن بننا چاہتا ہے تو کسی مومن کی صحبت اختیار کر۔ کیونکہ دنیا کا دستور یہی ہے کہ چراغ سے چراغ جلتا ہے۔

اقبال نے اس موضوع پر بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ اس جگہ صرف ایک شعر پر اکتفا کرتا ہوں۔

دیں مجو اندر کتب اے بے خبر!
علم و حکمت از کتب دیں از نظر!

اکبر الہ آبادی مرحوم نے بھی اسی حقیقت کو اپنے انداز میں بیان کیا ہے

نہ کتابوں سے نہ کالج سے نہ زر سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

افسوس اِس بات کا ہے کہ قوم نے اکبر اور اقبال کی اس تعلیم کو ابھی تک درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھا، کاش میری قوم اس نکتہ سے آگاہ ہو جائے کہ محض یومِ اکبرؒ، اور یومِ اقبال کے ہنگاموں سے دل زندہ نہیں ہو سکتا۔

——— (۱۰) ———

اس نظم میں اقبال نے محرابِ گل کی زبان سے مسلمان نوجوان کی خوبیاں بیان کی ہیں۔ یعنی اقبال اپنی قوم کے نوجوانوں میں ان صفات کے متمنی تھے

(۱) محراب گل کہتا ہے کہ اسلامی زاویۂ نگاہ سے وہی مسلمان نوجوان ملّت

اسلامیہ کے لیے باعثِ فخر ہو سکتا ہے، جو جوانی میں پاکبازی اختیار کرے، اور جہاد فی سبیل اللہ کے لیے تیار رہے، حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ کی نظر میں جوانی کی عبادت سب سے زیادہ محبوب ہے۔

میں نے اپنے بچپن میں ایک شعر پڑھا تھا، جو اسی حدیث کا ترجمہ ہے

یعنی کرے کچھ جوانی میں حصول!
بندگی ہوتی ہے، اس سن کی قبول!

الغرض اسلامی زاویۂ نگاہ سے اُس جوان کی زندگی قابلِ رشک ہے، جو پارسا ہو اور مجاہد ہو، اور اسلام کا عاشق ہو۔

(۲) اگر میدانِ جنگ میں جائے تو کچھار (غاب) کے شیر کی طرح حملہ کرے اور دشمنوں کی صفیں اُلٹ دے اور اگر دوستوں سے ملے تو ایسا دلکش اور مہربان ہو، جیسے تاتاری خوبصورت ہرن۔

(۳) اُس کے دل میں، عشقِ الٰہی کی ایسی آگ روشن ہو کہ باطل کی تمام کائنات کو پھونک کر رکھ دے، اور اگر وہ ایسا کر دکھائے تو اس میں تعجب ہی کیا ہے؟ جس طرح آگ کی ایک چنگاری سارے جنگل کو جلا کر راکھ کر سکتی ہے۔ اسی طرح ایک مردِ مومن، سارے لشکرِ کفر کا خاتمہ کر سکتا ہے۔

(۴) چونکہ مردِ مومن کے فقر میں، حیدری اور کرّاری کی شان ہوتی ہے اس لیے دنیا میں اُسے وہی دبدبہ حاصل ہوتا ہے، جو بادشاہوں کو حاصل ہوتا ہے۔

(۱) حیدری کے دو معنی ہیں۔ (۱) منسوب بہ حیدرؓ۔ (۲) ہیبتِ شیر،

(ب) کرّاری کے معنیٰ ہیں، بار بار حملہ کرنے کی شان۔

(۵) اقبال اہلِ دُنیا سے خطاب کرتے ہیں، کہ اگر مومن کے پاس ظاہری ساز و سامان نظر نہ آئے تو اُسے دولت کی نگاہ سے مت دیکھو اسکے جوہرِ ذاتی پر نظر کرو۔ اور اس حقیقت کو سمجھو کہ اگرچہ وہ "بے کلاہ" ہے۔ لیکن اس کی بدولت قوم کو سرداری نصیب ہو سکتی ہے۔

جس وقت عرب کے نوجوان اپنے وطن کی حدود سے باہر نکلے تھے، تو ان کے پاس مادّی اسباب اور ظاہری سامان کچھ بھی نہ تھا۔ لیکن جوہرِ ذاتی کی بدولت اُنھوں نے اپنی قوم کو دنیا میں سربلند کر دیا۔

اقبال نے نظم کے علاوہ اپنے بیانات میں بھی بار بار اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ کسی قوم کا مستقبل اُس کے نوجوانوں کے جوہرِ ذاتی پر موقوف ہے اگر اُن کے دل میں اپنی قوم کو سربلند کرنے کا جذبہ موجزن ہو جائے تو انقلاب رونما ہو سکتا ہے۔ کیونکہ کامیابی کے لیے جن جن باتوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ صرف نوجوانوں ہی میں پائی جا سکتی ہیں۔ مثلاً قوتِ ارادی، جفاکشی، جوشِ عمل، سرگرمی اور قربانی۔ کاش میری قوم کے نوجوان اقبال کے پیغام کو دل میں جگہ دیں!

میں نے جو کچھ لکھا ہے، اسکی تائید اُن خیالات سے بھی ہو سکتی ہے۔ جو مصر کے سفیر ڈاکٹر عبدالوہاب عزام بے نے موتمر عالم اسلامی کے جلسہ کراچی منعقدہ ۱۱ر فروری ۱۹۵۱ء میں اپنی صدارتی تقریر میں ظاہر کیے۔ اُنھوں نے کہا کہ

دنیائے اسلام کا مستقبل، مسلمان نوجوانوں کی سیرت اور بلند حوصلگی پر موقوف ہے، میری رائے میں، مغربی تہذیب نے سائنٹفک، اور مادی ترقیوں کے پردہ میں مسلمان نوجوانوں کو بڑی حد تک صراطِ مستقیم سے منحرف کر دیا ہے بقولِ

(۱۱)

اِس پُرکیف اور پُرسوز نظم میں اقبال نے بڑے دلکش انداز سے مسلمان نوجوانوں کو جہاد کی تلقین کی ہے اُسی جہاد کی تلقین، جس کی وجہ سے انگلستان کی عورتیں، سولہویں صدی میں، اپنے ضدی بچّوں کو یہ کہہ کر سُلا دیا کرتی تھیں "HUSH BABY HUSH THE TURKS ARE COMING" "سو جا بچے سو جا! ترک آن پہنچے یا آرہے ہیں!!

اسی جہاد کی تلقین جو انگریز علیہ ما علیہ کی نظر میں، مسلمانوں کا سب سے بڑا جرم تھا، اور جس کی پاداش میں اُنھوں نے ۱۸۵۷ء میں قلعۂ دہلی کے سامنے، اکبر آبادی مسجد کو، زیرِ زمین دفن کر دیا، اور اس کے اوپر ایڈورڈ ہفتم

اکبر الہ آبادی سے — شیطان نے دکھا کے جمالِ عروسِ دہر

بندہ بنا لیا ہے اُنہیں، حبِّ جاہ کا!

اس لیے ہمارے علماء کا فرضِ اوّلین یہ ہے کہ وہ اس گمراہی کا سدِّباب کریں۔ جو تہذیب مغرب کی بدولت اُنمیں پیدا ہو گئی ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ وہ ان کے ذہن کو اسلامی نظامِ تصورات و افکار (ISLAMIC IDEOLOGY) کی روشنی سے منوّر کریں، مغربی تہذیب کا لازمی نتیجہ جہالت ہے اور یہ تاریکی صرف نورِ اسلام سے دُور ہو سکتی ہے۔ جب ہمارے نوجوان، اسلامی اصولوں سے واقف ہونگے تو یقیناً اپنی زندگی ان اصولوں کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کریں گے۔

مسلمانانِ عالم کا مستقبل، بلاشبہ آئندہ نسلوں کی پاکیزہ سیرت اور بلند حوصلگی پر موقوف ہے۔ اگر ہم ان کی سیرت اسلامی اخلاق کے سانچے میں ڈھال سکیں تو یقیناً ہم اُنھیں جسمانی اور روحانی دونوں پہلوؤں سے مضبوط بنا سکتے ہیں، اور اس کی بدولت وہ دنیاوی مشکلات کا بآسانی مقابلہ کر سکیں گے۔

کا مجسمہ نصب کر دیا۔ میری رائے میں یہ مسجد نہیں تھی، جو یوں مٹی کے نیچے چھپ گئی، انگریز نے مسلمانوں کی عزتِ ملّی کو خاک میں ملا دیا۔ کاش میری قوم کے اندر انتقام کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ اور ہم اس مقدس خانۂ خدا کو

نیز اگر ہم اُن کے دلوں میں، زخارفِ دنیوی سے نفرت کا جذبہ پیدا کرنے میں کامیاب ہو جائیں (اسی چیز کو اقبال نے شانِ استغنا سے تعبیر کیا ہے) تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم ایک مضبوط ملّتِ اسلامیہ پیدا کر سکیں گے، بقول اقبال ؎

نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیبِ حاضر کی تجلّی میں
کہ پایا میں نے استغنا میں معراجِ مسلمانی

مسلمان نوجوانوں کی صحیح تربیت کے سلسلہ میں دو باتوں کو مدِّنظر رکھنا چاہیئے۔ پہلی بات یہ ہے کہ اُنہیں اسلام کے اُصولوں سے آگاہ کیا جائے، دوسری بات یہ ہے کہ اُن کے سامنے صحیح نمونہ پیش کیا جائے۔ یعنی ہم خود، اسلامی طریقِ زندگی اختیار کریں تاکہ ہمیں دیکھ کر وہ بھی اپنی زندگیوں کو اسلامی سانچہ میں ڈھال سکیں۔ (انتہیٰ بلفظہٖ)

علامہ اقبال نے آج سے پندرہ سال پہلے اپنے خیالات کو اس شعر میں پیش کر دیا تھا۔

اگر جواں ہوں مری قوم کے جسُور وغیُور
قلندری مری کچھ کم سکندری سے نہیں

از سرِ نو زندہ کر سکیں!

اس نظم کا پہلا شعر، اقبال کے جذباتِ ملّی ہی کا آئینہ دار نہیں ہے، اُن کے کمالِ فن پر بھی شاہد ہے۔ اُنھوں نے اپنی بات ایسے مؤثر انداز سے کہی ہے۔ کہ تعریف و توصیف کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ خصوصاً لفظ "پھر بھی" تو سارے شعر کی جان ہے اور اس کے اندر رجائیت (OPTIMISM) اور یقین کا جو رنگ جھلکتا ہے، اس کا اندازہ صرف ذوقِ سلیم ہی سے ہو سکتا ہے۔

(۱) فرماتے ہیں کہ اے مسلمان! جس چراغ کے پرتو سے تیری گذشتہ شب روشن تھی، وہ چراغ، اگرچہ تیری ہی غفلت اور حماقت کی وجہ سے بجھا، لیکن تو مایوس مت ہو۔ وہ چراغ پھر بھی روشن ہو سکتا ہے۔ غور کیجیے! اقبالؔ نے کس خوبصورتی کے ساتھ، ایک شعر میں ماضیؔ، حالؔ اور مستقبل، تینوں زمانہ جمع کر دیئے ہیں۔

(ا) "شب روشن منور تھی" یعنی زمانۂ ماضی میں مسلمانوں، کو سربلندی حاصل تھی۔

(ب) "چراغِ خاموش"، یعنی زمانۂ حال میں وہ سربلندی حاصل نہیں ہے

(ج) پھر روشن ہو سکتا ہے" یعنی زمانۂ مستقبل میں وہی سربلندی پھر حاصل ہو سکتی ہے۔

لفظ "پھر بھی" پر غور کیجیے! کیا آپ کو اس لفظ کے پردہ میں اقبال کے

لہ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحبؒ نے اپنا شہرۂ آفاق ترجمہ قرآن حکیم اسی مسجد میں بیٹھ کر پایۂ تکمیل کو پہنچایا تھا۔ اور اسی مسجد میں، روحانی فیض کا چشمہ جاری کیا تھا۔ ۱۲

جذبات کا طوفان نظر نہیں آتا ؟

اب سوال یہ ہے کہ وہ چراغ کیا تھا جس کے پرتو سے مسلمان کی شب گذشتہ منور ہوئی تھی ؟ اقبال نے اگرچہ صراحتاً اس کا ذکر نہیں کیا، لیکن "اَلکنایۃ ابلغ من التصریح" علم معانی کا مسلّمہ اصُول ہے۔ اشارہ میں جو لطف ہے، وہ صراحت میں کہاں ہے ؟ ہر شخص باندک تامّل) اس کا جواب دے سکتا ہے کہ "چراغ خاموش" کنایہ ہے، جذبۂ جہاد سے جو سرد ہو چکا ہے۔ وہی جذبہ جس کے سرد کرنے کے لیے انگریز نے ۱۸۵۷ء سے ۱۸۸۷ء یعنی کامل تیس سال تک علماء کے خلاف دار و گیر کی مہم جاری رکھی۔ اور جب تک اُنھوں نے اپنی دانست میں ہر سچے عالم دین کو گرفتار کر کے کالے پانی نہیں بھیج دیا، اس مہم کو بند نہیں کیا۔ اور جب اس مہم کو بند کیا تو آئندہ اس جذبہ کا سدِّباب کرنے کی غرض سے "پنجاب انتخاب ہفت کشور" میں ایک "نبی" پیدا کیا، جس نے ۱۸۸۷ء سے ۱۹۰۷ء تک بڑے زور اور حملوں کے ساتھ جہاد کے خلاف پروپیگنڈہ کر کے، اپنا فرض منصبی ادا کیا۔

غور سے دیکھو تو اقبال نے ہر کتاب میں مسلمانوں کو یہی پیغام دیا ہے کہ اپنے اندر جہاد کا جذبہ پیدا کرو۔ تاکہ انگریز سے انتقام لے سکو۔ پس میری رائے میں اقبال کی تعلیم کا خلاصہ دو لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

جہاد سے محبت + انگریز سے نفرت

نوٹ :۔ انھی دو باتوں کو مدِّنظر رکھ کر میں نے کلام اقبال کی شرح کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ اللہ میری مدد فرمائے۔ آمین !

(۲) یاد رکھو! صرف وہی شخص زمانہ کا گلہ اور بدقسمتی کا شکوہ کرتا ہے۔ جو پست ہمت اور کم حوصلہ ہوتا ہے۔ مومن کبھی ناکامی سے مایوس نہیں

ہوتا، اگر تقدیر یعنی اللہ کی مشیت کی بنا پر اسے کسی معاملہ میں کامیابی نصیب نہیں ہوتی، تو وہ اس نشتر (نیش) کو شہد (نوش) سمجھتا ہے۔ اسلیے وہ ہر ناکامی کے بعد دُگنی طاقت سے کام لیتا ہے۔ اور انجام کار مشکلات پر غالب آتا ہے۔

نوٹ :۔ مشہور انگریزی شاعر براؤننگ (BROWNING) نے بھی اس موضوع پر ایک نظم لکھی ہے جس میں وہ یہ کہتا ہے کہ ناکامی کا مطلب یہ ہے کہ کوشش میں کچھ کمی رہ گئی تھی، اس لیے دوبارہ کوشش کرو، پس ناکامی باعثِ رنج و ملال نہیں ہے۔ بلکہ عقلمند کے لیے پیامِ مسرّت ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس نظم کا جو میں نے ۱۹۱۶ء میں پڑھی تھی ایک مصرع اب تک یاد ہے THEN WELCOME BACKREBUFF یعنی اگر یہ بات ہے کہ ناکامی پیام مسرت ہے تو پھر ہر ناکامی کو خوش آمدید کہنا چاہیئے۔"

نوٹ :۔ میں نے اس شعر کی تشریح میں تقدیر کے معنی "مشیتِ ایزدی" کیے ہیں اس کی دلیل یہ ہے کہ خود اللہ نے مسلمانوں کو اس حقیقت سے آگاہ کر دیا ہے کہ اے مسلمانو! یاد رکھو اس کائنات میں کوئی انسان، جن، فرشتہ، بادشاہ شیطان، غرضکہ کوئی ہستی تمہیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ اگر تمہیں کوئی تکلیف پہنچ سکتی ہے، تو صرف اللہ یعنی میرے حکم سے پہنچ سکتی ہے پس تم دنیا میں کسی حکومت یا طاقت سے خوف زدہ یا مرعوب نہ ہونا۔ کیونکہ کسی میں تمہیں نقصان پہنچانے کی طاقت ہی نہیں ہے۔

قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا هُوَ مَوْلٰنَا	اے میرے محبوب! آپ فرما دیجیے کہ ہمیں ہرگز کوئی تکلیف نہیں پہنچ سکتی، سوائے اس تکلیف کے، جو اللہ نے ہمارے لیے

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ (سورۂ توبہ آیت ۵۲)	لکھ دی ہے وہی ہے، ہمارا کارساز پس مسلمانوں کو لازم ہے کہ اللہ ہی پر بھروسہ رکھیں۔

اس آیت کی شرح تو اُس وقت لکھوں گا جب خدا کے فضل سے "قرآنِ حکیم کی خصوصیات" کے عنوان سے ایک مستقل کتاب لکھوں گا۔ اس وقت صرف اس بات پر اکتفا کرتا ہوں کہ یہی آیت تو مسلمانوں کے دل کی گہرائیوں میں اُتر گئی تھی جس کی بنا پر ان میں اس قدر طاقت پیدا ہو گئی تھی کہ اُنھوں نے تسخیرِ ایران کے زمانہ میں، ایک دفعہ طغیانی کی حالت میں دریا کے اندر گھوڑے ڈال دیے تھے چنانچہ جب وہ ساحل پر پہنچے، تو ایرانی سپاہی یہ کہہ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ "دیوان آمدند! دیوانؑ آمدند!!" کیونکہ اُنھیں ہرگز توقع نہیں تھی کہ کوئی انسان طغیانی میں دریا کو عبور کر سکتا ہے۔ پس یہ لوگ انسان نہیں ہیں بلکہ دیو ہیں

(۳) اے مسلمانو! یاد رکھو! اور اے نوجوانو! کان کھول کر سُن لو! اگر تم نالۂ مُرغانِ سحر سے مدہوش ہو سکتے ہو، یعنی اگر تم کو بلبل کی آواز یا کسی عورت کی تصویر، متاثر کر سکتی ہے، تو تم ہرگز میدانِ جنگ میں کارِ نمایاں انجام نہیں دے سکتے۔

بات یہ ہے کہ میدانِ جنگ میں، شمشیر زنی وہ شخص کر سکتا ہے جو فولاد کا جگر رکھتا ہو، لیکن جو شخص عورتوں کی دلکش آواز سے مغلوب ہو سکتا ہے وہ دشمن کو کس طرح مغلوب کر سکتا ہے۔

اس وقت ایک تاریخی واقعہ یاد آ گیا جو نہایت برمحل ہے:۔

شہزادہ مراد نے، قلعہ گوالیار کے بعض ذمہ دار افسروں کو گرانبہار شوت

لہ (GIANTS)

دیکر کمند کے ذریعہ سے فرار ہونے کا انتظام کیا۔ رات کے ۳ بجے فرار ہونے سے قبل، یہ بیوقوف شہزادہ اپنی ہندو محبوبہ سے (جس کا نام اس وقت یاد نہیں آتا) رخصت ہونے کے لیے اس کے کمرہ میں آیا جو "گارڈ روم" سے ملحق تھا۔ وہ "وفا کی دیوی" اُس سے لپٹ گئی۔ اور بے اختیار چیخ مار کر رونے لگی اس کے چیخنے سے تمام سنتری دروازہ پر جمع ہو گئے اور راز فاش ہو گیا۔

نوٹ:۔ میں نے اس ہندو عورت کو وفا کی دیوی سے تعبیر کیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وفا کے اعتبار سے ہندو عورت اپنی نظیر نہیں رکھتی۔ واقفِ رموزِ عاشقی حضرت امیر خسرو دہلویؒ فرماتے ہیں:۔

در محبت چوں زن ہندو کسے فرزانہ نیست
سوختن بر شمع مُردہ، کار ہر پروانہ نیست

(۴) محراب گل کہتا ہے کہ اے پاکستان کے مسلمان نوجوان! میں دیکھتا ہوں کہ تیری طبیعت لہو و لعب کی طرف مائل ہے۔ ابھی تک تیرے اندر ناسمجھ بچوں کی سی عادتیں پائی جاتی ہیں۔ جو ہر دلکش اور میٹھی چیز کو دیکھ کر مچل جاتے ہیں، اور یورپ کے عیّار جو تیرے ملک پر مسلّط ہیں، مٹھائی اور چاکلیٹ کی تجارت میں ماہر ہیں، ایسا نہ ہو کہ تو ان مٹھائیوں کی طرف مائل ہو کر، مقصدِ حیات سے غافل ہو جائے۔

اس شعر میں اقبالؔ نے بڑا زبردست نفسیاتی نکتہ بیان کیا ہے اگر کوئی شخص انگریزی مٹھائی پسند کرتا ہے تو رفتہ رفتہ وہ انگریزی تہذیب کو بھی پسند کرنے لگے گا۔ اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ انگریزوں کی سوسائٹی کو پسندیدہ نظروں سے دیکھنے لگے گا اور جب یہ حالت رونما ہو جائے گی تو وہ اُن کے خلاف صف آرا کیسے ہو سکتا ہے؟

"شکر پارہ فروشی" سے سینما، ریڈیو، محافل رقص و سرود ہوٹلوں کی زندگی مغربی طرز معاشرت، اور مخلوط تعلیم بھی مراد ہو سکتی ہے اور یہ وہ نعمتیں ہیں، جو نوجوانوں کو میدان جنگ تو بڑی چیز ہے جد و جہد سے بھی بیگانہ بنا رہی ہیں۔ اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے، کہ آج کالج کا نوجوان لڑکیوں سے زیادہ اپنا وقت اور روپیہ جسمانی آرائش پر صرف کرتا ہے۔ اور لیسا اوقات اس پر عورت ہونے کا شبہ ہونے لگتا ہے۔

(۱۴)

اس غزل میں اقبال نے بعض حقائق و معارف بیان کئے ہیں۔ یعنی فلسفہ کو شعر کی زبان میں ادا کیا ہے۔

(۱) پہلے شعر میں اگرچہ مخاطب مذکور نہیں ہے لیکن قرینہ دلالت کرتا ہے کہ ترکوں سے خطاب ہے۔ کیونکہ اسی قوم نے مصطفےٰ کمال کی زیر ہدایت حکومت ترکی کو "ترقی" کی راہ پر گامزن کرنے کے لیے، لادینی تہذیب اور لاطینی حروف کو اختیار کیا۔

لادینی سے مراد ہے، یہ نظریہ کہ حکومت کا کوئی مذہب نہیں ہے مصطفےٰ کمال نے اپنی کوتاہ بینی کی بدولت یہ رائے قائم کی کہ اگر ہم یہ اعلان کردیںگے کہ ہم بھی مسلمان ہیں، اور حکومت کا مذہب بھی اسلام ہے، تو یورپ کی حکومتیں ہم سے ناراض ہو جائیں گی اس لیے اُس نے یہ اعلان کیا کہ ترکی ایک لادینی اسٹیٹ (SECULAR STATB) ہے۔ یعنی اسلامی اصول ترک کر کے میکیاولی کا اصول اختیار کر لیا، کہ سیاست کو مذہب سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو یہ بات مصطفےٰ کمال کی دینی کم مائیگی پر دلالت

کرتی ہے۔ اس لیے کہ اسلام میں سیاست اور مذہب جُدا نہیں ہیں۔ علاوہ بریں، انگلستان کا بادشاہ تو "محافظ دینِ عیسوی" کے لقب پر فخر کرتا ہے۔ پس اگر مصطفےٰ کمال بھی یہ اعلان کر دیتا کہ میں محافظِ دین اسلام ہوں، تو کوئی حرج نہ تھا لیکن وہ یورپین تہذیب سے اس درجہ مرعوب ہو گیا کہ اس نے لادینی کے علاوہ لاطینی حروف تہجی بھی قبول کر لیے۔

۱۹۲۴ء سے پہلے ترکی زبان کا رسم الخط ترکی یا فارسی تھا لیکن تجدّد کے شوق میں مصطفےٰ کمال نے اپنی زبان کا رسم الخط بھی بدل دیا۔ اور اب ترکی زبان لاطینی حروف میں لکھی جاتی ہے۔

چونکہ علامہ کا دل مصطفےٰ کمال کی اس غیر اسلامی روش سے بہت ملول ہو گیا تھا، اس لیے اُنہوں نے اپنے رنج و غم کا اظہار اس طرح کیا کہ اے نادان ترک تو بڑی حماقت میں مبتلا ہو گیا ہے۔ اے بیوقوف! کیا تو سمجھتا ہے کہ حکومت کو لادینی بنا کر اور لاطینی حروف اختیار کر کے، تو طاقتور قوموں کی صف میں شریک ہو سکے گا؛ یاد رکھ! تیرے ضعف کا علاج، یہ نہیں کہ تو یورپ کی کورانہ تقلید کرے، بلکہ تجھے لازم ہے کہ اپنے عقائد درست کرے دنیا میں طاقت حاصل کرنے کے لیے تجھے اس عقیدہ کو ذہن نشین کرنا چاہیے کہ "لَا غَالِبَ اِلَّا ھُوْ" یعنی اللہ کے علاوہ اور کوئی طاقت مجھ پر غالب نہیں آسکتی۔ واضح ہو کہ "لَا غَالِبَ اِلَّا ھُوْ" کی ترکیب قرآن حکیم کی اس آیت سے ماخوذ ہے، "كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ"۔ یعنی اللہ نے فیصلہ فرما دیا ہے کہ میں اور میرے رسول بلا شبہ غالب رہیں گے۔"

(۲) صیاد معانی سے مراد ہے وہ شخص جو حقیقت یا روحانیت کا طالب ہو۔ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص یہ چاہتا ہے کہ یورپ کی تہذیب سے

روحانیت یا پاکیزگی اخلاق کا درس لے، تو وہ یقیناً اس کوشش میں ناکام رہے گا۔ کیونکہ یورپ میں یہ جنس بالکل ناپید ہے۔ یورپین تہذیب تو مادّہ پرستی پر مبنی ہے اگرچہ یہاں کی فضا بھی دلکش ہے، اور آہو بھی موجود ہیں، لیکن "نافہ" جس پر آہو کی قدر و قیمت کا انحصار ہے، ناپید ہے۔ یعنی یورپ میں متمدن سوسائٹی (فضا) بھی ہے۔ اور درسگاہیں اور اساتذہ بھی ہیں۔ مگر ان کے اندر روحانیت اور اخلاق حسنہ کا مطلق وجود نہیں ہے۔

(۳) اشک سحر گاہی کے بغیر، خودی کی تقویم یعنی تربیت اور اس کا استحکام ناممکن ہے (واضح ہو کہ اقبال نے اس مصرع میں لفظ "مشکل" "ناممکن" کے معنی میں استعمال کیا ہے)

خودی کو لالۂ پیکانی سے تشبیہہ دے کر اس نکتہ کو واضح کیا ہے کہ جس طرح آبِ جو (نہر کا پانی) لالۂ پیکانی کی شگفتگی کے لیے ضروری ہے۔ اسی طرح اشک سحرگاہی خودی کی نشوونما اور اس کے ارتقا کے لیے شرطِ اوّلین ہے لالۂ پیکانی میں، لفظ "پیکانی" لالہ کی صفت ہے۔ یعنی جب تک لالہ، غنچہ کی حالت میں رہتا ہے، اس کی شکل پیکاں (نوکِ تیر) سے ملتی جلتی ہے۔ گویا اس لفظ سے لالہ کی تصویر کھینچ دی ہے۔

واضح ہو کہ اقبال کے فلسفہ میں "اشک سحرگاہی" یا "آہ سحرگاہی" کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ شاید ناظرین متعجب ہوں کہ فلسفہ جیسے خشک موضوع کو اشکِ سحرگاہی سے کیا رابطہ؟ اس کا جواب یہ ہے کہ میں نے یہاں لفظ فلسفہ کو نظام افکار، کے معنوں میں، استعمال نہیں کیا ہے۔ بیشک فلسفہ کے اصطلاحی معنیٰ میں 'اشک' اور 'آہ'، کی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن اقبال کی تصانیف

میں ہمیں دونوں قسم کا فلسفہ مل سکتا ہے۔

(ا) فلسفہ بمعنی مجرد غور و فکر جو الٰہیات یا امورِ عامہ[1] میں کیا جائے۔ اس اعتبار سے اقبال کا فلسفہ، اُن کی انگریزی کتاب "فکرِ اسلامی کی تشکیل جدید۔" "RECONSTRUCTION OF RELIGIONS THOUGHT" میں مل سکتا ہے۔ اور اس میں "اشکِ سحرگاہی" کا تذکرہ نہیں ہے۔

(ب) فلسفہ بمعنی دین اسلام کے حقائق و معارف کی تشریح اس اعتبار سے اقبال نے اپنا فلسفہ، اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی میں مدوّن کیا ہے۔ اس امتیاز کو میں نے اس لیے واضح کر دیا ہے کہ اقبال محض اصطلاحی معنوں میں فلسفی نہیں ہیں، وہ دین اسلام کے وکیل اور شارح بھی تو ہیں، اور مسلمانوں کی نگاہ میں ان کی جو کچھ قدر و قیمت ہے، وہ اسی حیثیت سے ہے۔

اس تمہید کے بعد اب مقصود کی طرف واپس آتا ہوں، اقبال نے، جیسا کہ سب جانتے ہیں، خودی کا فلسفہ پیش کیا ہے۔ یہ خودی کا فلسفہ دراصل اصطلاحی معنیٰ میں فلسفہ نہیں جیسا ڈیکارٹ یا ہیوم، کانٹ یا ہیگل کا فلسفہ بلکہ اسلامی شریعت، اور شریعت کے باطن یا مغز یعنی طریقت کی بیسویں صدی میں، فلسفیانہ انداز میں توجیہہ ہے۔ چنانچہ مثنوی "پس چہ باید کرد" کا مطالعہ کرنے سے میرے دعوے کی صداقت واضح ہو سکتی ہے۔ مثلاً صرف ایک شعر نقل کیے دیتا ہوں:۔

پس طریقت چیست اے والا صفات
شرع را دیدن بہ اعماقِ حیات!

---

[1] فلسفہ کی اصطلاح میں امورِ عامہ سے ہیولیٰ، صورۃ، حرکت، سکون، زمان اور مکان سے متعلقہ مسائل مراد ہیں۔ ۱۲

خودی کا فلسفہ، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ اگر ایک مسلمان، شریعت محمدیہ کا اتباع کامل کرلے، تو اُس کے اندر شانِ فقر پیدا ہوجاتی ہے۔ اور یہی شانِ فقر، خودی کی معراج، یا اُس کی تکمیل ہے۔

اب اتباع، عشق کے بغیر ناممکن ہے، اور عاشق کے لیے اشک سحرگاہی یا آہ سحرگاہی، بمنزلۂ وظیفہ حیات ہے، بلکہ منطقی اصطلاح میں عشق اور آہ لازم وملزوم ہیں. یہ ناممکن ہے کہ عاشق، محبوب کو یاد کرے اور اُس کی آنکھ اشک آلود نہ ہوجائے چنانچہ ایک شاعر لکھتا ہے ؂

ہے درد اپنا سحر کو نالہ و فریاد کرلینا
بہرصورت، کسی پردہ میں تجھ کو یاد کرلینا

اقبال کا فلسفہ، مکرر لکھتا ہوں، عشق رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ اور یہ ناممکن ہے کہ عشق تو ہو لیکن اشک نہ ہو۔ اسی لیے تو انہوں نے یہ کہا ؏

بے اشک سحرگاہی، تقویم خودی مشکل

اقبال کی رائے میں، کافر کی خودی تو خودی ہی نہیں۔ ہاں، اگر وہ، سرورِ کائنات سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے تو اُس کی خودی تربیت کے لائق ہوسکتی ہے۔

غرض عشقِ رسول ؐ اختیار کرنے سے خودی مرتبۂ کمال کو پہنچے گی اور عشق کا ثبوت، اشک اور آہ ہی کے ذریعہ سے دیا جاتا ہے مسلمان کے لیے تو عاشقی شرط اسلام ہے۔ جو شخص مسلمان ہونے کا مدعی ہو۔ اور سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق میں بیخود نہ ہو، اقبال کی نظر میں وہ شخص مسلمان نہیں ؂

طبع مسلم از محبت قاہر است!!
مسلم ار عاشق نباشد کافر است

اسی نکتہ کو ایک شاعر نے یوں بیان کیا ہے:۔

بس اتنی سی حقیقت ہے ہمارے دین وایمان کی
کہ اُس جانِ جہاں کا آدمی دیوانہ ہوجائے

اگر اس اشک سحرگاہی کی پوری وضاحت کروں تو ایک کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ اس لیے اقبال ہی کے ایک شعر پر اس بحث کو ختم کرتا ہوں۔

عطارؒ ہو، رومیؒ ہو، رازیؒ ہو، غزالیؒ ہو!
کچھ ہاتھ نہیں آتا، بے آہِ سحرگاہی! (بال جبریل)

(۴) یہ دنیا، یہ پرانا بُت خانہ، جہاں رنگ اور بُو کے ہزاروں لاکھوں بُت رکھے ہوئے ہیں، اس کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ کافر تو اس طلسم میں پھنس جاتا ہے، یعنی بتوں کے تیرِ مژگاں کا شکار ہوجاتا ہے۔ لیکن مومن اِس طلسم کو توڑ دیتا ہے۔ بالفاظ دیگر، اس بُت خانہ میں جتنے بُت ہیں سب اُس کے سامنے سجدہ ریز ہوجاتے ہیں۔

اقبال نے دنیا کو ہر جگہ "طلسمِ رنگ وبو" سے تعبیر کیا ہے یعنی وہ دُنیا جو حواس خمسہ سے محسوس ہوتی ہے۔ طلسم اور بُت خانہ کے الفاظ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ دنیا اور اس کی دلفریبی کی کوئی حقیقت نہیں ہے مومن کا فرض ان بتوں کو پاش پاش کرنا ہے، نہ کہ اُن سے دل لگانا اقبال کا یہ تصور قرآن حکیم کی اس آیت سے ماخوذ ہے:۔ وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ، اور دنیا کی زندگی کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ یہ دھوکہ کی پونجی ہے۔ دیکھو تو ہے غور کرو تو کچھ بھی نہیں۔

(۵) بلاشبہ اقبالؔ نے یہ شعر لکھ کر بڑی اخلاقی جرأت کا ثبوت دیا ہے "امیروں" سے اشارہ اُن زمینداروں، جاگیرداروں، دولت مندوں، اور سرمایہ داروں کی طرف ہے جو :-

(ا) غریب کاشتکاروں کا خون چوس چوس کر اپنی تجوریاں لبریز کرتے ہیں، اور اُس مالِ حرام سے حکام کو رشوت دے کر، بڑے بڑے کارخانے "الاٹ" کراتے ہیں۔ اس کے علاوہ بلیک مارکیٹ اور ذخیرہ اندوزی سے لاکھوں روپیہ سالانہ کماتے ہیں۔

(ب) سال میں ایک دو مرتبہ عید یا بقرعید کی نماز پڑھنے کے لیے مسجد میں آتے ہیں۔ تو خانۂ خدا میں بھی مختلف صورتوں سے اپنی فرعونیت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ان کے قلوب انسانی ہمدردی کے جذبات سے بالکل معرّا ہوتے ہیں۔ اسلامی زاویۂ نگاہ سے ان میں، اور بہائم میں کوئی فرق نہیں ہوتا اور چونکہ ان کی نمازیں، محض ریاکاری یا دنیا کے حصول کے لیے ہوتی ہیں، اس لیے اُن سے مسجد کو سخت روحانی تکلیف پہنچتی ہے، بلکہ اُن کے سجدے، اس مقدس زمین کی بے حرمتی کا سبب ہوتے ہیں۔

اندریں حالات اقبال کا احتجاج بالکل درست ہے کہ اے شیخ! ان زرپرستوں کو مسجد سے نکلوا دے۔ یہ تو دولت کے پجاری ہیں، ان کا اللہ کے گھر میں کیا کام! یہ تو سرمایہ دار ہیں ان کو اسلام سے کیا علاقہ

—— (۱۳) ——

اس نظم میں اقبال نے قوم سے خطاب کیا ہے۔ اور ایک اہم بات کی طرف توجہ دلائی ہے۔ جو یہ ہے کہ یوں تو مسلمان، مراقش سے لیکر چین

تک موجود ہیں۔ لیکن اس وقت دنیا کی طاقتور قوموں کی صف میں اُن کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ کیونکہ وہ آزاد نہیں ہیں۔ بلکہ کسی نہ کسی قسم کی غلامی میں مبتلا ہیں۔ مثال کے طور پر یوں سمجھو کہ

(ا) بعض ممالک کے مسلمان سیاسی غلامی میں گرفتار ہیں۔ مثلاً ہندوستان کے مسلمان

(ب) بعض ممالک، بلکہ اکثر ممالک کے مسلمان اقتصادی غلامی میں مبتلا ہیں مثلاً پاکستان کے مسلمان۔

(ج) تمام ممالک کے مسلمان، ذہنی غلامی میں مبتلا ہیں۔ مثلاً افغانستان کے مسلمان۔

اور یہ یقینی بات ہے کہ جب تک وہ غلامی کی ان اقسام سہ گانہ میں گرفتار ہیں، آزاد قوموں کی صف میں اُن کو ہرگز جگہ نہیں مل سکتی۔

(۱) اے مسلمان! مجھے یہ علم نہیں کہ تو حالاتِ حاضرہ یعنی عصرِ حاضر کے تقاضوں سے باخبر ہے یا نہیں، لیکن میں اپنی جگہ پر یہ دیکھ رہا ہوں کہ اس وقت ساری دنیا ایک انقلابی دَور سے گذر رہی ہے، اور ہر طرف ایک ہنگامہ بپا ہے۔

(۲) اس وقت ہر ملک قیامت کا نمونہ پیش کر رہا ہے۔ اور ہر شخص مضطرب ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غور و فکر کے سانچے، اور پرانے طور طریقے بالکل بدل رہے ہیں۔ اور دنیا کے نوجوان پرانے نظام کی جگہ، نیا نظام قائم کرنا چاہتے ہیں۔

(۳) اندریں حالات جب میں اپنی قوم کی طرف نظر کرتا ہوں تو ہر ملک میں جمود و خمود کا نقشہ نظر آتا ہے۔ مسلمان آنیوالے انقلاب کے لیے کسی قسم کی

تیاری میں مصروف نہیں ہیں۔
دنیا کی قومیں نت نئے ساز و سامانِ جنگ ایجاد کر رہی ہیں اور کامیابی کے لیے مادّی وسائل جمع کر رہی ہیں، لیکن مسلمان قوم صرف مناجاتِ سحر پر اکتفا کیے بیٹھی ہے۔ اس لیے اقبال پیرِ حرم سے دریافت کرتے ہیں کہ جنگ کی تیاری کے بغیر، کیا صرف دعاؤں اور مناجاتوں سے کام چل سکتا ہے؟ زندگی کامیاب اور سربلند زندگی بسر کرنے کے لیے معرکہ آرائی، شرط ہے چونکہ تنازع للبقاء، قانونِ حیات ہے۔ اس لیے جو قوم اپنی بقا کے لیے جدوجہد نہیں کرتی، وہ کس طرح باقی رہ سکتی ہے؟ لہٰذا بے معرکہ زندگی، یعنی بے عملی کی زندگی کی تلافی مناجاتِ سحر سے کسی طرح نہیں ہو سکتی۔ بیشک مناجات بھی ضروری ہے، لیکن اس سے پہلے میدان جنگ کی تیاری ضروری ہے[1]۔

(۴) حالات کا تقاضا تو یہ ہے کہ مسلمان دن رات، جہاد کی تیاری میں مصروف رہیں۔ لیکن ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ابھی تک خانقاہی زندگی بسر کر رہے ہیں۔

اب جب ہم خانقاہی زندگی کا جائزہ لیتے ہیں تو یہ حقیقت صاف واضح ہو جاتی ہے کہ اس زندگی سے خودی کی تربیت اور تکمیل نہیں ہو سکتی۔ بیشک کسی زمانہ میں ہماری خانقاہیں، مسلمانوں میں جہاد کا جذبہ پیدا کیا کرتی تھیں یعنی ان میں خودی کی تخلیق ہوا کرتی تھی۔ لیکن موجودہ زمانہ میں ہماری خانقاہیں محض بے عمل انسانوں کے اجتماعوں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔

[1] سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ۲۳ سالہ حیاتِ طیبہ میرے دعوے پر شاہد عادل ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کس نے مناجات کی ہو گی، لیکن آپ نے جہاد کی تیاری میں کبھی کوتاہی نہیں فرمائی۔ ۱۲

آج کل عموماً حالت یہ ہے کہ ان خانقاہوں کے شیوخ، مسلمانوں کو کفار کے خلاف صف آرا کرنے کے بجائے، اُن کی غلامی اختیار کرنے کا درس دے رہے ہیں۔ اور جہاد کا جذبہ پیدا کرنے کی جگہ، ترکِ دنیا اور گوشہ نشینی کی تلقین کر رہے ہیں۔ جس طرح شعلۂ نم خوردہ سے آگ نہیں نکل سکتی۔ اسی طرح ان خانقاہوں سے مجاہد تیار ہو کر نہیں نکل سکتے۔

علاوہ بریں موجودہ زمانہ میں، یہ خانقاہیں، حریت کا درس دینے کے بجائے مسلمانوں کو ذہنی غلامی میں مبتلا کر رہی ہیں[1]۔ اور یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اگر کوئی قوم ذہنی غلامی میں مبتلا ہو جائے تو وہ سیاسی آزادی کبھی حاصل نہیں کر سکتی۔

حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوۂ حسنہ ہمارے سامنے موجود ہے۔ آپ نے سب سے پہلے عربوں کو ذہنی غلامی سے نجات عطا فرمائی۔ اس کے بعد انہیں خود بخود سیاسی آزادی حاصل ہو گئی۔

پس اگر مسلمان، دنیا میں دوبارہ سربلند ہونا چاہتے ہیں تو انہیں خانقاہی زندگی کو بکلی ترک کر کے، مجاہدانہ زندگی اختیار کرنی چاہیے۔ یعنی مزاجِ خانقاہی کے بجائے، اپنے اندر مزاجِ اسد اللّٰہی پیدا کرنا چاہیے۔

—— (۱۴) ——

اس دلپذیر غزل میں، اقبال نے بعض حقائق و معارف بیان کیے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ

(۱) جس عشق میں جراتِ رندانہ موجود نہ ہو، وہ روباہ صفت یعنی عیار اور

[1] موجودہ زمانہ میں اکثر شیوخ مسلمانوں کو اللہ کا بندہ بنانے کے بجائے اپنا بندہ بنا لیتے ہیں، جو غلامی کی بدترین قسم ہے۔ ۱۲

مکار، خود غرض، نفس پرست لوگوں کا عشق ہے۔ بالفاظ دگر وہ عشق نہیں بلکہ ہوس ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک مسلمان اسلام کے اِدّعا کے باوجود، میدان جنگ یا جہاد فی سبیل اللہ سے جی چُراتا ہے، تو وہ مسلمان یا عاشق نہیں، بلکہ لومڑی کی طرح عیار اور مکار ہے۔ اگر سر کٹانے کی ہمت اور خون میں نہانے کا حوصلہ نہیں ہے تو ادعائے عشق خالص فریب نفس ہے۔

اس کے برعکس اگر ایک مسلمان، میدانِ جہاد میں، سر و سینہ پر، پے در پے زخم کھانے کے باوجود، اپنی شمشیر کے جوہر دکھاتا رہے اور جب تک آخری سانس باقی رہے، وار کرنے سے باز نہ آئے تو سمجھو کہ وہ سچا عاشق ہے۔ اس کا عشق ید اللّٰہی ہے۔

اس کی مثال انقلاب ۱۸۵۷ء میں بہت سے مسلمانوں نے دنیا کے سامنے پیش کی، میں معرکۂ بریلی سے ایک نوجوان کی مثال پیش کرتا ہوں۔

۴ مئی ۱۸۵۸ء کو انگریزوں کی فوجیں لکھنؤ فتح کرنے کے بعد بریلی پہنچیں۔ مسلمانوں نے شہر سے چار میل آگے بڑھ کر اُن کا مقابلہ کیا۔ اس فوج میں ۱۳۳ غازی بھی تھے، جو بلا مبالغہ سر سے کفن باندھ کر نکلے تھے۔ انگریزی فوج کے ایک سارجنٹ میجر نے اپنی کتاب "۱۸۵۷ء کے معرکوں کی یادداشت" میں غازیوں کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

"خان بہادر خاں کی فوج میں غازیوں کی ایک جماعت بھی تھی یہ مسلمان سب شہادت کے نشہ میں چور تھے۔ ان کی داڑھیاں تقریباً بالکل سفید تھیں انگلی میں چاندی کی انگوٹھی پہنے ہوئے تھے، جس کے نگینہ پر لفظ "اللہ" کندہ تھا ہر غازی کی کمر میں، سبز رنگ کا پٹکا بندھا ہوا تھا، وہ روئی کی صدری پہنے

ہوئے تھے، اور سر پر سفید پگڑیاں باندھے ہوئے تھے، جن پر سُرخی کے چھینٹے پڑے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ اور پشت پر ڈھال۔ دین کا نعرہ لگا کر ہمارے سامنے آئے۔ اور حملہ آور ہونے سے پہلے ان کا سردار جو ایک بیس سال کا بے ریش و بروت نوجوان تھا، جس کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا، صف سے آگے بڑھ کر ہم سے یوں مخاطب ہوا۔

"کیا تم کافروں میں کوئی شخص ایسا حوصلہ مند ہے جو میرا مقابلہ کر سکتا ہے اگر ہے تو سامنے آئے!"

اس کی آواز سے ہماری صفوں میں سناٹا چھا گیا۔ کوئی نوجوان آگے نہیں بڑھا ایک منٹ انتظار کے بعد اُس نے پھر چیلنج دیا اور کہا میں پانچ آدمیوں سے تنہا مقابلہ کر سکتا ہوں۔ لیکن پھر بھی کوئی حرکت نہ ہوئی۔ آخر جھنجلا کر اُس نے تلوار نیام سے باہر نکالی، اور ہماری صفوں پر حملہ آور ہوا۔ اُس نے اس شدت سے حملہ کیا کہ چشم زدن میں اٹھارہ سپاہیوں کو زخمی کر کے ڈال دیا۔ اُس کی بینظیر شجاعت سے کمانڈنگ افسر اس قدر متاثر ہوا کہ اُس نے حکم دیا کہ اس نوجوان کو زندہ گرفتار کیا جائے لیکن اُس نے کہا کہ تم شیر کو زندہ گرفتار نہیں کر سکتے چنانچہ زخمی ہو جانے کے باوجود، جبکہ اُس کے جسم کے ہر عضو سے خون کے فوارے نکل رہے تھے۔ اُس نے دوبارہ اسی شدت کے ساتھ حملہ کیا جب کمانڈنگ افسر نے یہ حال دیکھا کہ اگر اس کو قتل نہ کیا گیا تو شاید ساری کمپنی (سو آدمی کی ایک کمپنی) کا صفایا کر دے گا۔ تو مجبوراً اُس نے حکم دیا کہ سنگینوں سے خاتمہ کر دو "BAYONET HIM" یہ حکم سُن کر سپاہیوں نے اُسے نرغہ میں لیکر اپنی سنگینیں بیک وقت اُسکے سینہ میں پیوست کر دیں۔ لیکن جب تک اس کی روح جسم میں باقی رہی وہ برابر اپنی تلوار کے جوہر دکھاتا رہا۔ اُس کا ہاتھ اُس وقت ساکن ہوا جب اس کی روح

پرواز کر گئی۔

نوٹ :- میں نے یہ کتاب ۱۹۴۵ء میں ریاست منگرول (کاٹھیاواڑ) کے سرکاری کتب خانہ میں دیکھی تھی۔ اس کا مصنف گھاگھرا پلٹن ۹۳ میں جو لکھنؤ اور بریلی کے معرکوں میں شریک ہوئی تھی، سارجنٹ میجر تھا، اور اُس نے اپنی کتاب میں سارے واقعات چشم دید ہی قلمبند کئے ہیں[1]۔ میں نے اس کتاب کا خلاصہ اُردو میں قلمبند کر لیا ہے۔ شاید کسی وقت کام آجائے۔

میرا مقصد اس واقعہ کے نقل کرنے سے داستان سرائی نہیں ہے۔ بلکہ یہ دکھانا ہے کہ ۱۸۵۷ء تک یعنی آج سے سو سال پہلے تک مسلمان نوجوانوں کی حالت یہ تھی کہ ایک نوجوان تن تنہا، ساری فوج کو چیلنج کر سکتا تھا، لیکن آج یہ حالت ہے کہ پوری قوم، ایک انگریز کو بھی چیلنج نہیں کر سکتی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ قوم کے سامنے کوئی نصب العین نہیں۔ اقبال یہ چاہتے ہیں کہ مسلمان نوجوان پھر اپنے اندر یہی جذبۂ جہاد پیدا کریں۔ اور اس حقیقت کو ذہن نشین کر لیں کہ بازو میں یہ طاقت صرف اُس عشق سے آسکتی ہے، جو یداللّٰہی قسم کا ہو۔

عشق کی دو قسمیں ہیں۔ روباہی اور یداللّٰہی، روباہی ٹائپ کا عشق، عاشق کو بزدل اور مکار بناتا ہے۔ بظاہر اس قسم کے عاشق کے طور طریقے بالکل سچے عاشقوں کے سے ہوتے ہیں۔ لیکن اس میں "جرأتِ رندانہ" نہیں ہوتی۔ اور جب جرأت نہیں تو کچھ بھی نہیں، جو عشق، عاشق کو سرفروشی پر آمادہ نہیں کر سکتا وہ عشق نہیں ہوس ہے۔

---

[1] لکھنؤ اور بریلی کے معرکوں میں انگریزی فوج کی صرف دو پلٹنیں تھیں ۸۲ اور ۹۳ باقی تمام پلٹنیں سکھوں کی تھیں، جن کو انگریزوں نے یہ کہہ کر آمادۂ جنگ کیا تھا کہ اورنگ زیب کے مظالم کا انتقام لینے کا بہترین موقع ہے۔ ۱۲

اس کے برعکس یداللّٰہی قسم کا عشق کو جری بناتا ہے۔ اور ایسا عاشق، خاک اور خون میں تڑپنے کو مقصودِ حیات سمجھتا ہے۔ اللہ کی راہ میں سر کٹاتا تو مسلمان کی معراج ہے۔

سرِ کشتہ، بر نیزہ می زد نفس
کہ معراجِ مرداں ہمیں است و بس[1]

یداللّٰہی، کی ترکیب، یداللہ سے ماخوذ ہے۔ یداللہ کے معنیٰ ہیں "اللہ کا ہاتھ"، یعنی عاشق صادق کا ہاتھ، دراصل اللہ کا ہاتھ ہو جاتا ہے، اسی لیے تو اس میں بے پناہ طاقت آجاتی ہے۔ مثلاً جنگ موتہ میں حضرت خالد جانباز رضہ کے ہاتھ میں پے درپے نو تلواریں ٹوٹ گئی تھیں، لیکن بازو میں کسی قسم کا ضعف پیدا نہیں ہوا تھا۔

الغرض سچا عشق، جرأتِ رندانہ پیدا کر دیتا ہے۔ اسی بات کو اقبال نے یوں بیان کیا ہے :-

میری میں فقیری میں، شاہی میں غلامی میں
کچھ کام نہیں بنتا، بے جرأتِ رندانہ

(۲) عاشق صادق، یا مردِ مومن وہ ہے جو راستہ کی سختیوں کو سامانِ سفر سمجھے یعنی یہ یقین رکھے کہ عشق میں دشواریاں ضرور آئیں گی، اس لیے اُن کو خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کرے۔ لیکن افسوس کہ آج کل مسلمان اس قدر تن آسان اور عیش پسند ہو گئے ہیں کہ اس قسم کے مسافر بالکل ناپید ہو گئے ہیں۔ کیا خوب کہا ہے اکبر الٰہ آبادی نے ؎

خدا کی راہ میں دشواریاں سہتے تھے ہم پہلے
کلب میں بیٹھ کر اب عشق قومی میں تڑپتے ہیں

(۳) اے کالج کے نادان نوجوان! میں جو تجھ کو، صحرا میں خلوت اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہوں، اسے وحشت پر محمول مت کر۔ یاد رکھ کہسار کی خلوت سے انسان اپنی خودی کی مخفی طاقتوں پر وقوف حاصل کرتا ہے۔ اور یہ خلوت، خودی کی تربیت کے سلسلہ میں پہلی اور لازمی منزل ہے۔

چنانچہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت بآسانی واضح ہو سکتی ہے، کہ دنیا کی اصلاح کا، کام شروع کرنے سے پہلے، آپ نے کہسار میں جسے "غارِ حرا" کہتے ہیں، خلوت اختیار فرمائی تھی۔ اور اسی لیے جس قدر نامور بزرگانِ دین گزرے ہیں، سب نے خلوت کو اپنی پاکیزہ زندگی کے پروگرام میں نمایاں جگہ عطا کی تھی۔

الحق، کہسار میں خلوت گزینی، خود آگاہی کے لیے اشد ضروری ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آج کل ہماری قوم، خود آگاہی کی نعمت اور لذت سے یکسر محروم ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہی تو ہے کہ زندگی میں "خلوت" مفقود ہے نوجوانوں کی زندگی سرتاپا (لڑکے ہوں یا لڑکیاں) کالج، بورڈنگ، اسٹیج، اوپن ایئر تھیٹر، محافلِ رقص و سرود، فینسی ڈریس اجتماع، کاک ٹیل پارٹی، ساحلِ بحر، ہوٹل، سینما، ریڈیو، کے جمگھٹوں سے عبارت ہے۔ اور ہر عقلمند آدمی جانتا ہے کہ ان اجتماعات کا نتیجہ خود فراموشی ہے، نہ کہ خود آگاہی۔

لیکن میں اس حقیقت کے اعلان سے باز نہیں رہ سکتا کہ اس خرابی کے ذمہ دار ہمارے نوجوان نہیں ہیں، بلکہ اُن کے والدین ہیں جو اُن کو "تعلیم کے تیزاب" میں ڈال کر، اللہ اور رسول ؐ دونوں سے بیگانہ بنا دیتے ہیں۔

(حاشیہ صفحہ گزشتہ) ۱؎ یہ وہ شعر ہے جو حافظ رحمت خاں شہید کے لوحِ مزار پر ثبت ہے والی روہیلکھنڈ متوفی ۱۷۷۴ء سنہ ۱۲۰۰

(۴) اس شعر میں اقبال نے، اسلامی تصوّف کا بلند ترین نکتہ بیان کیا ہے۔ یعنی مومن کی زندگی کی تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔ وہ مومن، جو خالصۃً اللہ کی خوشنودی کا طالب ہو، یعنی اس کا مقصودِ حیات، استرضاءِ باری تعالیٰ کے علاوہ اور کچھ نہ ہو، واضح ہو کہ تسلیم و رضا مومنانہ زندگی کی معراج ہے، اس سے اُونچا اور کوئی مقام نہیں ہے۔ یہ وہ مقام ہے، جہاں اللہ خود مومن سے راضی ہو جاتا ہے۔ اور جس سے اللہ راضی ہو جائے تو ساری کائنات اس کی غلام ہو جاتی ہے۔ یہ مقامِ رضا، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اتباع سے حاصل ہوتا ہے۔ اور اتباعِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی اسلامی تصوّف ہے۔

واضح ہو کہ عشق کی طرح تصوّف کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک نقلی یا غیر اسلامی تصوّف جو انسان کو عملِ صالح سے بیگانہ بنا دیتا ہے اور آج کل ہماری خانقاہوں میں اسی قسم کا تصوّف رائج ہے دوسرا اصلی یا اسلامی تصوّف، جو انسان کو مجاہد بنا دیتا ہے۔ اور اس اعتبار سے سارے صحابۂ کرام رضؓ تصوّف میں رنگے ہوئے تھے۔

میں پھر کہتا ہوں کہ اسلامی تصوّف، مسلمان کو مجاہد بنا دیتا ہے اسی لیے سارے صحابۂ کرام رضؓ مجاہد بن گئے تھے۔ افسوس کہ یہ تصوّف آج کل تقریباً ناپید ہو چکا ہے۔ اقبال خود کہتے ہیں:۔

ع خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

واضح ہو کہ قرآن مجید کی تعلیمات کی رو سے انسان کا مقصدِ حیات یہ ہے کہ وہ ایسی زندگی بسر کرے کہ اللہ اُس سے راضی ہو جائے اور جب اللہ اپنے بندے سے راضی ہو جاتا ہے، تو وہ اُس پر اس قدر انعامات کی بارش کرتا ہے

کہ بندہ اللہ سے راضی ہو جاتا ہے۔ اور جب دونوں ایک دوسرے سے راضی ہو جاتے ہیں، تو اسلامی تصوّف کی اصطلاح میں اُسے مقامِ رضا یا مرتبۂ اتحاد کہتے ہیں۔ یہ اتحاد غیر اسلامی نہیں، یعنی اس اتحاد سے یہ مراد نہیں (جیسا کہ غیر اسلامی تصوّف میں ہے) کہ اللہ اور بندہ دونوں متحد الوجود ہو جاتے ہیں یا بندہ اپنی انفرادیت، اللہ کی ذات میں غرق کر دیتا ہے۔ یا قطرہ سمندر میں مل کر اپنی ہستی کھو دیتا ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ دونوں اپنی اپنی جگہ قائم رہتے ہیں۔ بندہ، بندہ ہی رہتا ہے، خواہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرے، اور اللہ، اللہ ہی رہتا ہے، خواہ کتنا ہی تنزل کیوں نہ کرے؟ یعنی نہ ان کی ماہیت بدل سکتی ہے نہ دونوں متحد الوجود ہو سکتے ہیں۔ اللہ خالق ہے، بندہ مخلوق ہے۔ یہ امتیاز بہر حال باقی رہتا ہے۔ اتحاد تو ہے، مگر جسمانی نہیں۔ وصال تو ہے مگر مادی نہیں۔

اب پاک کلام سے ایک آیت نقل کرتا ہوں:۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَ
الْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰہَ
وَرَسُوْلَہٗ وَلَوْ کَانُوْٓا اٰبَآءَ ھُمْ
اَوْ اَبْنَآءَ ھُمْ اَوْ اِخْوَانَھُمْ
اَوْ عَشِیْرَتَھُمْ اُولٰٓئِکَ کَتَبَ فِیْ
قُلُوْبِھِمُ الْاِیْمَانَ وَاَیَّدَھُمْ
بِرُوْحٍ مِّنْہُ ط وَیُدْخِلُھُمْ جَنّٰتٍ
تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ
خٰلِدِیْنَ فِیْھَا ط رَضِیَ
اللّٰہُ عَنْھُمْ وَ

تو نہ پائے گا کسی قوم کو جو یقین رکھتے ہوں اللہ پر، اور آخرت پر، کہ دوستی کریں، ایسوں سے جو مخالف ہوئے اللہ کے اور اس کے رسولؐ کے، خواہ وہ اُن کے باپ یا بیٹے یا بھائی یا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں، یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان لکھ دیا، یعنی پتھر پہ لکیر کی طرح نقش کر دیا۔ (مٹائے نہیں مٹ سکتا) اور اُن کی مدد کی اپنے روحانی فیض سے اور بعد وفات، اللہ اُن کو ایسے باغوں میں داخل کریگا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ یہ لوگ ہمیشہ ان باغوں میں

رَضُوْا عَنْہُ ط
(۵۸ - ۲۲)

رہیں گے (اور سب سے بڑی نعمت یہ کہ) اللہ اُن سے راضی، اور وہ اللہ سے راضی۔

میں اگر اس آیت کی تفسیر لکھنے کی کوشش کروں تو شاید ایک رسالہ مرتب ہو جائے۔ اس لیے اس جگہ صرف چند اشارات پر اکتفا کروں گا۔

(ا) مومن، اپنے محبوب حقیقی (اللہ) کو خوش کرنے کے لیے ساری دنیا سے دشمنی مول لے لیتا ہے، بلکہ بوقتِ ضرورت جب کفر، اسلام کے مقابلہ میں آ جائے، اپنے باپ، بیٹے، بھائی، سب کو اللہ کے لیے قربان کر سکتا ہے چنانچہ جنگِ اُحد میں حضرت صدیق اکبرؓ اپنے حقیقی فرزند عبدالرحمٰن کے مقابلہ میں میدان میں آئے اور اگر وہ اُن کے تیر کی زد میں آ جاتے تو صدیق اکبرؓ فرماتے ہیں کہ میں کبھی زندہ نہ چھوڑتا۔ حضرت مصعب بن عمیرؓ نے اپنے حقیقی بھائی عبید بن عمیرؓ کو، حضرت فاروق اعظمؓ نے اپنے ماموں عاص بن ہشام کو، حضرت علیؓ نے عتبہ کو، حضرت سید الشہدا امیر حمزہؓ نے شیبہ کو، اور حضرت ابو عبیدہؓ نے ولید کو قتل کیا۔

اس آیت سے یہ بھی ثابت ہو گیا کہ اسلام میں قومیت کی بنیاد، مذہب پر ہے وطن یا نسل یا زبان یا رنگ پر نہیں ہے۔ لہٰذا جو لوگ ہندو اور مسلمانوں کو ایک قوم قرار دیتے ہیں، وہ غلطی پر ہیں کافر اور مسلم کبھی ہرگز ایک قوم نہیں بن سکتے۔

(ب) چونکہ مومن، اللہ کے لیے ساری دُنیا سے جنگ مول لے لیتا ہے اور سب سے ناراض ہو جاتا ہے، اس لیے اللہ اس کا یہ صلہ دیتا ہے کہ مومن سے راضی ہو جاتا ہے اور جب اللہ کسی سے راضی ہو جائے تو اس بندہ کی خوش نصیبی کا کیا ٹھکانا ہے۔ اکبر الٰہ آبادی نے کیا خوب کہا ہے:۔

تعلیم مذہبی کا خلاصہ یہی تو ہے
سب مل گیا اُسے، جسے اللہ مل گیا

(ج) جب یہ ثابت ہو گیا کہ، اصلی چیز رضاء الٰہی ہے تو اقبال کا یہ مصرع بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے۔ کہ

"دُنیا ہے روایاتی عقبیٰ ہے مناجاتی"

یعنی اگر دُنیا مقصود ہے، تو دنیا والوں کی تقلید کرو، اور اُن کے طریقوں کو اختیار کرو، اگر عقبیٰ مطلوب ہے تو نمازوں کے بعد جنت کی دعائیں مانگو۔

لیکن عقلمند وہ ہے جو دنیا اور عقبیٰ دونوں کے خالق اور مالک کو کسی طرح راضی کرے، یا اپنا بنالے تو ساری کائنات خود بخود قبضہ میں آجائے گی۔ اور اُسے راضی کرنے کی صورت یہ ہے کہ پہلے اُس کی قضا سے راضی ہو جائے۔ (جسے اصطلاح میں شیوۂ تسلیم و رضا کہتے ہیں) پھر وہ راضی ہو جائے گا۔

اس لیے اقبالؔ کہتے ہیں کہ اگر کائنات پر حکومت کرنا چاہتے ہو تو دنیا اور عقبیٰ دونوں سے بلند تر ہو جاؤ۔ اصلی بادشاہت یہ ہے کہ ان دونوں سے بے نیاز ہو کر اللہ کو مقصودِ حیات بنالو۔

———— (۱۵) ————

اس نظم میں اقبال نے فقر کا فلسفہ بڑے دلکش انداز سے بیان کیا ہے، اور آخر میں مسلمان کو اعتماد علی النفس کا پیغام دیا ہے جو ان کا محبوب موضوع ہے کہتے ہیں کہ

(۱) اے مسلمان! تو یہ سمجھتا ہے کہ فقیری کا علم بہت مشکل ہے لیکن تو اس غلط فہمی میں اس لیے مبتلا ہو گیا ہے کہ تو نے کبھی اپنی فطرت کے اقتضاء پر غور نہیں کیا۔ اگر تو غور و فکر سے کام لے تو تجھے معلوم ہو سکتا ہے کہ خود تیرا

ضمیر، اس کی حقیقت پر گواہی دے رہا ہے۔ یعنی فقر کی حقیقت کا سمجھنا کچھ مشکل نہیں ہے۔

اس قول کی تشریح یہ ہے کہ فقیری یا فقر کی اصل و بنیاد محبت ہے۔ اور محبت وہ جذبہ ہے، جو ہر آدمی کی فطرت میں داخل ہے۔ اگر تو دولتِ فقر سے بہرہ ور ہونا چاہتا ہے، تو اس کی صورت بہت آسان ہے۔ تو کسی مرشد کی صحبت اختیار کرلے، وہ تیری محبت کو صحیح راستہ پر ڈال دے گا، یعنی محبوبِ حقیقی سے تیرا رابطہ استوار کر دے گا۔

اگر آپ اپنے کمرہ کے بلب (BULB) کو منور کرنا چاہتے تو کسی مستری کی خدمات حاصل کرلیتے ہیں۔ وہ آپ کے بلب کو بجلی کے تاروں سے مربوط (CONNECT) کر دیتا ہے فوراً بلب منور ہو جاتا ہے۔ اسی طرح مرشد، قلب انسانی کو، جو محبت کا مرکز ہے اللہ سے مربوط کر دیتا ہے۔ اور قلب مذکور منور ہو جاتا ہے۔

اگر "علم فقیری" کا مفہوم، وصول الی اللہ، قرار دیا جائے، تو اس شعر کا مطلب یہ ہوگا کہ شانِ فقر پیدا کرنا کچھ مشکل نہیں ہے اس کی تشریح یہ ہے کہ اللہ فرماتا ہے۔ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا۔ اللہ کسی نفس (آدمی) کو، اسکی استطاعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا، یعنی ایسی ذمہ داری اُس پر عائد نہیں کرتا جس سے عہدہ برآ ہونا، اس کے لیے ممکن نہ ہو۔

اس اصل کو ذہن نشین کرنے کے بعد یہ بات واضح ہو گئی کہ جس طرح فقر کی حقیقت کا سمجھنا، کچھ مشکل نہیں ہے، اُسی طرح خود اپنے اندر شانِ فقر پیدا کرنا بھی مشکل نہیں ہے۔ کیونکہ اللہ کسی ایسے کام کا حکم نہیں دیتا، جس کا کرنا طاقتِ بشری سے باہر ہو۔

لوگوں نے غلطی سے یہ سمجھ رکھا ہے کہ فقیری یعنی شانِ فقر پیدا کرنا جسے تصوف کی اصطلاح میں "وصول الی اللہ" کہتے ہیں، بہت مشکل ہے۔ حالانکہ یہ بات مشکل نہیں ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ محبت کی دو قسمیں ہیں: ایک محبتِ نفسانی جو غیر اختیاری ہے اور شریعت میں نہ اس کی کوئی قدر و قیمت ہے، نہ اس سے بحث کی جاتی ہے کیونکہ شریعت اُمورِ غیر اختیاری سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی اس کی مثال یہ ہے کہ فرض کیجئے زید کے چار بیٹے ہیں، وہ سب سے چھوٹے بیٹے سے سب سے زیادہ محبت کرتا ہے تو یہ حُبِّ نفسانی ہے شریعت میں اس کا کوئی اعتبار نہیں، اور نہ اس پر کوئی ثواب مرتّب ہوتا ہے اور نہ اس کے ترک پر کوئی مواخذہ ہوگا۔[1]

دوسری محبت، حُبِ عقلی یا حُبِ ایمانی ہے۔ اور یہ اختیاری ہے۔ صفتِ "عقلی" کی قید ہی اس کے اختیاری ہونے پر شہادت دے رہی ہے اسکی بنیاد اس آیت پر ہے۔ "وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ" یعنی مومنوں کی شناخت یہ ہے کہ اُنہیں اللہ سے اشد درجہ کی محبت ہوتی ہے، جس کے سامنے کسی قسم کی محبت کی کوئی حقیقت باقی نہیں رہتی۔

چونکہ یہ وہ محبت ہے جو مومن کو اللہ کے ساتھ ہوتی ہے اسلئے تصوّف کی اصطلاح میں اُسے حُبِّ ایمانی کہتے ہیں۔ یعنی وہ محبت جو ایمان کی بدولت پیدا ہوتی ہے۔ اور چونکہ یہ محبت سب محبوبوں کی خوبیاں پرکھنے اور جانچنے کے بعد اختیار کی جاتی ہے۔ اس لیے اسے حُبِّ عقلی بھی کہتے ہیں۔ اور چونکہ یہ

[1] غالب نے اس شعر میں اسی حُبِّ نفسانی غیر اختیاری کا نقشہ کھینچا ہے :-

عشق پر زور نہیں ہے، یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے، اور بُجھائے نہ بنے!

محبت، غور و فکر کے بعد اختیار کی جاتی ہے، اس لیے اختیاری ہے۔ مومن، پہلے اپنی عقل سے کام لیتا ہے۔ اور اس فیصلہ پر پہنچتا ہے کہ میری محبت کا مرجع، ذاتِ خداوندی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ دنیاوی محبوب تو سب فانی ہیں، اور فانی سے دل لگانا حماقت ہے۔

اس حُبِّ ایمانی میں کامیابی کا راستہ، اللہ نے خود بتا دیا ہے کہ میرے رسولؐ برحق تاجدار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرو۔

الغرض وہ محبت جو نفسانی یعنی غیر اختیاری ہے مطلوب نہیں، اور جو محبت مطلوب ہے، وہ اختیاری ہے۔ اور اس کے حصول کی ترکیب بھی اختیاری ہے اور جو ترکیب اختیاری ہوتی ہے، وہ مشکل نہیں ہو سکتی۔ مشکل تو وہ ہے جو اختیاری نہ ہو۔ مثلاً زید سے کہا جائے کہ ہندہ سے محبت کرو، تو یہ محبت مشکل ہے۔ کیونکہ ہندہ سے محبت زید کے اختیار میں نہیں ہے۔ مثل مشہور ہے، کوئی شخص کسی سے زبردستی محبت نہیں کر سکتا۔

اب اس اختیاری محبت کی ترکیب کے تین اجزاء ہیں، اور تینوں اجزاء بھی اختیاری ہیں :-

(۱) اعمال صالحہ اس نیت سے کہ محبت استوار ہو جائے۔

(۲) ذکر، یا یادِ محبوب، ہر حال میں، اور ہر وقت اور ہر جگہ[1]

(۳) ان لوگوں سے تعلق پیدا کرنا، جو اللہ سے محبت پیدا کرتے ہیں۔

پہلی بات کا مطلب ہے، اللہ کے محبوب حضور سرکارِ دو عالم صلے اللہ

[1] عارف جامیؒ نے اس حقیقت کو یوں بیان کیا ہے :-

سررشتۂ دولت اے برادر بکف آر ٭ ویں عمر گرامی بخسارت مگذار
دائم، ہمہ جا، با ہمہ کس، در ہمہ کار ٭ میدار نہفتہ چشم دل جانب یار

علیہ وسلم کی کامل اتباع، بلا چون وچرا۔

دوسری بات کا مطلب ہے دنیا میں رہ کر سارے دنیاوی اُمور انجام دینا لیکن اس طرح کہ دھیان ہر حال میں اُسی کا رہے غیر کی محبت پیدا نہ ہونے پائے۔

تیسری بات کا مطلب ہے، کسی مرشد کی صحبت میں بیٹھنا، جو اس محبت کو پختہ کر دے۔ یعنی ایسا پختہ رنگ چڑھا دے کہ کبھی اُتر نہ سکے۔

(۲) دوسرے شعر میں اقبال، حقیقتِ فقر کو ایک مثال سے واضح کرتے ہیں کہتے ہیں، اگر فولاد کی طبیعت میں نرمی اور نزاکت پیدا ہو جائے تو پھر اُس سے شمشیر نہیں بن سکتی، یعنی وہ بیکار ہو جائے گا۔ فولاد کو واضح نے اس لیے وضع کیا ہے کہ اُس سے تلوار بنائی جائے۔ لیکن اگر وہ اپنے اندر صلابت کی جگہ نزاکت پیدا کرے تو پھر اُس کی تخلیق کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا، اسی طرح اللہ نے بنی آدم کو اس لیے پیدا کیا ہے۔ کہ وہ اپنی خودی کو (اتباع نبوی ؐ سے) مضبوط اور مستحکم کریں: تاکہ خلافت (شمشیر) کے مرتبہ پر پہنچ سکیں لیکن اگر کوئی شخص، ترکِ اتباعِ رسول ؐ سے اپنی خودی کو ضعیف اور ناتواں کرے تو پھر وہ خلافت کے منصب پہ فائز نہیں ہو سکتا بالفاظِ دگر اُس نے اپنی تخلیق کے مقصد ہی کو نہیں سمجھا۔ لہٰذا وہ مرتبۂ انسانیت سے گر جائے گا۔ اور اُولٰئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلّ [1] کا مصداق ہو جائے گا۔ غرض اگر مسلمان اپنے اندر شانِ فقر پیدا نہ کرے تو وہ اپنی تخلیق کے منشار کو کبھی ہرگز پورا نہ کر سکے گا، یہ ہے علم فقیری کی حقیقت!

(۳) اگر فقر میں خودداری، یعنی دین کے لیے غیرت نہ ہو تو وہ، فقر نہیں ہے بلکہ

[1] ایسے لوگ حیوانات کی طرح ہیں، بلکہ اُن سے بھی گمراہ تر۔ ۱۲

قہرِ الٰہی ہے۔ لیکن اگر اس میں یہ جوہر موجود ہو تو بلاشبہ وہ فقر، دنیا میں مومن کے لیے سربلندی اور امیری کی بنیاد بن جاتا ہے۔

اقبال نے یہ صراحت اس لیے کی کہ مسلمانوں میں فقر کا ایک غلط مفہوم بھی تو مروج ہے۔ یعنی اکثر مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ فقر ترکِ دنیا اور مسکینی یا عاجزی اور مفلسی کا نام ہے۔ یہ غلط خیال ہندو جوگیوں کے اثر سے پیدا ہوا ہے۔ اسلام جس فقر کا داعی ہے وہ خانقاہی نہیں، بلکہ یداللّٰہی ہے۔ اس نکتہ کی وضاحت کے لیے اس جگہ صرف ایک شعر لکھتا ہوں:۔

فقرِ کافر، خلوتِ دشت و دراست
فقرِ مومن، لرزۂ بحر و براست

اقبال نے مثنوی "پس چہ باید کرد" میں اس مبحث پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ انشاءاللہ جب اس کتاب کی شرح لکھوں گا، تو اس موضوع پر سیر حاصل بحث کروں گا، اس جگہ صرف اسی قدر وضاحت کافی ہے۔

(۴) آخری شعر میں اقبال نے ایک عظیم الشان حقیقت کا اظہار کیا ہے کہتے ہیں کہ اے مسلمان! یہ جو تو مسکینی اور ذلت کی زندگی بسر کر رہا ہے، یعنی غلامی کی زندگی، اس کا باعث صرف یہ ہے کہ تجھے انگریزوں نے اُس عداوت کی بنا پر جو اُنہیں اسلام سے ہے تیرے مقام سے بیگانہ کر دیا ہے۔ اور تجھے تیری خودی کی مخفی طاقتوں سے غافل بنا دیا ہے۔ اُنہوں نے تیرے لیے ایسا نصابِ تعلیم مدوّن کیا کہ تو اپنی حقیقت سے بالکل بےخبر ہو گیا۔ میں انگریزوں کے قائم کردہ اس طلسم کو توڑنا چاہتا ہوں۔ [1]

[1] اپنی وفات سے چند ماہ پیشتر علامہ مرحوم نے اپنی ایک رباعی میں، خود اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ میری شاعری کا مقصد صرف یہ ہے کہ میں (باقی بر صفحہ ۴۶۸)

سُن! تواس لیے نہیں پیدا کیا گیا کہ انگریزوں کی یا کسی قوم کی غلامی کرے اے مسلمان! تو "برطانیہ کا یار وفادار[1]" نہیں ہے بلکہ تو "بشیر اور نذیر" ہے۔ یعنی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ساری دنیا کے لیے بشیر اور نذیر ہیں، اور تو حضور کا غلام ہے اس لیے اگر تو حضور کی اتباع کر کے اپنے آپ کو حضور کے رنگ میں رنگین کرے، تو قدرتی طور سے تیرے اندر بھی بشیری اور نذیری کی شان پیدا ہو جائے گی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آج، جو تیرے آقا ہیں، وہ تیرے غلام بن جائیں گے۔

بشیر کے معنیٰ ہیں، مومنوں کو خوشخبری سُنانے والا۔

نذیر کے معنیٰ ہیں، کافروں کو عذاب سے ڈرانے والا

یہ ہمارے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی دو خاص صفات ہیں اور چونکہ ان صفات کے اظہار کے لیے طاقت کا ہونا لازمی ہے اس لیے مسلمان پر فرض ہے کہ وہ طاقت پیدا کرے، تاکہ بشیر اور نذیر کا فرض انجام دے سکے بالفاظ دگر لوگوں کو نیکی کا حکم دے سکے اور برائی سے روک سکے اس اصول کی تفہیم کے لیے اس آیت پر غور کیجیے۔

کُنتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ط — اے مسلمانو! تم تمام اقوامِ عالم کے سردار ہو، تم کو بنی آدم کی اصلاح کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور تمہارا فرض منصبی یہ ہے کہ تم لوگوں کو نیکی کا حکم کروگے، اور برائی سے باز رکھو گے۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) انگریزوں کے طلسم کو باطل کر دوں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

طلسمِ عصرِ حاضر را شکستم — ربودم دانہ و دامش گسستم
خداوند کہ مانندِ براہیمؑ — بنارِ او، چہ بے پروا نشستم
(زبورِ عجم)

[1] اس جملہ سے میری مراد وہ یار وفادار ہے جو آج کل "راج پر تکھہ" کے عہدہ جلیلہ پر فائز ہے ۱۲

اب ناظرین اس آیت کی روشنی میں اقبال کی تعلیم کی صداقت بھی معلوم کر سکتے ب، اور یہ بھی کہ کیا ہم پاکستانی مسلمان اس آیت کے مصداق ہو سکتے ہیں؟ فافهم تدبر!

—————— (۱۶) ——————

اس غزل میں اقبال نے، فقر کے بعض گوشوں کو بے نقاب کیا ہے۔ پہلا شعر قوم کی خاص توجہ کے لائق ہے فرماتے ہیں کہ

(۱) جو قوم مرکز سے جدا ہو جاتی ہے، وہ بحیثیتِ قوم یقیناً فنا ہو جاتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کے افراد، دیگر حیوانات عالم، بقر، فرس، حمار کی طرح، علم الحیوٰۃ کے زاویۂ نگاہ BIOLOGICAL POINT OF VIEW سے زندوں میں شمار کیے جا سکیں۔

مرکز سے وابستگی، قوم کے حق میں ایسی ہے، جیسے اوراق کتاب کے لیے شیرازہ۔ شیرازہ ٹوٹ جائے تو اوراق منتشر ہو جاتے ہیں اور چند روز کے بعد کتاب، معدوم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح افرادِ قوم مرکز سے جدا ہو جائیں تو بلا مبالغہ منتشر ہو جاتے ہیں، اور دنیا میں اُن کی کوئی وقعت یا قدر و قیمت باقی نہیں رہتی وہ بآسانی دوسری قوموں کے غلام بن جاتے ہیں۔

اور اگر اس قوم کے ہر فرد کی خودی، کسی مرکزِ معین سے خواہ وہ محسوس ہو یا غیر محسوس، وابستہ ہو جائے، بالفاظ دگر، اس قوم کی زندگی میں اجتماعی خودی کا رنگ پیدا ہو جائے، اور وہ اجتماعی خودی کسی مرکز سے مربوط ہو جائے (اجتماعی خودی سے میری مراد یہ ہے کہ پوری قوم میں وحدت افکار و کردار پیدا ہو جائے) تو اس خودی میں، خدائی صفات کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ یعنی وہ قوم دنیا میں حکمراں، فرمانروا، سربلند اور معزز ہو جاتی ہے۔

واضح ہو کہ خودی (EGO) کی تین قسمیں ہیں۔

(ا) انفرادی خودی (INDIVIDUAL EGO) مثلاً زید کی خودی یا ہندہ کی خودی۔

(ب) اجتماعی خودی (COLLECTIVE EGO) کسی قوم کے افراد کا تصورات و افکار کے اعتبار سے ایسا ہم آہنگ ہو جانا کہ سب افراد ایک ہو جائیں، ہر فرد کا مقصد وہی ہو، جو دوسروں کا ہے۔ یعنی پوری قوم کی صرف ایک ہی خودی نظر آنے لگے[1] مثلاً روس کی خودی۔

نوٹ:۔ آج تمام دنیا کے اشتراکیوں کی خودی خواہ وہ روس میں رہتے ہوں یا پاکستان میں، ایک ہو گئی ہے۔ یعنی ان کے اندر اجتماعی خودی پیدا ہو گئی ہے۔

(ج) کائناتی خودی (UNIVERSAL EGO) یعنی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات، جس کے بغیر اس کائنات کی یا اس کی کسی شے کی کوئی قدر و قیمت ہی معین نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ حضورؐ کی خودی کائنات اور ما فیہا کی قدر و قیمت کا معیار ہے۔

اسی حقیقت کو اقبال نے اپنے رنگ میں یوں بیان کیا ہے:۔

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو — آنکہ از خاکش بروید آرزو!
یا ز نورِ مصطفےٰ او را بہا است — یا ہنوز اندر تلاش مصطفےٰ است

(جاوید نامہ)

قرآن مجید نے اسی اجتماعی خودی کی اہمیت کو اس آیت سے واضح فرمایا ہے

[1] چیست ملت! اے کہ گوئی لا الٰہ
با ہزاراں چشم، بودن یک نگہ!

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا | اے مسلمانو! تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ تھام لو، اور آپس میں تفریق پیدا مت کرو (کیونکہ تفریق، توحید کی ضد ہے) یعنی پھوٹ مت ڈالو۔

(آل عمران آیت ۱۰۳)

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب مرحوم نے اس کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے کہ "تم سب مل کر قرآن کو مضبوط تھامے رہو، جو خدا کی مضبوط رسی ہے یہ رسی ٹوٹ تو نہیں سکتی، ہاں چھوٹ سکتی ہے۔ اگر تم سب مل کر اس کو پوری قوت سے پکڑے رہو گے، تو کوئی شیطان (مثلاً انگریز) اپنی شر انگیزی میں کامیاب نہ ہو سکے گا۔ اور انفرادی زندگی کی طرح، مسلم قوم کی اجتماعی زندگی یا قوت بھی غیر متزلزل اور ناقابل اختلال ہو جائے گی۔ قرآن کریم سے تمسک کرنا ہی وہ چیز ہے، جس سے بکھری ہوئی قوتیں جمع ہوتی ہیں، اور ایک مردہ قوم حیاتِ تازہ حاصل کرتی ہے۔ لیکن تمسک بالقرآن کا مطلب یہ نہیں کہ قرآن حکیم کو اپنی آراء کا تختۂ مشق بنا لیا جائے۔ بلکہ قرآن کریم کا وہی مطلب بہتر ہو گا جو احادیثِ صحیحہ اور سلف صالحین کی متفقہ تصریحات کے خلاف نہ ہو"

نوٹ:۔ آج ہندوستان پاکستان، بلکہ سارے عالم میں مسلمانوں کی ذلت و رسوائی، غلامی اور محکومی کا باعث یہی فقدانِ مرکز تو ہے۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ جس قوم کو اللہ نے ایک چھوڑ تین مرکز عطا فرمائے ہوں، وہ قوم آج دنیا میں سب سے زیادہ ذلیل و خوار ہے سب سے زیادہ جاہل ہے۔ اور سب سے زیادہ بدکاریوں میں مبتلا ہے۔

(۱) مسلمانوں کا پہلا مرکز مادی اور محسوس ہے، جس کا نام خانہ کعبہ ہے اس میں یہ نکتہ ہے کہ قوم میں ہر شخص ذہنی اعتبار سے بلند نہیں ہوتا۔ اس لیے

اللہ نے عامۃ الناس کی رعایت ملحوظ فرما کر ایک مرکز ایسا عطا کیا جو آنکھوں سے بھی نظر آسکتا ہے اور اُسے چھو بھی سکتے ہیں۔

(ب) دوسرا مرکز غیر مادی ہے مگر محسوس ہے جس کا نام قرآن حکیم ہے یہ کلام پاک اس لحاظ سے کہ اللہ کا کلام ہے غیر مادی ہے لیکن اس لحاظ سے کہ کاغذ پر مرقوم ہے محسوس ہے تاکہ عامی اور عالم دونوں اس مرکز سے وابستہ ہوسکیں۔

(ج) تیسرا مرکز وہ ہے۔ غیر مادّی ہے اور غیر محسوس ہے اور چونکہ مسلمان کی زندگی اس پر موقوف ہے اس لیے وہ اُس سے جُدا نہیں ہے بلکہ اُس کے دل میں موجود ہے۔ کما قال اقبال :-

در دل مسلم مقامِ مصطفیٰؐ است
آبروئے ما ز نامِ مصطفیٰؐ است

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا

اگر اس مرکزِ اصلی سے وابستگی نہ ہو تو نہ تلاوتِ قرآن حکیم سے کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے نہ طواف کعبہ سے۔ اسی لیے تو اقبال نے یہ کہا تھا :-

مصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

(ارمغانِ حجاز)

یہ بے مرکزی ہی کا تو نتیجہ ہے کہ ہم اگرچہ تعداد میں چالیس کروڑ سے زیادہ ہیں، لیکن "اینگلو امریکن بلاک" کے گھوڑے کی دُم سے بندھے ہوئے ہیں

(۲) اگر کوئی شخص فقر کا مدعی ہو، اور اُس کے باوجود دنیا کی مصیبتوں کو خندہ پیشانی سے برداشت نہ کرسکے تو یقین جانو کہ وہ شخص اپنے دعویٰ میں کاذب ہے یعنی اُس کے اندر شانِ فقر پیدا نہیں ہوئی ہے۔

اقبال نے گدائی کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ بظاہر صاحب فقر، اور گدا دونوں یکساں ہوتے ہیں یعنی صاحبِ فقر بھی فقیر ہوتا ہے اور گدا بھی فقیر ہوتا ہے دونوں کے پاس دولت ثروت، اور ظاہری شان وشوکت نہیں ہوتی۔ مثلاً گداء (یعنی عرفِ عام میں فقیر) کے کرتے میں بھی پیوند لگے ہوتے ہیں اور فاروقِ اعظمؓ کے کرتے میں بھی پیوند لگے ہوتے ہیں۔ لیکن فرق یہ ہے کہ گدا دولت کا متمنی ہوتا ہے، اور دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے۔ مگر صاحبِ فقر (یعنی اصطلاحی فقیر) دولت کو پائے استغنار سے ٹھکرا دیتا ہے وہ اس کے سامنے دست بستہ حاضر ہوتی ہے لیکن وہ اس کی طرف نگاہ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا خلاصۂ کلام یہ ہے کہ گدا محتاج ہوتا ہے، صاحبِ فقر محتاج نہیں ہوتا۔ پس جو فقیر تلخیٔ دوراں کی شکایت کرے، وہ صاحبِ فقر نہیں ہے۔ بلکہ گدا ہے۔

(۳) اے مخاطب یہ مت سمجھ کہ اب، اللہ کے قانون میں کوئی تبدیلی پیدا ہوگئی ہے۔ یا اَب فقر کے معجزات ختم ہوگئے ہیں۔ اس دَور میں بھی، اگر کوئی شخص سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اتباع کرے تو اس میں یہ طاقت پیدا ہوسکتی ہے کہ وہ پربت کو رائی بنا سکتا ہے۔ یعنی اپنے زمانہ کے فرعونوں کو زیر کرسکتا ہے۔

(۴) حقیقت یہ ہے کہ حق و باطل کے معرکہ میں جب تک مردِ مومن اپنے سوزِ دروں سے مجاہدوں کے قلوب کو نہ گرمائے، اُس وقت تک اس معرکہ میں وہ ذوق وشوق پیدا نہیں ہوسکتا جو مجاہدوں کو کامیابی سے ہمکنار کرسکتا ہے۔ اس لیے محراب گل اللہ سے دعا کرتا ہے کہ وہ اِس زمانہ میں بھی مسلمانوں کی سربلندی کے لیے کسی مومن کو پیدا کردے۔

نوٹ :- "ذوقے" میں یائے تخصیصی ہے، یعنی ایک خاص، قسم کا ذوق۔

"ی" کی کئی قسمیں ہیں۔ مثلاً یائے تنکیری، یائے توصیفی، یائے نسبتی وغیرہ۔

(۵) اس شعر میں محراب گل، عالمِ تصور میں، اُسی مردِ مومن سے جس کے ظہور کی اُس نے گذشتہ شعر میں تمنا کی ہے۔ خطاب کرتا ہے کہ اے بندۂ مومن کسی مشرقی ملک سے ظہور کر! اور میرے کوہستانی علاقہ کو سُرخ رنگ کا لباس پہنا دے! یعنی معرکۂ کارزار گرم کرے!

نوٹ :۔ سُرخ رنگ سے آفتاب کی روشنی بھی مراد ہو سکتی ہے۔ اور خونِ شہیداں بھی مراد ہو سکتا ہے۔

———— (۱۷) ————

اس نظم میں محراب گل نے "فقیر" کی صفات بیان کی ہیں۔

(۱) لاکھوں انسانوں میں اگر ایک شخص بھی صاحبِ یقین، یعنی صاحبِ فقر ہو تو وہ تن تنہا اس پوری جماعت میں جہاد کا ولولہ پیدا کر دیتا ہے۔ جوان اور بوڑھے سب اللہ کی راہ میں سر کٹانے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

(۲) لیکن اس خوبی کا انسان کہیں صدیوں میں جا کر پیدا ہوتا ہے جو اپنی صحبت سے خزف یا ٹھیکری (دنیا پرست) کو نگیں (خدا پرست) بنا دے۔

(۳) اے مخاطب! تو یہ سمجھتا ہے کہ خدا نے تیری تقدیر، اپنے قلم سے تیری پیشانی میں لکھدی ہے، لیکن اگر تو اپنے اندر شانِ فقر پیدا کرے تو، یہ ممکن ہے کہ تو اپنی سر نوشت خود اپنے قلم سے لکھ سکے۔ یعنی اللہ نے تجھے مجبور محض بنا کر دنیا میں نہیں بھیجا ہے۔ بلکہ تجھے ترقی کرنے اور کامیابی حاصل کرنے کی صلاحیت عطا فرمائی ہے۔ اگر تو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرے تو، کامیابی تیرے قدم چوم سکتی ہے۔

نوٹ :۔ راقم الحروف کی والدہ صاحبہ مرحومہ (اللہ اُنہیں جنت عطا فرمائے) کلامِ اقبال کا مطالعہ بڑے ذوق و شوق کے ساتھ فرمایا کرتی تھیں اقبال کی کوئی نہ کوئی کتاب ہمیشہ اُن کے سرہانے رکھی رہا کرتی تھی۔ اکثر اس خام کار اور کم سواد سے فرمایا کرتی تھیں کہ "مجھے ڈاکٹر صاحب کے کلام میں سب سے بڑی خوبی یہی نظر آتی ہے کہ وہ مسلمانوں کو عمل کی تلقین کرتے ہیں، انسان کی تقدیر اس کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ تقدیر کا بہانہ صرف وہ لوگ کرتے ہیں جو درحقیقت عمل سے نفور ہیں۔ انسان اگر کوشش کرے تو کامیابی یقینی ہے۔ اللہ کسی محنتی کی محنت رائیگاں نہیں کرتا۔"

(۴) آسمان تک پہنچنا بظاہر ناممکن نظر آتا ہے، لیکن اگر انسان ہمت سے کام لے تو آسمان تک پہنچ سکتا ہے، یعنی ناممکن کو ممکن بنا سکتا ہے۔

اس شعر کا لفظی مطلب مراد نہیں ہے۔ بلکہ اقبال کا مقصد اس سے یہ ہے کہ "ہمت" کی قدر و قیمت مسلمانوں کے ذہن نشین ہو جائے۔ واضح ہو کہ ہمت اتنی بڑی چیز ہے کہ تصوف میں سالک کی روحانی ترقی کا سارا دارومدار اسی ہمت پر ہے۔ اور شیخ کی صحبت میں رہنے سے یہی تو فائدہ حاصل ہوتا ہے کہ مرید میں ہمت سے کام لینے کی صلاحیت بیدار ہو جاتی ہے۔ شیخ کی توجہ اسی نکتہ پر مرکوز ہوتی ہے کہ سالک اپنی ہمت سے کام لے کر روحانی مدارج طے کر سکے۔

(۵) جبتک آدمی، ہمت سے کام نہیں لیتا۔ مقامِ فقر اُسے بہت اُونچا نظر آتا ہے۔ یعنی وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس مقام کا حصول بہت دشوار ہے لیکن جب وہ ہمت سے کام لیتا ہے تو وصول الی اللہ آسان ہو جاتا ہے۔

یہ نکتہ اس آیت سے ماخوذ ہے :۔

اور جو لوگ ہم تک پہنچنے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں (اور جدوجہد ہمت کے بغیر ممکن نہیں) تو البتہ ضرور ضرور ہم اُن کو اپنے پاس پہنچنے کی راہیں دکھاتے ہیں۔	وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا (سورۂ عنکبوت آیت ۶۹)

یعنی جو لوگ مجاہدات میں سرگرم رہتے ہیں، اللہ اُن کو ایک خاص نورِ بصیرت عطا فرماتا ہے۔ اور اپنے قُرب کی راہیں سمجھاتا ہے۔

(۱۸)

اس نظم میں محراب گل نے، قبائلی امتیاز کی بُرائیاں بیان کی ہیں۔ واضح ہو کہ اسلام نے ہر قسم کے باطل امتیازات (قومی، وطنی، نسلی، لسانی، لونی اور قبائلی) کو مٹا کر صرف ایک امتیاز قائم کیا ہے۔ یعنی اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ اے مسلمانو! بزرگی یا فضیلت کا صرف ایک معیار ہے، اور وہ نہ قومی ہے، نہ نسلی، نہ لسانی، نہ قبائلی، بلکہ وہ یہ ہے کہ اللہ کی بارگاہ میں سب سے زیادہ مکرم اور معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔

محراب گل نے، شیر شاہ سوری کا نام اس لیے لیا کہ اس دیندار، درویش صفت علم دوست، اور سچے مسلمان نے جس کے کارناموں سے آجکل کے تعلیم یافتہ مسلمان بہت کم واقف ہیں ہمیشہ مسلمانوں کو وحدتِ ملی کا درس دیا مجھے افسوس ہے کہ میں اس کتاب میں اس عادل بادشاہ کے کارناموں کو مفصل طور پر بیان نہیں کر سکتا۔ صرف اس قدر لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ اگر اس نامور فرمانروا کے جانشین بھی اسی کی طرح قابل اور حوصلہ مند ہوتے تو ہمایوں، اکبر، اور جہانگیر کو ہندوستان میں شعائرِ اسلامی کی تحقیر کا موقع ہرگز نہ ملتا۔

نوٹ:۔ اگر اللہ نے مجھے توفیق دی، تو میں پاکستان کے طلبہ کے لیے ہندوستان کی تاریخ اپنے زاویۂ نگاہ سے لکھوں گا۔ جس میں بادشاہوں کے ساتھ ساتھ، بزرگانِ دین اور علمائے حق کے کارنامے بھی قلمبند کروں گا۔ اور اُن تمام غلط بیانیوں کی تردید کروں گا جو انگریز اور ہندو مورخین نے، تاریخ ہند خصوصاً مسلمانوں کے دورِ حکومت میں روا رکھی ہیں۔ اور جن کا مقصد اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ ہندوؤں کو مسلمانوں سے نفرت پیدا ہو جائے۔ اور مسلمان حق و صداقت سے آشنا نہ ہو سکیں وما توفیقی الّا باللّٰہِ العلیّ العظیم۔

(۱) سلطان شیر شاہ سوری، (۱۵۴۰ء تا ۱۵۴۵ء) نے اپنی قوم کے افراد کو کیسا اچھا نکتہ سمجھایا کہ اگر تم قبائلی امتیاز روا رکھو گے تو دنیا میں ہرگز ترقی نہ کر سکو گے۔

(۲) لیکن افسوس کہ افغانوں نے اس نکتہ کو ذہن نشین نہ کیا۔ چنانچہ وہ ابھی تک افغان کے بجائے، وزیری اور آفریدی، محسود اور مہمندی کے لقب کو محبوب رکھتے ہیں اور ہر قبیلہ اپنے سامنے دوسرے قبائل کو کمتر سمجھتا ہے، جس کا نتیجہ باہمی رقابت کے سوا کچھ نہیں ہے اور اسی لیے یہ مختلف قبائل رات دن آپس میں برابر سرِ پیکار رہتے ہیں۔

(۳) ہر قبیلہ، اپنے آپ کو، اور اپنے مورثِ اعلیٰ کے نام کو، دوسروں سے برتر سمجھتا ہے۔ گویا قبیلہ کا نام، ان لوگوں کی نظر میں "بت" کا مرتبہ رکھتا ہے۔ جس کی پرستش میں یہ لوگ سرگرم ہیں۔

(۴) اندریں حالات، ان لوگوں کی معاشرتی زندگی، اُسی نوعیت کی ہے جیسی کہ جاہلیت کے زمانہ میں عربوں کی تھی ظہور اسلام سے پہلے عربوں کے ہر قبیلہ کا بُت جُداگانہ تھا۔ اسی طرح آج سرحد کے قبائل بھی اپنے

اپنے بتوں کی پرستش کر رہے ہیں۔
اس لیے محراب گل دعا کرتا ہے کہ خدا کرے کوئی مردِ مومن ایسا پیدا ہو جائے
جو سرحدی علاقہ کے "لات و منات" کو توڑ کر افغانوں کو از سرِ نو مسلمان بنا سکے۔

(۱۹)

اس غزل میں محراب گل، یعنی اقبال نے بعض حقائق و معارف بیان کئے ہیں
فرماتے ہیں کہ

(۱) نگاہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک نگاہ تو وہ ہے، جس کی مدد سے ہم مختلف رنگوں میں امتیاز کرتے ہیں۔ یعنی ظاہری نگاہ جو عامی اور عالم دونوں کے پاس ہے یہ نگاہ بھی ضروری ہے۔ کیونکہ مادی ترقی تمام تر اسی نگاہ پر موقوف ہے۔ لیکن انسان صرف مادہ نہیں ہے وہ اس سے بالاتر ایک حقیقتِ روحانی بھی تو ہے، اس لیے اُسے وہ نگاہ بھی پیدا کرنی لازم ہے جو دیکھنے کے لیے محتاج مہر و ماہ نہ ہو۔ اور اقبال کی رائے میں حقیقی نگاہ وہی ہے جو مادی وسائل مذکورہ بالا کی محتاج نہ ہو۔ یعنی اسلام، ایسا پاکیزہ ضابطۂ حیات ہے کہ انسان کے اندر ظاہری نگاہ کے علاوہ، باطنی نگاہ بھی پیدا کر دیتا ہے۔ اور اقبال اپنی قوم سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ نگاہ پیدا کرو، جو روشنی، یا وسائل خارجی کی محتاج نہ ہو، یعنی دل کی نگاہ جو فقر کی بدولت پیدا ہو سکتی ہے۔ تاریخ اسلام میں اس کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں۔ چنانچہ فاروق اعظمؓ نے اسی نگاہ کی بدولت، مدینہ منورہ کی مسجد میں بیٹھے بیٹھے اپنی اُن فوجوں کو دیکھ لیا تھا، جو ملک شام میں کافروں سے برسرِپیکار تھیں۔ واضح ہو کہ یہ نگاہ صرف مرشد کی صحبت سے پیدا ہو سکتی ہے اور کوئی صورت نہیں ہے۔ قانون قدرت یہی ہے کہ چراغ

صرف، چراغ سے جل سکتا ہے۔ اسی لیے اقبال نے اپنی ہر تصنیف میں ہر جگہ صحبتِ مرشد کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔

نوٹ:۔ میری رائے میں یہ ہماری قومی ٹریجڈی ہے (وہ سانحہ جس کا شکار پوری قوم ہو چکی ہے) کہ آج ہماری قوم کے مصلحین وہ بزرگ ہیں۔ سندِ اصلاح پر وہ لوگ جلوہ فرما ہیں، جو خود محتاجِ اصلاح ہیں۔ کیا ستم ظریفی ہے کہ جنہوں نے خود کسی مصلح کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی، وہ دوسروں سے بیعت لے کر انہیں "صالحیت" کا سرٹیفکٹ عطا کر رہے ہیں۔

(۲) اے مسلمان! تیری منزل، کفارِ فرنگ، خصوصاً انگریزوں سے بہت آگے ہے۔ ان کی معراج تو بس یہی مادی ترقی ہے۔ ریڈیو، لاسلکی، ٹیلی ویژن وغیرہ وغیرہ۔ لیکن تو خلیفۃ اللہ علی الارض ہے اس لیے قدم اُٹھا اور تسخیر کائنات کے بعد اس روحانی مقام کو حاصل کرنے کی کوشش کر

(۳) آج پاکستان اور دیگر مسلمان ملکوں میں، مغربی علوم و فنون عام طور سے مروج ہیں۔ اور ان کا حاصل کرنا بھی گناہ نہیں ہے،

(۴) لیکن اگر مسلمانوں کے دلوں میں توحید کا عقیدہ راسخ نہیں ہے تو پھر اس میں بھی شک نہیں کہ یہ علوم و فنون ان کی گمراہی کا سبب بن جائیں گے پس مسلمانوں کو لازم ہے کہ پہلے اپنے عقیدے درست کریں، پھر مغربی علوم پڑھیں۔

(۵) چونکہ میں دنیاوی اعتبار سے "بڑا آدمی" نہیں ہوں۔ نہ وزیر ہوں، نہ سفیر ہوں۔ یعنی صاحبِ کلاہ نہیں ہوں، بلکہ محض گلیم پوش درویش ہوں اس لیے مجھے یقین ہے کہ سرحد کے خوانین اور خوانین زادے میری باتوں پر توجہ کریں گے۔

بات بھی ٹھیک ہے۔ آج مسلمانوں کی ظاہر پرستی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ اگر کوئی "بڑا آدمی" خواہ وہ بذات خود سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دُور کی نسبت بھی نہ رکھتا ہو، کسی پُرفضا پارک میں، میلادالنبیؐ کے جلسہ میں، حضورؐ کے اُسوہ حسنہ پر تقریر کرنے آجائے، اُس اُسوۂ حسنہ پر، جس کو وہ خود کبھی اپنے سامنے نہیں رکھتا، تو ہزاروں مسلمان، اُس کی تقریر دلپذیر سُننے کے لیے جمع ہو جائیں گے۔ لیکن وہی بات اور وہی مضمون اگر کوئی گلیم پوش مُلّا، محلہ کی مسجد میں بیان کرے تو کوئی صاحب اُسے سننے کے لیے اپنے ڈرائنگ روم سے نکل کر اُس مسجد تک نہیں آئیں گے۔ یعنی آج کل بات کو نہیں دیکھتے، بلکہ بات کہنے والے کو دیکھتے ہیں۔

——— (۲۰) ———

اس آخری نظم میں محراب گل نے شہری زندگی کے مقابلہ میں بدوی یا صحرائی زندگی کی فضیلت ثابت کی ہے۔

اس تفوق سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ شہری زندگی بیکار یا بُری ہے، نہیں یہ زندگی بھی اپنے اندر بعض خوبیاں رکھتی ہے۔ لیکن اس کی بُرائیاں، خوبیوں سے زیادہ ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ حکومت کرنے اور غالب آنے کے لیے شہری زندگی سے بدوی زندگی زیادہ موزوں ہے۔ کیونکہ شہری زندگی میں تمدن اور معاشرت کے اندر ایسے عناصر لازمی طور سے داخل ہو جاتے ہیں جو انسان کی سیرت کو تباہ کر دیتے ہیں۔ مثلاً، ریڈیو، سینما، رقص خانے، کلب، ہوٹل، اور گھوڑ دوڑ، جو بالواسطہ یا بلاواسطہ فحاشی کے مرکز ہیں۔ لیکن بدوی زندگی ان جراثیم سے پاک ہوتی ہے۔

تیسرا نکتہ یہ ہے کہ شہری زندگی میں جدوجہد کم ہو جاتی ہے۔ ہزاروں

آدمی سرمایہ دار، ہزاروں آدمی زمیندار، اور ہزاروں آدمی ملوں، فیکٹریوں اور کارخانوں کے مالک بن جاتے ہیں۔ اور بلا ہاتھ پاؤں ہلائے، عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں لہٰذا ان میں کاہلی اور تن آسانی پیدا ہو جاتی ہے اور انجام کار یہی، طبقہ پوری قوم کو اپنی بداعمالیوں کی بدولت غرق فنا کر دیتا ہے۔

انبیائے کرامؑ اور اولیائے عظامؒ کی زندگیوں کا مطالعہ کیجیے آپ کے سامنے اس قول کی صداقت واضح ہو جائے گی۔

بدوی زندگی سے مراد، صرف یہی نہیں کہ ساری زندگی جنگل میں گذار دی جائے، بلکہ اس سے دراصل سادہ زندگی مراد ہے۔ جو شہر میں بھی ممکن ہے بشرطیکہ انسان نے، کچھ دنوں صحرا میں رہ کر خلوت کی بدولت اپنی سیرت کو پختہ کر لیا ہو۔

حضرات انبیائے کرامؑ نے شہروں میں بھی زندگی کا بڑا حصہ بسر کیا۔ لیکن اُنہوں نے اپنے اندر صحرائی زندگی کا رنگ ضرور پختہ کر لیا تھا۔ حضور سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے

(ا) شیر خوارگی کا زمانہ صحرا میں بسر کیا۔

(ب) قبل بلوغ، شبانی کا مقدس فریضہ انجام دیا۔ یعنی بکریاں چرائیں اور یہ وہ پیشہ ہے، جس کا تصور بھی "حکمرانوں" کے دماغ میں نہیں آسکتا۔

(ج) قبل نبوت، ۳½ سال کامل مکہ معظمہ سے ۳ میل دُور ایک پہاڑی کی چوٹی پر، غار حرا میں، خلوت اختیار فرمائی۔ آج مسلمان سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی غلامی کا مدعی اور اسلامی نظام کا داعی ۳½ دن کے لیے بھی شہر کی دلچسپیوں کو ترک کر کے کسی غار میں خلوت اختیار نہیں کر سکتا۔

غالبًا اس تصور ہی سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے۔

انبیاؑ کی زندگیوں کے بعد قوموں کی تاریخ اُٹھا کر دیکھ لیجئے! یہی اصول وہاں بھی کارفرما نظر آئے گا۔

بدوی قومیں جنہوں نے اپنے آپ کو جفاکشی کا عادی بنا لیا تھا، کوہستانی علاقوں سے نکلیں، اور چشم زدن میں اُنھوں نے متمدن اور مہذب اقوام کو غلام بنا لیا۔ غزنوی اور غوری کے کارناموں سے کون واقف نہیں ہے لیکن برسرِ حکومت ہو کر وہی قومیں عیش و عشرت میں غرق ہو گئیں، اور بدویت سے محروم ہو گئیں۔ محمد شاہ رنگیلے، اور واجد علی شاہ کے نام سے کون نا آشنا ہے؟

وہ مغل سردار جن کے آباء واجداد نے ۱۵۲۷ء میں رانا سانگا والی چتوڑ کو شکست دی تھی، جب ۱۷۲۷ء میں سکھوں کے مقابلہ کے لیے نکلے تھے۔ تو گھوڑوں کی پشت پر مسافت طے کرنے کے بجائے پالکیوں میں شاہانہ انداز سے سفر کرتے تھے۔ بایں طور کہ بائیں جانب حقہ بردار، اور دائیں جانب خاصدان بردار، ساتھ ساتھ دوڑتے جاتے تھے۔ چنانچہ اس عیاشی کا نتیجہ جیسا کہ ہر شخص کو معلوم ہے، یہ نکلا کہ جس سرہند میں حضرت عالمگیرؒ کے عہدِ حکومت میں، یعنی ۱۷۰۷ء تک پانچ لاکھ سے زائد مسلمان رہتے تھے، اُسی شہر میں بیس پچیس سال کے بعد پانچ ہزار بھی باقی نہیں رہے مٹھی بھر سکھوں نے سب کو تلوار کے گھاٹ اُتار دیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ؕ

(۲۰)

(۱) محراب گل کہتا ہے کہ فطرت کے مقاصد کی نگہبانی، بلکہ تکمیل یا بندۂ صحرائی کر سکتا ہے یا مردِ کوہستانی۔

"فطرت کے مقاصد" یہ بہت بلیغ ترکیب ہے۔ جو اقبالؔ نے اپنے مفہوم کے اظہار کے لیے استعمال کی ہے۔ فطرت کے مقاصد اس قدر متنوع اور گوناگوں ہیں کہ اگر اُن کی تفصیل کی جائے تو ایک رسالہ مرتب ہو سکتا ہے۔ میں چند اشارات پر اکتفا کروں گا اور پہلے لفظ "فطرت" کی تشریح کروں گا۔

واضح ہو کہ لفظ "فطرت" تین معنوں میں مستعمل ہے۔

(ا) فطرت بمعنی خلقت یا نیچر (NATURE) اس اعتبار سے لفظ فطرت کائنات کا مرادف ہے۔ اور اقبال نے اس لفظ کو اس مصرع میں اسی مفہوم کے اظہار کے استعمال کیا ہے۔

(ب) فطرت بمعنی انسان کی جبلت، یا وہ باتیں جو تمام انسانوں کی سرشت میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ مثلاً انسان کی فطرت ہے کہ وہ جلد باز ہے

(ج) فطرت بمعنی اللہ کا انداز یا طریق تخلیق۔

قرآن مجید میں فطرت کا لفظ سورۂ الروم آیت ۳۰ میں اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِىْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ	پس تو سیدھا رکھ اپنا منہ دین پر، ایک طرف کا ہو کر (اور وہ دین کیا ہے؟) وہی اللہ کی تراش جس پر اُس نے لوگوں کو تراشا یعنی پیدا کیا۔

اقبالؔ نے یہاں فطرت سے کائنات مراد لی ہے۔ اس کے بعد یہ بات وضاحت

طلب ہے کہ فطرت (نیچر) کے مقاصد کیا ہیں؟ اس کا جواب بھی بہت تفصیل طلب ہے صرف اشارہ کافی ہے کہ فطرت کے مقاصد اقبال کے زاویۂ نگاہ سے حسب ذیل ہیں :-

(۱) بنی آدم کی فطری (جبلی) صلاحیتوں (POTENTIALITIES) کے بروئے کار آنے کے لیے، مناسب ماحول پیدا کرنا، اللہ نے انسان میں بہت سی خوبیاں بالقوۃ (POTENTIALLY) ودلیعت فرمادی ہیں۔ اب یہ انسان کا فرض ہے کہ وہ اُن خوبیوں کو قوۃ سے فعل میں لائے۔ یعنی بالفعل (ACTUALLY) موجود کر دے۔ پس جو شخص اس کام کے لیے مناسب ماحول پیدا کرتا ہے وہ دراصل فطرت کے مقاصد میں سے ایک بڑے مقصد کی نگہبانی کرتا ہے۔ بلکہ میری رائے میں بنی آدم کے حق میں احسان عظیم کرتا ہے۔

چونکہ یہ کام، بدرجۂ کمال صرف حکومت کر سکتی ہے اس لیے اسلام نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ تم جب حکمراں ہو جاؤ تو حکومت الہیہ قائم کرنا، کیونکہ اسی حکومت کی بدولت فطرت کے تمام مقاصد کی نگہبانی اور تکمیل ہو سکتی ہے۔

(ب) بنی آدم کو نیکی کی طرف مائل کرنا، اور ایسی تعلیم پھیلانا جس کی روشنی میں وہ اپنی فطرت کے اقتضاء کو سمجھ سکیں۔ اور وہ اقتضاء یہ ہے کہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ۔ اور بفحوائے نص قرآنی یہی اقرارِ توحیدِ الٰہی، دینِ حق یا دینِ فطرت یا دینِ قیّم ہے۔

(ج) ایسا نظام قائم کرنا، جس میں کوئی شخص، کسی شخص پر ظلم نہ کر سکے۔ اس جگہ میں نے لفظ "ظلم" کو اس کے وسیع ترین معنوں میں استعمال کیا ہے

یعنی کائنات میں، اگر کوئی شئے، اپنے طبعی یا فطری محل کے علاوہ کسی اور جگہ پائی جائے تو یہ ظلم ہے۔

ظلم صرف یہی نہیں کہ ایک طاقتور آدمی کسی کمزور عورت کے کانوں سے بالیاں نوچ کر بھاگ جائے اور وہ عورت کچھ نہ کر سکے۔

بلکہ یہ بھی ظلم ہی ہے کہ ایک متقی اور دیندار آدمی تو نانِ شبینہ کو محتاج ہو اور ایک بدکار آدمی موٹر میں سوار ہو کر نکلے۔ یا ایک عالم آدمی تو گوشۂ گمنامی میں پڑا رہے اور جہلا برسر اقتدار ہوں۔ ان دو مثالوں سے ناظرین "ظلم" کا مفہوم بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔

واضح ہو کہ اگر اسلامی نظام دنیا کے کسی خطہ میں قائم ہو جائے تو اسی قسم کا نہیں، بلکہ کسی قسم کا ظلم بھی وقوع پذیر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اسلامی نظام کے کارکنوں کو ہر وقت یہ آیت عدل و انصاف کا سبق پڑھاتی رہے گی۔

اِنَّ اللہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی	بیشک اللہ حکم دیتا ہے انصاف کا اور احسان کا اور اپنے رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کا

الغرض اس میں کوئی شک نہیں کہ بندۂ مومن ہی فطرت کے مقاصد کی نگہبانی کر سکتا ہے۔

(۲) اور یہ بندۂ مومن، مقاصدِ فطرت ہی کا نگہبان نہیں ہوتا، بلکہ فسوں گر مغربی تہذیب کا محاسب بھی ہوتا ہے۔ وہ مغربی تہذیب جو لادینی اور انکارِ خدا پر مبنی ہے۔ جس کے اصول اور مبادی، اسلامی نظام تصورات یعنی (ISLAMIC IDEOLOGY) کی ضد ہیں۔ بندۂ مومن ہی اس بات کی صلاحیت رکھتا ہے کہ وہ اللہ کے بندوں کو غیر قرآنی نظام کی خرابیوں سے آگاہ کرتا رہے وہ بظاہر فقیرانہ زندگی بسر کرتا

ہے۔ وہ اکثر اوقات نانِ جویں پر قناعت کرتا ہے۔ پیوند لگا ہوا کرتا پہنتا ہے کبھی کبھی فرشِ زمین ہی پر سو جاتا ہے۔ لیکن شاہانِ عالم اس کے نام سے لرزہ براندام رہتے ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ وہ عناصرِ کائنات پر حکومت کرتا ہے۔

ہستیٔ اُو بے جہات اندر جہات
اُو حریم و در طوافش کائنات

(۳) بلبل بھی ایک پرندہ ہے۔ اور شہباز بھی ایک پرندہ ہی ہے۔ لیکن دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ بلبل میں حسن اور نزاکت (ضعف) ہے لیکن شہباز میں قوت اور شوکت ہے، اور اُس کی وجہ صرف یہ ہے کہ بلبل چمن میں رہتی ہے، عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتی ہے۔ موسیقی اِسکا شیوہ ہے، عاشقی اس کا پیشہ ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ کہ باز کا ایک ناخن اس کو فنا کرنے کے لیے کافی ہے۔ اس کے مقابلہ میں باز کو دیکھو وہ بیابان میں رہتا ہے۔ گلوں سے تعلق تو بڑی بات ہے وہ علائقِ دنیوی سے اس قدر بے نیاز ہے کہ آشیانہ تک نہیں بناتا۔ کسی کا دستِ نگر نہیں۔ اپنی روزی اپنے زور بازو سے حاصل کرتا ہے۔ نتیجہ واضح ہے کہ تمام پرندوں کا بادشاہ ہے۔ جو حالت شیر کو دیکھ کر حیوانات کی ہو جاتی ہے، وہی حالت باز کو دیکھ کر طائروں کی ہو جاتی ہے۔

اسی طرح جو قومیں بلبل کی طرح عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتی ہیں ضعیف ہو جاتی ہیں، اور دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ اور جو قومیں جفاکش اور سادہ زندگی بسر کرتی ہیں۔ یعنی بدوی زندگی وہ طاقتور ہو جاتی ہیں۔

(۴) اے شیخ! مکتب کی فضا بھی اگرچہ بہت اچھی ہے۔ منطق اور فلسفہ کے مطالعہ سے دماغ ضرور منور ہو جاتا ہے لیکن مسلمان میں شانِ فاروقیؓ یا

شانِ سلمانی، بیابانی زندگی ہی سے پیدا ہو سکتی ہے۔ یعنی ایسی زندگی سے جس میں مسلمان اپنی خودی کی تربیت کر سکے۔ جس میں سادگی ہو تاکہ نفسِ امارہ قابو میں آسکے اور انسان عیش و عشرت کا خوگر نہ ہو سکے۔ شانِ فاروقی سے اشارہ ہے حضرت فاروق اعظمؓ کی زندگی کی طرف اور شانِ سلمانی سے اشارہ ہے۔ حضرت سلمان فارسی کی طرف، اقبال کا منشا ان دو ناموں کے تذکرہ سے یہ ہے کہ مسلمان ان بزرگوں کی زندگیوں سے سبق حاصل کریں اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کریں۔

اس جگہ حضرت فاروق اعظمؓ کی زندگی پر تبصرہ مقصود نہیں ہے صرف اتنا لکھنا کافی ہے کہ آج تک دنیا نے حضرت موصوفؓ کا جواب پیدا نہیں کیا۔ خسروی اور درویشی کا ایسا کامل اجتماع آجتک کسی شخص واحد کی ذات میں نظر نہیں آیا۔ بات یہ ہے کہ اُنھوں نے مرکزِ کائناتِ محورِ موجودات سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ کیمیا ساز سے فیض حاصل کیا تھا، اس لیے فقر اور شاہی دونوں خوبیاں ان میں بدرجہ اتم موجود ہو گئی تھیں بلکہ وہ سرکار دو عالم صلے اللہ علیہ وسلم کی ان دونوں خوبیوں کے مظہر کامل تھے۔

فقر اور شاہی یہ دو موتی ہیں جو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے توحید کے سمندر سے حاصل کئے تھے۔ فقر کا موتی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ بن گیا، اور شاہی کا موتی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک میں شمشیر بن گیا۔ اقبال نے کیا خوب کہا ہے۔

خسروی شمشیر، درویشی نگہہ
ہر دو گوہر از محیط لا الٰہ!

اس کے بعد ان دونوں صفات یعنی خسروی اور درویشی کی تجلی صحابہ کرامؓ

کے قلوب پر عکس فگن ہوئی۔ اور ہر صحابی نے اپنے اپنے ظرف کے مطابق، اس نعمتِ خداداد سے اپنا اپنا دامن بھرا۔

فقر و شاہی وارداتِ مصطفےٰ است

ایں تجلیہائے ذاتِ مصطفےٰ است

خوشا نصیب فاروق اعظم رضؓ کے، کہ وہ ان صفات کے مظہرِ اتم ہو کر تاریخِ عالم میں زندہ جاوید ہو گئے۔ نہ اب یہ تجلی دوبارہ ممکن ہے نہ فاروقِ اعظمؓ کا جواب پیدا ہو سکتا ہے۔

اسی لیے جب ۱۹۳۷ء میں ہندوستان میں کانگریسی وزارتیں پہلی مرتبہ قائم ہوئیں تو ہندو قوم کے سب سے بڑے آدمی مسٹر گاندھی نے کانگریسی وزیروں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ اگر تم کو حکمرانی کے لیے، کسی انسان کا نمونہ درکار ہو تو فاروق اعظمؓ سے بہتر نمونہ دنیا میں نہیں مل سکتا۔

والفضل ما شہدت بہ الاعداء

(۵) اسلام کی شراب تیزی میں تلوار سے بھی بڑھ کر ہے یعنی اسلامی تعلیمات سے مومن میں شمشیر بُرّاں کی صفت پیدا ہو جاتی ہے اس لیے اس کا حریف یا مدِ مقابل ایسا شخص جو مومن کا مقابلہ کر سکے کہیں صدیوں میں جا کر پیدا ہوتا ہے۔

نوٹ :۔ محراب گل کی زبان سے اقبال نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ میری ناقص رائے میں ان کی پوری کتاب کا خلاصہ ہیں اسی لیے میں نے بھی ان کی تشریح میں قدرے وضاحت سے کام لیا ہے۔

ضربِ کلیم کے بنیادی تصوّرات پر

اک طائرانہ نگاہ

وہ بنیادی تصورات، جن پر علامہ مرحوم نے اس کتاب میں مختلف طریقوں سے اظہارِ خیالات کیا ہے، میری رائے میں حسب ذیل ہیں :۔

توحیدِ الٰہی[1]۔ خودی[2]۔ عشق[3]۔ فقر[4]۔ تسلیم و رضا[5]۔ جہاد[6]۔

واضح ہو کہ یہ جملہ تصوّرات براہ راست قرآن حکیم سے ماخوذ اور مقتبس ہیں۔

(۱) تصوّرِ توحید سے تو کلام پاک از اوّل تا آخر معمور ہے، صرف ایک آیت درج کرتا ہوں :۔

هُوَ اللّٰهُ الَّذِىْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ
(سورۂ حشر رکوع ۳)

اللہ وہی ذات پاک ہے جسکے علاوہ اور کوئی معبود نہیں ہے، وہ جانتا ہے ہر چیز کو جو پوشیدہ ہے اور ظاہر ہے اور بڑا مہربان اور رحم والا ہے۔

(۲) خودی کا تصوّر (جیسا کہ اقبال مرحوم نے خود مجھے بتایا تھا) اس آیت سے ماخوذ ہے :۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اپنی خودی کی حفاظت کرو۔

واضح ہو کہ حضرت مجدد دہلوی شاہ ولی اللہؒ نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے :۔ "محافظت کنید خویشتن را" اور اس فارسی عبارت کا صحیح لفظی ترجمہ یہی ہو گا کہ

اپنی خودی کی حفاظت کرو۔ اور شیخ الہندؒ نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے "تم پر لازم ہے فکر اپنی جان کی" اس کا مفہوم بھی یہی ہے کہ تم اپنی خودی کی حفاظت کرو۔

(۳) عشق کا لفظ، اگرچہ کلامِ پاک میں مذکور نہیں۔ لیکن اقبال کی مراد اس لفظ سے محبت ہے۔ اور حُب کا لفظ اس آیت میں موجود ہے یعنی عشق و محبت کا تصور اس آیت سے مقتبس ہے :۔

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ؕ

اور جو لوگ مومن ہیں (اُن کی شناخت یہ ہے کہ) وہ اللہ کی محبت میں سب سے زیادہ شدید ہوتے ہیں۔

نوٹ :۔ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم، یا حُبِ رسولؐ، جو حُبِّ الٰہی سے مربوط ہے اور جو اقبال کی مذہبی فکر کا محور ہے، جو اُن کا سرمایۂ حیات ہے، اس حدیث سے ماخوذ ہے :۔ قال رسول اللّٰہِ صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم۔

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰٓی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّالِدَیْہِ وَمِنْ وَّلَدِہٖ وَمِنَ النَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ؕ

تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک (میں) اس کی نظر میں اس کے والدین اور اولاد اور سب انسانوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

(۴) فقر مرکب ہے، ذکر اور فکر سے، اور یہ دونوں لفظ اس آیت میں موجود ہیں۔ اقبال نے ان دونوں کے مجموعہ کو فقر سے تعبیر کیا ہے۔

اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِہِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

اللہ کی نظر میں عقلمند لوگ وہ ہیں) جو اللہ کا ذکر کرتے ہیں کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے (ہر حالت میں) اور فکر کرتے ہیں آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں (اور

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا ۚ
(آل عمران ع ۱۹۱)

غور و فکر کے بعد پکار اُٹھتے ہیں کہ) اے رب ہمارے! تو نے یہ کارخانۂ عالم عبث پیدا نہیں کیا۔

(۵) تسلیم و رضا کا تصور، اس آیت سے مستنبط ہے۔

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۙ
(سورۃ انعام)

آپ فرما دیجئے کہ میری نماز اور مراسم مذہبی اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ ہی کے لیے ہے جو پروردگار ہے ساری کائنات کا۔

(۶) جہاد کا تصور حسبِ ذیل آیت سے ماخوذ ہے۔ اور توحید کی طرح جہاد کی تعلیم بھی قرآنِ پاک میں بکثرت مذکور ہے۔ اور میری رائے میں تو جہاد فی سبیل اللہ غایتِ حیاتِ دینوی ہے۔ صرف ایک آیت درج کرتا ہوں۔

قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَاَبْنَآؤُکُمْ وَاِخْوَانُکُمْ وَاَزْوَاجُکُمْ وَعَشِیْرَتُکُمْ وَاَمْوَالُ اقْتَرَفْتُمُوْھَا وَتِجَارَۃٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَھَا وَمَسٰکِنُ تَرْضَوْنَھَآ اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَجِہَادٍ فِیْ سَبِیْلِہٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ بِاَمْرِہٖ

آپ فرما دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور بیویاں اور رشتہ دار اور مال جو تم نے کمائے ہیں۔ اور سوداگری (تجارت) جس کے مندا ہو جانے سے تم ڈرتے ہو۔ اور تمہاری حویلیاں جن کو تم پسند کرتے ہو تم کو زیادہ پیاری ہیں، اللہ اور اُسکے رسولؐ سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے، تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم نازل فرمائے۔

میں نے مذکورہ بالا تصورات ستہ کو قرآن حکیم کی نصوص واضحہ سے اسلئے ثابت کیا ہے کہ ناظرین پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے کہ علامہ مرحوم رح کی ساری تعلیمات بلا واسطہ قرآن مجید سے ماخوذ ہیں۔

اقبال کے اکثر ناقدین اُن کے فلسفہ (افکار و تصورات) کے مآخذ تلاش کرنے میں تکلیف مالا یطاق برداشت کرتے ہیں اور عجیب وغریب نکات بیان کرتے ہیں۔ اُمید ہے کہ ان سطور سے اُن کو معلوم ہو جائے گا کہ اقبال کے فلسفہ کا مآخذ کیا ہے۔

اب میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ اقبال کے ان بنیادی تصورات میں ایک کیف آفریں لیکن منطقی ربط پایا جاتا ہے۔

(۱) سب سے پہلے توحید الٰہی کے تصور کو لیجئے۔ یہ تصور اقبال کے فلسفہ کا سنگ بنیاد ہے۔ یعنی خودی کا فلسفہ اس عقیدہ پر مبنی ہے اقبال کا مذہب یہ ہے کہ اگر اللہ موجود نہ ہوتا تو خودی بھی موجود نہ ہوتی کیونکہ "خودی" کا وجود، مستقل یا خانہ زاد نہیں ہے۔ منطقی اصطلاح میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اللہ واجب الوجود ہے خودی ممکن الوجود ہے۔ اور ممکن کا وجود، واجب کے وجود کے بغیر متحقق نہیں ہو سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ اقبال نے اپنی ہر تصنیف میں توحید الٰہی کے عقیدہ کو بڑی شد و مد کے ساتھ پیش کیا ہے۔ خصوصاً مثنوی اسرار خودی، رموز بیخودی، اور پس چہ باید کرد، میں تو انہوں نے، اس عقیدہ کی وضاحت میں اپنا سارا زورِ قلم صرف کر دیا ہے۔ اور وہ ایسا کیوں نہ کرتے؟ وہ جس کتاب کے خوشہ چین ہیں، کیا اُس سے بڑھ کر دنیا میں کسی کتاب نے توحید الٰہی کے مضمون کو بیان کیا ہے؟ راجہ رام موہن رائے، بانی برہمو سماج

اپنی دلکش تالیف "رسالۃ التوحید" میں لکھتے ہیں کہ "دنیا میں قرآن مجید سے بڑھ کر کسی کتاب نے توحید کی حقیقت کو واضح نہیں کیا اس سے زیادہ اور کیا ہو گا کہ مسلمانوں نے اپنا کلمہ ہی "لا الٰہ الا اللہ" مقرر کر لیا ہے۔

(۲) خدا ہے اور وہ خالق ہے، یہ ساری کائنات اس کی مخلوق ہے اس لیے خودی موجود بھی ہے، اور مخلوق بھی ہے۔

اللہ کا تصور، اقبال کے فلسفیانہ فکر کا نقطۂ آغاز ہے۔ اور خودی کا تصور اس کی لازمی فرع ہے خودی کا وجود، خالق خودی کے وجود پر شاہد ہے۔

بقول اکبر الہ آبادی ؎

مری ہستی ہے خود شاہد، وجودِ ذاتِ باری پر
دلیل ایسی ہے یہ، جو عمر بھر رد ہو نہیں سکتی

الغرض خدا کو خالق تسلیم کرنے کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ ہم خودی کے وجود کو بھی تسلیم کریں۔ خدا موجود ہے، اس لیے خودی بھی موجود ہے۔ (اگرچہ اسکا وجود، خدا کے وجود پر موقوف ہے۔)

خدا نے خودی کو پیدا کیا، اور یہ خودی، اگر اس کی صحیح تربیت کی جائے تو انسان کو خدا تک پہنچا دیتی ہے اسی لیے اقبال کہتے ہیں۔

از ہمہ کس کنارہ گیر صحبتِ آشنا طلب
ہم ز خدا خودی طلب ہم ز خودی خدا طلب

اگر خدا ہے تو خودی بھی ضرور ہو گی، کیونکہ اگر خدا، تخلیق پر قادر نہیں تو پھر وہ خدا کیسا؟ پھر اُس میں اور جناب مارکس کے خدا (مادہ) میں کیا فرق ہے؟

پس عقل کا تقاضا ہے کہ وہ خالق ہو، اور اگر وہ خالق ہے تو اس کی صفتِ

تخلیق کا شاہکار کہاں ہے؟

اس سوال کا جواب ناظرین کے ذوقِ سلیم پر چھوڑتا ہوں۔ اگر خودی ہے تو خدا بھی ضرور ہے۔ کیونکہ ہم سب جانتے ہیں کہ خودی قائم بالذات نہیں ہے، محتاج الی الغیر ہے، اگر وہ محتاج نہ ہوتی تو ناقص نہ ہوتی، ضعیف نہ ہوتی، ضعف اور نقصان دلیل ہے احتیاج کی اور احتیاج دلیل ہے بندگی کی۔ بقول اکبر الہ آبادی

درد تو موجود ہے دل میں دوا ہو یا نہ ہو
بندگی حالت سے ظاہر ہے خدا ہو یا نہ ہو

(۳) خدا اور خودی میں ربط واضح کر دینے کے بعد، اب تیسرے تصور پر غور کیجیے۔ خودی اور عشق میں یہ ربط ہے کہ اگرچہ خودی موجود ہے، لیکن ناقص اور ضعیف ہے۔ تو اب عقل کا تقاضا ہے کہ خدا اس کی اصلاح کا سامان بھی مہیا کرے۔ "درد دیا ہے تو دوا بھی دے" اسی دوا یا اصلاحی پروگرام کا نام عشق ہے۔ بقول مرشدی رومیؒ

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما
اے طبیبِ جملہ علتہائے ما

قرآن حکیم نے صاف لفظوں میں اعلان فرما دیا ہے کہ اتباع رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) سے خودی کامل ہو سکتی ہے۔ لیکن اتباعِ رسولؐ، موقوف ہے، عشقِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) پر۔ کیونکہ نفسیات (PSYCHOLOGY) میں یہ اصول مسلّم ہے کہ جبتک آپ کو کسی کے ساتھ رابطۂ قلبی (ATTACHMENT) نہ ہو آپ اُس کی تقلید یا اتباع نہیں کر سکتے۔ اور یہ وابستگی جس قدر شدید ہوگی، اتباع اسی قدر کامل ہوگی ع عاشقی؟ محکم شو از تقلیدِ یار

الغرض خودی اور عشق میں یہ منطقی ربط ہے کہ خودی، عشق، اور صرف عشق

ہی سے مستحکم ہو سکتی ہے، اور مومن اُسے اسی لیے مستحکم کرتا ہے کہ فرمانِ الٰہی "عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ" پر عمل پیرا ہو سکے جو شخص اپنی خودی کو مستحکم نہیں کرتا، وہ اس فرمان الٰہی کی تعمیل نہیں کر سکتا۔ اور جو اس فرمان کی تعمیل نہیں کرتا، وہ آقا کی نافرمانی کے علاوہ، اپنے مقصدِ حیات کی تکمیل نہیں کر سکتا۔

(۴) فقر، اس پروگرام کا نام ہے جو حضرتِ عشق، خودی کی تکمیل کے لیے مرتب فرماتے ہیں۔ آسان لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ شریعت وہ پروگرام ہے جس پر عمل کرنے سے خودی، کمال کو پہنچتی ہے۔ لیکن شریعت پر عمل تو وہی کرتا ہے، جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہوتی ہے اور جس قدر شدید محبت ہوگی، اُسی قدر شدید عمل ہوگا۔

الغرض، فقر کی تعلیم، گدائی، کوچہ گردی، صحرانوردی، عزلت گزینی، گوشہ گیری، احتیاج الی الناس، یا ترکِ دنیا، یا ترکِ زن کا نام نہیں، بلکہ خودی کی تلوار کو سان پر چڑھانے کا نام ہے۔ بالفاظِ دگر، فقر اُس طریقِ زندگی کا نام ہے، جس پر چلنے سے، خودی کی تلوار قیامت بن جاتی ہے۔ یعنی اس کی دھار میں قیامت کی تیزی پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ موجِ نفس کیا ہے؟ تلوار ہے! خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے! جنگِ خیبر میں حضرت علیؓ کی تلوار میں جو یہ حدّت اور شدّت پیدا ہو گئی تھی، یہ سب اسی شانِ فقر کا کرشمہ تھا، میں اپنی قوم کے فیشن ایبل نوجوانوں کو کیسے سمجھاؤں کہ کاٹنے کی قوت بازو میں ہوتی ہے نہ کہ تلوار میں، اور بازو میں قوّت، خودی سے پیدا ہوتی ہے نہ کہ گوشت یا چربی کی افراط سے۔

تری خاک میں ہے اگر شرر، تو خیال فقر و غنا نہ کر
کہ جہاں میں نانِ شعیر پر ہے مدار قوّتِ حیدریؓ

(۵) فقر اور شیوۂ تسلیم و رضا میں یہ ربط ہے کہ جب مومن میں شانِ فقر پیدا ہو جاتی ہے تو یہ حقیقت اس پر منکشف ہو جاتی ہے کہ بندۂ مومن کی آئینی حیثیت، اس دنیا میں یہ ہے کہ وہ اپنے خالق سے ایک معاہدہ کرتا ہے جسے اصطلاح میں کنٹریکٹ (CONTRACT) کہتے ہیں۔ یعنی اللہ بندہ سے ارشاد فرماتا ہے کہ "تم اگر اپنی عزیز ترین متاع (جان و مال) مجھے دیدو تو میں اپنے "دیدار کی دولت تمہیں دے دوں گا۔

مومن اس معاہدہ پر راضی ہو جاتا ہے، اگرچہ شیوۂ تسلیم و رضا کا مفہوم اسی بات سے واضح ہو سکتا ہے، لیکن میں مزید وضاحت کرتا ہوں۔ یعنی جب یہ معاہدہ طے پا جاتا ہے تو مومن اُس وقت سے اپنی جان اور اپنے مال کو، اپنی ملک نہیں سمجھتا۔ بلکہ ان دونوں کو اللہ کی امانت سمجھتا ہے اور ہر وقت ان دونوں کو اس کی راہ میں قربان کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ بالفاظِ دگر جان اور مال کے متعلق، اس کی اپنی کوئی رائے یا مرضی باقی نہیں رہتی، کیونکہ اپنی مرضی تو اپنی ملک میں نافذ ہو سکتی ہے۔ اور جب اپنی جان، اپنی نہیں بلکہ کسی دوسرے کی ہے تو پھر اُس میں اپنی مرضی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بلکہ ہر معاملہ میں ایک ایماندار معاہد کا شیوہ یہی ہو گا کہ میری نہیں بلکہ حبیبی اس کی مرضی! اسی کو تصوف (شریعت) کی اصطلاح میں شیوۂ تسلیم و رضا کہتے ہیں۔ اور جناب حسینؓ نے میدان کربلا میں اِسی کا نمونہ، دنیا کے سامنے پیش کیا تھا، جو ہماری بدبختی سے مرثیہ اور سوز خوانی کے غبار میں، مومنوں کی نگاہوں سے بالکل پوشیدہ ہو کر رہ گیا۔

نوٹ:۔ جس معاہدہ کا میں نے ذکر کیا ہے، وہ قرآن مجید کی اس آیت میں مذکور ہے، جو آج کل متروک التلاوۃ ہو گئی ہے۔ یعنی مسلمانوں نے اُس کی

تلاوت متفقہ طور پر (UNANIMOUSLY) ترک کر دی ہے۔ اگر کسی آیت کا قرآن مجید سے خارج کرنا ممکن نہیں تو اس کی تلاوت ترک کر دینا تو ممکن ہے!

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ	بیشک اللہ نے خرید لی مسلمانوں سے اُن کی جان اور اُن کا مال اس قیمت پر کہ اُن کے لیے جنّت ہے۔

شاید ناظرین کے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ قرآن مجید تو جان کے معاوضہ میں جنّت پیش کرتا ہے، میں نے یہ دیدار کا مسئلہ کہاں سے نکال لیا۔؟ یا جنت کی جگہ دیدار کا لفظ کیوں استعمال کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ

اصلی چیز دیدار ہی تو ہے، جنت اور اس کی تمام دلکشی، اور ساری نعمتیں اِسی نعمتِ کبریٰ اور موہبتِ عظمیٰ کے لیے بمنزلہ تمہید ہیں۔ جیسے حجلۂ عروسی میں خوشبو بھی ہوتی ہے۔ ہار پھول بھی ہوتے ہیں، عود اور عنبر کی بتیاں بھی ہوتی ہیں۔ عطر کی پٹیں بھی ہوتی ہیں، چھپر کھٹ بھی ہوتا ہے، قالین بھی ہوتے ہیں، ریشمی پردے بھی ہوتے ہیں، گنگا جمنی تھالیاں بھی ہوتی ہیں۔ پان بھی ہوتے ہیں۔ غرضکہ عیش و عشرت کے جملہ لوازم مہیا ہوتے ہیں۔ لیکن اگر چھپر کھٹ خالی ہو تو پھر دولہا کی نظروں میں اس سامان کی کوئی قدر و قیمت ہو سکتی ہے؟

اسی طرح اگر جنت میں دیدارِ الٰہی نہ ہو تو جنت کی حیثیت اُس حجلۂ عروسی سے زیادہ نہیں ہو سکتی، جس میں "عروس" نہ ہو۔ اسی لیے میں نے "دیدار" یعنی جنت کی روح کا ذکر کر دیا۔ دیدار کے بغیر جنت جسد بے روح سے زیادہ نہیں۔

اس پر شاید ناظرین یہ سوال کریں کہ جب یہ بات ہے تو اللہ نے اس

آیت میں جنت کا لفظ کیوں استعمال کیا؟ "دیدار" کا لفظ کیوں نہیں استعمال کیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر یہاں لفظ دیدار آجاتا تو قرآن مجید انسانی کلام ہو جاتا۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ قرآن حکیم ساری دُنیا کے لیے ہے نہ کہ ایک مخصوص طبقہ کے لیے جو ذہنی اعتبار سے بلند ہو۔ اگر یہاں لفظ دیدار ہوتا تو عرب ہی نہیں ساری دنیا کے وہ لوگ جو دولتِ علم اور قوتِ غور و فکر سے عاری ہیں یا جو مجردات (ABSTRACT) کا تصور نہیں کر سکتے، وہ معاہدہ کے لیے کیسے تیار ہوتے؟

معاہدہ کی تکمیل کے اشد ضروری ہے کہ جس سے آپ معاہدہ کریں وہ معاہدہ کی شرائط کو سمجھ سکے۔ اب آپ خود فیصلہ کر لیں کہ عرب یا پاکستان کا ایک جاہل بدوی جنت کو بآسانی سمجھ سکتا ہے یا دیدار کو؟

(۶) شیوۂ تسلیم و رضا اور جہاد میں یہ ربط ہے کہ جہاد موقوف ہے اس شیوہ پر۔ جب مومن میں یہ رنگ پیدا ہو جاتا ہے، تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اس کو جہاد فی سبیل اللہ سے باز نہیں رکھ سکتی، بلکہ جہاد فی سبیل اللہ ہی مشغلۂ حیات بن جاتا ہے۔ قرآن حکیم نے کیسے بلیغ مگر دلکش انداز میں، مومن کی "نارِ مل لا الف" کا نقشہ دو لفظوں میں کھینچ دیا ہے۔ "يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ" یعنی مومن حضرات معاہدہ کے بعد بے دریغ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔ اب حرف "ف" پر غور کیجیے۔ اللہ فرماتا ہے جب یہ مومن حضرات، جہاد کو شیوۂ زندگی اور مشغلۂ حیات بنا لیتے ہیں تو دو ہی صورتیں وقوع پذیر ہوتی ہیں۔ تیسری صورت تو ممکن ہی نہیں ہے، یعنی مارتے ہیں اور مرتے ہیں۔

واضح ہو کہ اس جملہ کی ترکیب یہ بتا رہی ہے کہ مقصود بالذات خود مرنا نہیں

ہے، بلکہ کفار کو مارنا، مومن جب میدانِ جنگ میں جاتا ہے تو اُس کی غرض قتل ہونا نہیں ہوتی۔ بلکہ قتل کرنا۔ تاکہ دین اسلام کو غلبہ حاصل ہو۔ یعنی میدانِ جنگ میں شہادت مقصود بالذات نہیں ہے، بلکہ قتل کفار مقصود بالذات ہے شہادت جس کا رتبہ اتنا بڑا ہے کہ انبیاء کو بھی اس کی آرزو رہی۔ یہ تو وہ وجہ ہے جو اس وقت جائز ہے جب مومن قتل کرنے کے قابل نہ رہے۔ ورنہ وہ تو جب تک زندہ رہتا ہے، قتل کرتا رہتا ہے۔

ان تصورات ستہ میں جو منطقی ربط پایا جاتا ہے اس کو اس طرح بھی واضح کیا جا سکتا ہے۔ کہ

(۱) جہاد موقوف ہے، شیوۂ تسلیم و رضاء پر
(۲) شیوۂ تسلیم و رضا موقوف ہے، شانِ فقر پر
(۳) شانِ فقر کا وجود، منحصر ہے، عشق پر
(۴) عشق، واحد ذریعہ ہے، خودی کی تربیت کا۔
(۵) خودی کا وجود، خدا کے وجود پر موقوف ہے۔

آخر میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ میری اس ناچیز کوشش کو قبول فرمائے اور مجھے اقبال کی تمام کتابوں کی شرح لکھنے کی لیاقت عطا فرمائے تاکہ میں اپنی قوم کی کچھ خدمت کر سکوں! "رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي يَفْقَهُوا قَوْلِي" (طٰہٰ ع ۲)

اے میرے رب! کشادہ کر دے میرا سینہ (کھول دے مجھ پر حقائق و معارف)، اور آسان کر دے میرا کام (یعنی مشغلۂ تصنیف و تالیف)، اور کھول دے گرہ میری زبان کی۔ (مجھے اظہار مافی الضمیر پر قدرت عطا کر) تاکہ لوگ

میری بات کو دبآسانی، سمجھ سکیں!

نیز جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے دُعا کی تھی کہ میرے بھائی کو میرا رفیق، اور شریک کار بنادے، اُسی طرح میں بڑے خلوص کے ساتھ دُعا کرتا ہوں کہ اے اللہ میرے بھائی یعقوب کو میرا وزیر اور شریک کار بنادے آمین یارب العالمین!! وَصَلَّی اللّٰہُ عَلٰی خَیْرِ خَلْقِهٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِیْنَ ہ ✦

اِستدراک

ذیل میں دو مصرعوں کی مزید تشریح ہدیۂ ناظرین کی جاتی ہے۔

نہ ہے زماں نہ مکاں، لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

اس مصرع میں علامہ نے، ایک عظیم الشان صداقت کا اعلان کیا ہے۔ زمان ومکان کے تصورات، انسانی عقل کی پیداوار ہیں، جن کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ کائنات میں جو کچھ نظر آتا ہے وہ آثار ہیں اور یہ آثار نتائج ہیں افعال کے، اور یہ افعال صادر ہوئے ہیں اسماء وصفات الٰہیہ سے، اور صفات کا قیام منحصر اور موقوف ہے ذات پر۔

اسی حقیقت کو مرشدی حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ نے یوں بیان فرمایا ہے ؎

دو عالم میں نہیں موجود و مشہود
بجز ذات وصفات افعال و آثار

آثار، افعال، اور صفات یہ تینوں قائم بالذات نہیں ہیں، بلکہ ذات کے سہارے قائم ہیں، یعنی قائم بالغیر ہیں۔ بالفاظ دگر صرف ذاتِ باری قیوّم ہے۔ اس کے علاوہ کسی شے کا مستقل وجود نہیں ہے۔ پس زمان ومکان جو محض آثار ہیں۔ اور اپنے وجود میں افعال کے محتاج ہیں۔ دراصل کوئی مستقل وجود نہیں رکھتے۔ اللہ کے سوا کوئی موجود نہیں ہے۔

اب اس بات کی مختصر تشریح اور کردوں کہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ سے زمان ومکان کس طرح فنا ہو جاتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ زمان و مکان، دونوں کے لیے ضروری ہے کہ اُن سے پہلے کسی قائم بالذات شئے کا وجود تسلیم کیا جائے۔ تاکہ ان دونوں کا تصوّر ہو سکے۔ زمان قائم بالذات نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ زمان تو مقدار حرکت کا نام ہے اور حرکت کے لیے محرک کا وجود ضروری ہے۔

خُدا، محرک ہے۔

انسان، متحرک ہے۔

زمان، مقدارِ حرکت ہے۔

الغرض زمان تو انسان کی حرکت پر موقوف ہے۔ اور حرکت محرک اوّل پر موقوف ہے۔ پس زمان کا کوئی ذاتی یا مستقل وجود نہیں ہے۔ بالفاظِ دگر زمان، انسان کے وجود پر منحصر ہے۔

لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ سے تمام ما سوی اللہ کی قیومیت (مستقل وجود) کی نفی ہو جاتی ہے۔ پس جب اس کے سوا کسی کا مستقل وجود ہی ثابت نہیں، کوئی دراصل موجود ہی نہیں تو زمان و مکان کا وجود خارج از بحث ہے۔

اسی لیے اقبال نے صاف لفظوں میں اعلان کر دیا:-

نہ ہے زماں، نہ مکاں، لَا اِلٰہ اِلَّا اللہ

تو ہے تجھے جو کچھ نظر آتا ہے نہیں ہے

یہ مصرع دراصل ابطالِ مادہ کے مشہور نظریہ کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ احساس کرنے والے ذہن یا نفس مدرک سے باہر محسوسات کا کہیں وجود نہیں ہے۔ موجودہ دَور میں مشہور فلسفی بارگلے (BERGLEY) اس نظریہ کا سب سے بڑا شارح وکیل گذرا ہے۔ اقبال بھی اس نظریۂ تصوریت

(IDEALISM) کے حامی ہیں۔ چنانچہ اپنی محبوب تصنیف زبورِ عجم میں اُنہوں نے اس حقیقت کو بالکل بے نقاب کر دیا ہے:-

ایں جہاں چیست؟ صنم خانۂ پندارِ من است
جلوۂ او، گردِ دیدۂ بیدارِ من است!
ہستی و نیستی از دیدن و نادیدنِ من!!
چہ زمان و چہ مکاں، شوخیٔ افکارِ من است

یعنی اس کائنات کا کوئی مستقل وجود نہیں ہے۔ ہستی کیا ہے؟ میرا دیکھنا نیستی کیا ہے؟ میرا نہ دیکھنا! کائنات کا وجود میرے مشاہدہ پر موقوف ہے اسی طرح زماَن اور مکاَن کی بھی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یہ تصورات بھی میری فکر کی پیداوار ہیں۔ زماَن میری شوخیٔ فکر کا نام ہے۔ اور مکاَن، یہ میرے اندازِ بیان کا نام ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ کائنات، دو چیزوں کا نام ہے، مافی الانفس اور مافی الآفاق ان میں مافی الانفس یعنی نفسِ مدرک تو موجود ہے اور مافی الآفاق، یعنی عالمِ محسوس، احساس کرنے والے سے باہر کہیں موجود نہیں ہے۔ صرف اَنا حق ہے، کائنات کا کوئی مستقل وجود نہیں۔ اور اَنا اس لیے حق ہے کہ وہ انائے مطلق کا مظہر ہے۔ اس کا وجود بھی ظلی، لیکن ایسا ظلی ہے۔ جو مظہرِ صفات ہونے کی وجہ سے مستقل وجود رکھتا ہے۔

ہندو فلسفہ میں اس نظریہ کو "مایا" کے نظریہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور شنکر آچاریہ اس کا سب سے بڑا شارح ہے۔

"مایا" کے معنی دھوکہ یا فریب نظر کئے جاتے ہیں۔ لیکن دراصل دھوکہ کو نہیں کہتے۔ شنکر آچاریہ نے بھگوت گیتا کی شرح میں مایا کو مثول پر کرتی، کا

مرادف قرار دیا ہے، یعنی برہما کی ایک مخفی طاقت جس کی بدولت انسان اپنی اصلیت اور حقیقت سے غافل ہو کر اپنے آپ کو مستقل بالذات اور موجود سمجھنے لگتا ہے۔ ہندو فلسفہ کی رو سے یہ ساری کائنات "مایا" ہی کا کرشمہ ہے یعنی اس کی کوئی اصلیت نہیں ہے۔ محض فریبِ نظر ہے۔



اکیڈیمک پریس، کبیر سٹریٹ - لاہور